﴿ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

(حصۂ دوم)

تصحیح وتنقیح شدہ جدید ایڈیشن (۲۰۱۶ء)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اوراشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاء اللہ اس گلدستہ سے زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں علم وعمل اور رشدو ہدایت کے خوشگوار اور سدا بہار پھول کھل اُٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

استاذ: دارالعلوم بڑودہ، گجرات

ومجازِ صحبت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب الہ آبادی مدظلہٗ العالی

تفصیلات

بلاترمیم طباعت ونشرواشاعت کی عام اجازت ہے۔

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصۂ دوم)

مؤلفہ : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ

استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

کمپیوٹر کتابت : رشید احمد آچھودی (فون:09428689113)

طبع رابع : ۱۴۳۷ھ مطابق:۲۰۱۶ء

تعدادِ صفحات : ۴۹۶

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی(09825315073)

(۲) مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/ ۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

(۳) Farid Book Depot Pvt Ltd

No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002

Phone: +91112328978 6, 23289159, 23280786

Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

حرفِ ابتداء

از

مؤلفِ کتاب

الحمدُ للّٰہِ الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الإِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ، أَشْھَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ الأَعَزُّ الأَکْرَمُ، وَ أَشْھَدُ أَنَّ نَبِیَّنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ الدَّاعِیُ إِلیٰ السَّبِیْلِ الأَقْوَمِ، صَلّٰی اللّٰہُ وَ بَارَکَ عَلَیْہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ صَحْبِہٖ وَ سَلَّمَ. أَمَّا بَعْدُ.

اللہ جل شانہ کی آخری کتاب قرآنِ کریم کے بعد احادیثِ مبارکہ علومِ اسلامیہ و دینیہ کی اصل وجڑ ہے، اُن کی عظمت، رفعت وفضیلت اربابِ علم ودانش پر مخفی نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ علم حدیث دنیائے علم کا نہایت بابرکت اور عظیم ترین علم ہے، کیوں کہ قرآنِ پاک کلامِ الٰہی ہے تو حدیثِ پاک کلام نبوی ہے، اور کلامِ نبوی کے متعلق خود کلامِ الٰہی کی گواہی یہ ہے: ﴿وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیO إِنْ ھُوَ إِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰO﴾ (النجم: ۳-۴) مطلب یہ ہے کہ آپ وحیِ الٰہی اور مرضیٔ خداوندی کے بغیر لب کشائی نہیں فرماتے۔ جیسے قرآن کریم کے قول کے مطابق سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام جب مدین سے واپسی پر وادیٔ مقدس پہنچے، تو وہاں ایک درخت سے آواز آئی: ﴿فَلَمَّا أَتٰھَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِیئِ الْوَادِ الأَیْمَنِ فِیْ الْبُقْعَةِ الْمُبَارَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ یٰمُوْسٰی إِنِّیْ أَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَO﴾ (القصص: ۳۰) ظاہر ہے کہ وہ آواز درخت کی تو نہ تھی! بلکہ رب العالمین ہی کی آواز تھی، درخت تو بمنزلہ آلہ (گویا موبائل) تھا، جو عالم الغیب والشہادۃ کی آواز حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا رہا تھا، ٹھیک اسی طرح کلام نبوی کو بھی سمجھ لو۔

صاحبو! نبی ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے جو کلام معجز نظام، حقائق ومعارف التیام صادر ہوا وہ بالیقین وحیِ الٰہی ہے، معاذ اللہ! نطق نفسانی نہیں۔

دانائے رومؒ اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

یہی وجہ ہے کہ احادیث طیبہ میں تفسیر قرآنی اور فقہ اسلامی بلکہ جمیع شعبہ جاتِ زندگی سے متعلق جو کچھ تعلیمات وہدایات دی گئی ہیں بلا شبہ وہ ہر قسم کی فضولیات وخرافات سے پاک اور محفوظ ہیں۔ اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ آیت قرآنی: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ۝﴾ (الحجر:۹) میں کلامِ الٰہی کے تحت کلام نبی ﷺ کی حفاظت کا وعدۂ ربانی موجود ہے، کما قال المفسرون. اور یہ اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے کہ عہد رسالت سے لے کر آج تک ذخیرۂ احادیث مبارکہ بھی جوں کا توں محفوظ ہے، امت مسلمہ کا دعویٰ ہے اور ہر طرح صحیح وثابت ہے کہ قرآنِ عظیم تو خیرا الگ رہا! احادیث مبارکہ کا ذخیرہ جس قدر قطعی ویقینی اور غیر محرف حالت میں آج تک محفوظ ہے، اس کا مقابلہ دنیا کی اور کوئی آسمانی یا الہامی کتاب بھی ہرگز نہیں کرسکتی، حتیٰ کہ جو حدیثیں غیر صحیح ہیں ان کا بھی علیحدہ ریکارڈ موجود ہے، اور اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ تفصیل وتعیین بھی موجود ہے کہ وہ حدیثیں کس بنا پر غیر صحیح وناقابل اعتبار ہیں، کس حد تک ان میں ضعف ہے، اور کس منزل سے ان کا سلسلۂ سند ٹوٹتا ہے، وغیرہ۔

پھر ہمارے علماء محققین ومحدثین نے ذخیرۂ احادیث کو محفوظ کر کے اسے گلدستہ کی شکل میں اپنی الماریوں اور لائبریریوں کی زینت ہی نہیں بنایا بلکہ اسے تعلیم وتدریس، تصنیف تالیف اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ عام کیا۔ فجزاھم اللّٰہ عنا خیر الجزاء فی الدارین آمین.

ان ہی کو دعا دیتے ہوئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا، فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ.‘‘ (مشکوٰۃ/ص:۳۵)

کہ اللہ تعالیٰ انہیں تروتازہ رکھے جنھوں نے ہماری حدیثوں اور باتوں کو سنا، پھر اسی کے مطابق دوسروں تک پہنچایا اور عام کیا۔

ان ہی کی شان میں کہنے والے نے کہا، ونعم ماقال:

أَهْلُ الْحَدِيْثِ هُمْ أَهْلُ النَّبِيِّ وَإِنْ لَّمْ يَصْحَبُوْا نَفْسَهُ، أَنْفَاسَهُ صَحِبُوْا

یقیناً خدمت علم حدیث کو اپنا مشغلہ بنانے والوں میں ایک طرح کی شانِ صحابیت (سے نسبت) پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے کہ جیسے حضرات صحابہؓ کو حضور ﷺ کی عادات، طرزِ عبادات، اور تمام احوال، افعال و اقوال سے مطلع ہونے کا جو عاشقانہ اور والہانہ جذبہ حاصل تھا ایسا ہی جذبہ حضرات علماءِ محدثینؒ کا بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر انہوں نے علم حدیث کو اپنا محبوب ترین مشغلہ بنا کر اس سلسلہ کی کسی بھی قسم کی خدمت کو اپنی انتہائی عظیم سعادت سمجھ کر انجام دیا۔ کثّر اللّٰہ أمثالھم آمین.

اس مقدس ترین طبقہ کی تقلید و اتباع میں اس حقیر سراپا تقصیر عفا عنہ اللہ القدیر نے بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں اپنا نام لکھانا چاہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رحمت عالم ﷺ کی احادیث طیبہ کی توضیح وتشریح کا مبارک کام جن مخصوص آداب وشرائط اور پاکیزگئ طبع وتقویٰ کا تقاضا کرتا ہے وہ فیضانِ الٰہی اور فضل خداوندی کے بغیر ممکن نہیں ہے، جہاں تک اپنی بات ہے تو اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کرتا ہوں کہ احادیث مبارکہ کے عظیم علمی وعرفانی کام کے لیے جن علمی، عملی، ایمانی، اخلاقی وروحانی صلاحیتوں کی ضرورت ہے اپنا دامن ان سے خالی ہے، من آنم کہ من دانم۔

ایک طرف اپنی علمی بے بضاعتی وعملی کوتاہی اور تنگ دامنی کا یہ احساس رہ رہ کر دل میں ابھرتا ہے، تو دوسری طرف اس خیال سے ہمت بندھتی اور بڑھتی ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی کو اپنے فضل خاص سے نوازنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو بہر حال مل کر ہی رہتی ہے اگر قبولیت مل جائے۔ کیوں کہ

دادِ حق را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

وہ ایسا قادرِ مطلق اور فعّال لمایرید ہے کہ کاہِ بے نوا کو کوہِ گراں کا استحکام عطا کر سکتا ہے، مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر سکتا ہے، ذرۂ ناچیز کو وسعت صحرا سے نواز سکتا ہے،

اور اجڑے موسم کی ویرانیوں کو فصلِ گل کی رونقوں میں بدل سکتا ہے۔

بالیقین! وہ اس ناکارہ سے بلا کسی استحقاق کے محض اپنے فضل خاص سے خدمتِ علم حدیث کا کارِ عظیم بھی ضرور لے سکتا ہے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

بحمد اللہ! عاجز نے اپنے یہاں (محمدی مسجد میں) مؤرخہ ۱۷/ ذی الحجہ/ ۱۴۲۶ھ مطابق: ۱۸/ جنوری/ ۲۰۰۶ء بروز چہارشنبہ بعد نمازِ فجر درسِ حدیث شریف کا سلسلہ شروع کیا، جس کے لیے ریاض الحدیث سے چند گل خوش رنگ و بو کو چن کر اس سے قبل ''گلدستۂ احادیث'' کا حصۂ اول کتابی شکل میں تیار کیا تھا، کیوں کہ

يَلُوْحُ الْخَطُّ فِي الْقِرْطَاسِ دَهْراً
وَ كَاتِبُهٗ رَمِيْمٌ فِي التُّرَابِ

کتاب اور کاپی میں لکھا ہوا تو سدا بہار اور چمکدار رہے گا، خواہ لکھنے والا مٹی میں مل جائے۔

بفضلہٖ تعالیٰ حصۂ اوّل مقبول ہوا، اس کے بعد حوصلہ مزید بڑھا تو اب یہ اسی کا دوسرا حصہ بھی بحمد اللہ تیار ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے۔

غلطیاں اور کوتاہیاں انسان کے خمیر میں ہیں، اور یہی دراصل کتاب اللہ اور کتاب الناس میں مابہ الامتیاز ہے، انسان کے قلم و دماغ سے نکلنے والی وہ کون سی بات و کتاب ہے جس میں زلت اور سہو کا امکان نہ ہو؟ اور اس کمترین غفرلہٗ ماتقدم من ذنبہ وماتأخر کے لیے تو امکان ہی نہیں بلکہ اس کا ایقان ہے۔

لہٰذا قلم نے جو کچھ صحیح باتیں احادیث مبارکہ کی تشریح کے ضمن میں لکھی ہوں وہ محض اللہ تعالیٰ کی نوازش و توفیق اور والدین محترمین واہل خانہ کی دعاؤں نیز بزرگوں کی کاوشوں اور ان کے علمی ذخیروں سے استفادہ کا ثمرہ ہے۔

لیکن خدانخواستہ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو وہ خود راقم الحروف کی تقصیر اور کوتاہی ہے، جس کے لیے عند اللہ عفو و درگذر اور عند الناس نصح و مشورہ کا طالب ہے۔ والله يهدي إلى الحق.

اسی کے ساتھ آج دربارِ رسالت میں بیٹھ کر بارگاہِ رب العزت میں اس احساس کے ساتھ کہ

سینے میں تلاطم ہے، دل شرم سے صد پارہ
دربار میں حاضر ہے ایک بندۂ آوارہ

دست بستہ یہ استدعا ہے کہ رب کعبہ! آپ کو آپ کے کرم اور رسول کریم ﷺ کی قربانیوں کا واسطہ، رمضان المبارک کی ان پرکیف ساعتوں نیز ریاض الجنہ کی ان پرنور فضاؤں کی برکت سے ہمیں معاف فرما کر اپنا بنا لیجیے! اپنے دین کے کاموں میں لگا لیجیے! نفس و شیطان اور ہر شر سے بچا کر تمام تالیفات و خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرما دیجیے اور انہیں ہمارے لیے، ہمارے والدین کے لیے، اولاد و ازواج کے لیے، اساتذہ و مشائخ کے لیے، محسنین و متعلقین اور مرحومین کے لیے دارین کی سرخ روئی کا ذریعہ بنا دیجیے۔

إِلٰهِـــيْ! نَـــجِّـنَـــا مِـنْ كُـلِّ ضِيْـقٍ
بِـجَـاهِ الْـمُـصْـطَـفٰى مَوْلَى الْجَمِيْعِ
وَهَـــبْ لَـنَـــا فِـيْ الْـمَـدِيْـنَةِ قَـرَارًا
بِـــإِيْـمَـــانٍ وَّدَفْـنٍ بِـــالْبَـقِيْـعِ

آمين، بحرمة سيد الأبرار والمرسلين، ربناتقبل منا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم. سبحان ربك رب العزة عما يصفون، وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين.

عاجز بندہ، سراپا گندہ، اپنے گناہوں پر نادم و شرمندہ
محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی غفرلہ الولی
۲۴/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۱ھ مطابق: ۳۰/ ستمبر/ ۲۰۱۰ء

قبل الجمعة فی روضة من رياض الجنة بالمسجد النبوی علیٰ صاحبه التحية

حرفے چند

از

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہٗ العالی

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے ایک خصوصی سامان یہ مہیا فرمایا کہ اپنی کتابیں بھی نازل فرمائیں اوران کی تشریح وتوضیح کے لیے اپنے ان نیک بندوں کوبھی مبعوث فرمایا جن پر کتابیں اتاری جاتی تھیں، اس سلسلہ کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید قیامت تک کے لیے ہے اور قیامت تک آنے والی انسانیت آپ ﷺ ہی کے زیرِ سایہ رہے گی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی حفاظت کا خصوصی انتظام فرمایا اور قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلا کسی ادنیٰ تبدیلی کے آج تک محفوظ ہے، اسی طرح قرآنِ مجید کے معانی ومقاصد کی حفاظت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی حفاظت کا غیبی نظام کارفرما رہا، چناں چہ آپ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ حدیث کے ادنیٰ طالب علم کی نظر میں ہوتی ہے، اسی لیے ہمیشہ سے علماء اپنے لیے ایک سعادت اور شرف سمجھ کر حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں اوران شاء اللہ ہمیشہ ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

خدمت حدیث کی فضیلت اوراس پر اجر وثواب کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں منقول ہیں، ان میں سے ایک چالیس احادیث سے متعلق ہے؛ اسی لیے بہت سے علماء نے حدیث کی ''اربعین'' یعنی چالیس حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا ہے، عربی میں تو اس پہلو سے بہت سی کتابیں وجود میں آچکی ہیں، اردو میں بھی کئی مجموعے اس نوعیت کے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان ہی میں ایک محبّ عزیز مولانا محمد شفیق بڑودوی کا پیشِ نظر مجموعہ ہے، جسے ''گلدستۂ

احادیث'' کا خوبصورت نام دیا گیا ہے، یہ گلدستہ ناپائیدار خوشبوؤں اور لمحوں میں پژمردہ ہوجانے والے غنچوں اور گلوں کا نہیں ہے، بلکہ اسے نبوت کے شجرۂ طوبیٰ کے ایسے پھولوں سے آراستہ کیا گیا ہے جن کی خوشبو کبھی کم نہیں ہوسکتی، جن کی تازگی ختم نہیں ہوسکتی، اور جن کی خوش رنگی پر کبھی کوئی دھبہ نہیں آسکتا۔

مؤلفِ عزیز نے اس مجموعہ میں مسلمانوں کی زندگی میں بکثرت پیش آنے والے سماجی اور اخلاقی مسائل پر خصوصی توجہ دی ہے، اس دور کے فتنوں پر احادیث کی روشنی میں گفتگو کی ہے، اور ایمان وعمل کی اصلاح کی دعوت دی ہے، راقم الحروف نے مختلف مقامات سے اس مجموعہ کا مطالعہ کیا، جو دراصل ان کے مسجد کے عوامی دروس کا مجموعہ ہے، اور اسے مفید وعام فہم پایا، اس سے پہلے بھی ان کی ایک تالیف ''گلدستۂ مواعظ'' کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی پذیرائی حاصل کرے گا۔

مولانا موصوف ایک بافیض عالم حضرت مولانا محمد صدیق شاہ صاحب مدظلہ کے صاحبزادے ہیں، تدریس وامامت دونوں طرح کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

''اور بزرگوں کے محبّ بھی ہیں اور محبوب بھی''۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ان سے تدریس وتالیف اور دعوت واصلاح کی مزید خدمت لے۔ واللّٰہ ھو المستعان .

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد و اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۱۷/صفر/۱۴۳۱ھ مطابق: ۳/فروری/۲۰۱۰ء

از

جامع الفضائل والمناقب، رئیس المتکلمین، وقارالعلماء وزبدةالفقهاء، أسوةالصلحاء، شیخ الحرم

علامہ خیر محمد حجازی مکی مدظلہ العالی

الحمد للّٰہ وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبي بعدہ......

سرزمین حرم اور شہر مبارک کے عشرۂ اخیرہ میں امت محمدیہ علی صاحبہا السلام داخل ہورہی ہے۔ اللّٰھم اجعلنامن الأتقیاء والسعداء، ولا تجعلنا من الأشقیاء.

محترم مفتی محمد شفیق (صدیقی) شاہ بھائی استاذ دارالعلوم بڑودہ نے اپنی کتاب ''گلدستۂ احادیث'' حصہ دوم بغرضِ تقریظ عطا فرمائی۔

الحمد للہ! مؤلف مذکور تدریس کے ساتھ خطابت اور تالیف سے بھی وابستہ ہیں، احادیث رسول ﷺ کی حفاظت اس دورِ پرفتن میں انتہائی اہم کام ہے، عالم اسلام کو اگر فتنوں سے، احداث اور اہوال سے بچا کر، صراط مستقیم، عقیدۂ توحیداور اتباعِ کتاب وسنت پر چلانا ہے تو سرمایۂ احوال وافعالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ اور اس کو عام کرنا ہوگا۔

الحمد للہ! مؤلف کی کاوش مستحسن ہے، خداوند کریم قبول فرما کر عام وتام فرمائے اورنجات اخروی کا ذریعہ بنائے، آمین۔

خیر محمد حجازی مکی

حرفِ دلنشیں

از: مفکر ملت حضرت اقدس مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی مدظلہٗ

(سابق رئیس جامعہ فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے امت کی رہنمائی کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید، اور دوسرے اپنا طریقۂ زندگی، جس کو ہم سنت رسول ﷺ کہتے ہیں۔ یہ امت جب تک ان دونوں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے گی، ان شاء اللہ راہِ راست پر رہے گی، اور گمراہی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے گی، اسی لیے علماءِ امت نے ہر دور میں اور ہر زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور حدیث پاک کی شروحات کی طرف توجہ کی ہے، جس سے امت کے افراد رہنمائی حاصل کرکے پاکیزہ زندگی گذار سکتے ہیں۔

اسی سلسلۂ زرّیں کی ایک کڑی زیرِ نظر کتاب ''گلدستۂ احادیث'' (حصۂ دوم) ہے، جس کو دارالعلوم بڑودہ کے جواں سال اور جواں ہمت استاذ مفتی محمد شفیق (شاہ بھائی) صاحب مدظلہٗ نے مرتب فرمایا ہے، کتاب کی فہرست پر اجمالی نظر ڈالنے سے ہی اس کی افادیت کا اندازہ ہوجاتا ہے، سلیس اردو زبان میں مختلف احادیث کو جمع کرکے مفتی صاحب نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس قابل قدر خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرماویں اور امت کے لیے اس کو نافع بنائیں اور آئندہ بھی اس طرح کی مفید خدمات کی توفیق عطا فرماتے رہیں۔

والسلام

احقر عبداللہ غفرلہٗ کاپودروی

۱۸/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۱ھ مطابق: ۳/ مئی ۲۰۱۰ء

حرفِ شیریں

از

داعیٔ اسلام حضرت مولانا محمد کلیم صاحب صدیقی مدظلہ العالی

ربِ کائنات نے اپنے مقدس کلام میں اپنے رسولِ مکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰی﴾ (النجم/۳-۴)

ہمارے رسول ﷺ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، صرف وہ فرماتے ہیں جو ان پر وحی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ رسول ﷺ یعنی حدیث پاک بھی وحی ہی ہے، پس قرآنِ مجید اور حدیثِ پاک میں فرق یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں اور بات بھی، اور حدیث پاک میں الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں، مگر بات اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے، حدیثِ پاک کی عظمت کے لیے صرف یہ ایک بات ہی کافی ہے، چہ جائے کہ قرآنِ و حدیث میں اس کے علاوہ بے شمار فضائل اور مناقب احادیث مبارکہ کے آئے ہیں، بلکہ حدیث پاک کی کسی طرح کی خدمت پر بھی بڑے بڑے اجر کے وعدے کیے گئے۔ خیر القرون سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا رکھنے والے اہل علم سعادت در سعادت سمجھ کر احادیث پاک کی خدمت کرتے آئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس طرح کی ہر کوشش کو سعادت سمجھنے اور اس کی خیر دنیا میں جاری رہنے کے سلسلہ میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟

احادیث مبارکہ کے خدام میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرنے والوں کی فہرست میں دنیا اور آخرت میں نام لکھانے کے لیے محبّ مکرم و حبیب محترم مفتی محمد شفیق

بڑودوی نے ایک بہت خوبصورت کام خوبصورت نام ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے شروع کیا ہے، جس کا دوسرا حصہ قارئین کے ہاتھوں میں آرہا ہے، موصوف مفتی صاحب جواں عزم اور جواں علم ہیں، اور اپنی دعوتی واصلاحی خدمات کے جذبات کے ساتھ میدانِ عمل میں ہیں، مختلف مقامات اور اوقات میں ملت کو کن موضوعات پر ان احادیث مبارکہ کے مینارۂ نور سے کس طرح کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس لحاظ سے وہ اہم موضوعات پر کام کررہے ہیں، پھر وہ ان موضوعات کو احادیث پاک کی تشریح کے لیے مختلف مثالوں اور تاریخی واقعات سے مزین کرتے ہیں، جن سے بات کو سمجھنے اور سمجھنے سے زیادہ اس کو قبول کر کے عمل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یقیناً یہ کوشش قابل مبارک باد اور لائق صد تحسین ہے، یہ حقیر مفتی صاحب موصوف کو اس سلسلہ کی کوشش پر دلی مبارک بادی پیش کرتا ہے، اور بدل و جان دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو قبولیت عامہ نصیب فرمائے، اور ان موضوعات کو مفتی صاحب موصوف کے علم و عمل میں ترقی اور برکت کا ذریعہ بنائے، اور قارئین کے لیے سیرت اور سنت نبوی علی صاحبہا السلام سے قریب تر ہونے کا ذریعہ بنائے، آمین۔

والسلام

خاک پائے خدامِ دین

محمد کلیم صدیقی عفی عنہ

خادم: جامعہ امام ولی اللہ پھلت ضلع مظفرنگر

یکم/ ربیع الاول/ ۱۴۳۱ھ مطابق: ۱۶/ فروری/ ۲۰۱۰ء منگل

حرفِ تحسین

از

حضرت اقدس امیر شریعت مفتی عبدالرزاق خان صاحب مدت فیوضہم

(مفتئ اعظم مدھیہ پردیس ورئیس جامعہ اسلامیہ عربیہ، بھوپال، ایم۔پی۔)

مولانا محمد شفیق صاحب صدیقی شاہ بھائی بڑودوی کی مرتب کتاب گلدستۂ احادیث کا مطالعہ کیا، ماشاءاللہ بڑی اچھی احادیث کو جمع کیا ہے، حدیثیں سب اچھی ہیں، عوام وخواص کے لیے یہ ایک نایاب نسخہ ہے، موصوف نے احادیث کی تشریح کے ساتھ کسی نہ کسی بزرگ کا خاص واقعہ نقل کیا ہے، جس کی بنا پر حدیث کے علاوہ دلچسپ اور نصیحت آموز واقعات سے مزید اس کتاب گلدستۂ احادیث میں چار چاند لگ گئے ہیں اور مزید اہمیت حاصل ہوگئی، جو عوام وخواص اور مقررین حضرات کے لیے معاون ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ موصوف کے علم میں مزید اضافہ فرمائے، اور اس کتاب کو مقبولِ عام فرما کر ذریعۂ نجات بنائے، اور صدقۂ جاریہ فرمائے، علم نافع سے مالا مال فرمائے، آمین۔

فقط والسلام

عبدالرزاق غفرلہٗ

رئیس جامعہ اسلامیہ عربیہ، مسجد ترجمہ والی، بھوپال

امیرِ شریعت ومفتئ اعظم، ایم۔پی۔

ونائب صدر جمعیۃ علماء ہند ۲۶/ شعبان/ ۱۴۳۰ھ

(۱)

اللہ جل جلالہ کے نام کی عظمت وفضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ الۡمُصۡطَفٰی، الۡمَخۡصُوۡصِ بِالۡمَقَامِ الۡمَحۡمُوۡدِ وَالشَّفَاعَةِ الۡکُبۡرٰی، وَاٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهِ الَّذِیۡنَ هُمۡ خُلَاصَةُ الۡعَرَبِ الۡعَرۡبَاءِ، وَخَیۡرُ الۡخَلَائِقِ بَعۡدَ الۡاَنۡبِیَاءِ، اَمَّا بَعۡدُ......

عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ’’إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی تِسۡعَةً وَّتِسۡعِیۡنَ اسۡمًا، مِائَةً إِلَّا وَّاحِدَةً، مَنۡ اَحۡصَاهَا دَخَلَ الۡجَنَّةَ.‘‘ (متفق علیه، مشکوٰۃ /ص : ۱۹۹/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، (یعنی) سو میں ایک کم، جس نے ان کو (یاد کیا، یا ان کو پڑھا، یا ان کے معانی جانے اور ان پر عمل کیا اور محفوظ کرلیا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔‘‘

تمہید:

بلاشبہ اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ واعظم شانہٗ کی عبادت ومعرفت کا جذبہ اور حوصلہ انسانی فطرت اور طبیعت کا خاصہ اور ایک حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے انسان نے اپنے خالق وحقیقی مالک کے وجود کو دیکھا تو نہیں، لیکن اس کے باوجود جب کبھی اس کی زندگی میں کوئی خوش گوار واقعہ پیش آتا ہے تو عموماً جبینِ انسانی میں سجدۂ شکر مچلنے لگتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ اس ان دیکھی غیبی ہستی کا شکر ادا کرے، ایسے ہی جب کوئی ناگوار حادثہ پیش آتا ہے تو انسانی ہاتھ اسی نادیدہ ذات کی طرف بے اختیار بڑھتے اور پھیلتے ہیں، اور آنکھیں اپنے عجز کے اظہار میں اشکبار ہو جاتی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ کا کوئی زمانہ اور کائنات کا کوئی خطہ خدا پرستی کے اس فطری جذبہ سے خالی نہیں رہا ہے، ہمیشہ سے دنیا والے اسی کو یاد کرتے اور پکارتے ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کو ہر اس نام سے پکار سکتے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہو

اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ منبع الکمالات کو ملحدین ومنکرین کے علاوہ (جن کی تعداد ہر زمانہ میں کالعدم رہی ہے) ہر قوم و مذہب کے لوگوں نے آج تک مختلف ناموں سے مانا اور پکارا ہے، اور مانتے اور پکارتے رہیں گے، کوئی خدا کہہ کر پکارتا ہے تو کوئی گوڈ (God) کہہ کر، کوئی اِشور کہہ رہا ہے تو کوئی پرمیشور، غرض جو جس نام سے بھی اللہ جل شانہٗ کو یاد کرتا ہے اگر تحقیق کے بعد ثابت ہو جائے کہ وہ نام اللہ جل شانہٗ کی الوہیت وعظمت اور ذات وصفات کے خلاف نہیں تو فقہی نقطۂ نظر سے اس نام سے پکارنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اللہ جل شانہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنىٰ﴾

(بنی إسرائیل/ ۱۱۰)

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ (جل شانہ) کہہ کر پکارو! یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو (پکار سکتے ہو ایک ہی بات ہے) اس کے بہت سے بہترین نام ہیں (یا تمام بہترین نام اسی کے ہیں)۔

اس آیتِ کریمہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱- اللہ جل شانہٗ کو ہر اس نام سے پکار سکتے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہو، خواہ کسی بھی زبان میں ہو، کیونکہ اس کی عظمت والا نام عربی زبان کے ساتھ ہی خاص نہیں، اور نہ ہی صرف انسانوں کی زبانوں کے ساتھ خاص ہے، بلکہ مختلف مخلوقات کی زبانوں پر بھی تو اسی کا نام ہے۔

صاحبو! اگر گوشِ ہوش سے سنا جائے تو پتوں اور کلیوں کی سرسراہٹ، پھولوں کی مسکراہٹ، پرندوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ میں ''اللہ، اللہ'' کی آواز آتی ہے:

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (بنی إسرائیل /٤٤)

اس آیت میں اسی کو فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو'' معلوم ہوا ہر مخلوق اس کو پکارتی ہے اور پکار سکتی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کے اسماءِ حسنیٰ:

۲- دوسری بات یہ واضح ہو گئی کہ اللہ جل شانہٗ کے بہت سے بہتر نام ہیں؛ بلکہ تمام بہترین نام اسی کے ہیں، اسی کو فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى﴾ (الأعراف/پ:۹)

اور حدیث مذکور میں اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اسْماً'' حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننانوے ہے، جو شخص ایمان اور عقیدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے

اس کے ننانوے نام محفوظ کر لے، یا ان کے ذریعہ دعا کرے، یا ان کے ذریعہ اپنے رب کو یاد کرے، یا ان کے معانی جان کر عمل کرے تو وہ جنت میں جائے گا۔

لیکن یہاں علماءِ محدثین فرماتے ہیں کہ اس تعبیر سے اللہ جل شانہ کے اسماءِ حسنیٰ کی تکثیر بیان کرنا مقصود ہے، تحدید نہیں، ورنہ ان ننانوے اسماءِ حسنیٰ کے علاوہ بھی اللہ جل شانہ کے ایسے بہت سے نام ہیں جن کا ذکر کلام اللہ اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں نہیں، البتہ ننانوے کا جو عدد ذکر کیا گیا اس کا مقصد یہ ہے کہ حدیثِ پاک میں اسماءِ حسنیٰ کو یاد کرنے والے کے لیے جنت کی جو فضیلت ہے وہ ان ہی ننانوے ناموں کے ساتھ مخصوص ہے۔

(مظاہرِ حق جدید/ص:۱۱۴/۳)

اور بعض سلف سے منقول ہے کہ جس نے "اللّٰھم" سے دعا مانگی اس نے گویا تمام ہی اسماءِ حسنیٰ کے ذریعہ دعا مانگی۔ (مظاہرِ حق جدید ص:۱۱۴/۳)

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے جتنے بھی اسماءِ حسنیٰ ہیں وہ سب کے سب اس کی الوہیت و ربوبیت اور شانِ عظمت و رفعت، قدرت وقوت، نصرت وحفاظت، محبت و ہدایت، شفقت وسخاوت وغیرہ پر دلالت کرتے ہیں، ان تمام اسماءِ حسنیٰ میں لفظ اللہ اسمِ ذات اور باقی اسماءِ صفات ہیں، جیسا کہ خود قرآنِ پاک کے ارشاد سے پتہ چلتا ہے، فرمایا:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾

(الحشر: ۲۲)

وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسے تمام کھلی چھپی باتوں کا علم ہے، وہی رحمٰن ورحیم ہے۔

یہاں اسماءِ حسنیٰ میں لفظ اللہ کو اسمِ ذات قرار دیا اور موصوف بنایا، اور دوسرے اسماءِ حسنیٰ کو صفت بنایا ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس کی عظمتِ شان اس کے ہر ہر عظیم الشان نام سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

لفظ اللہ (جل شانہٗ) کی تحقیق :

مثلاً اسمِ ذات لفظ اللہ کو لیجئے ! حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادابادیؒ نے قرآنِ کریم کا ہندی میں ترجمہ کیا، انہوں نے لفظ اللہ کا ترجمہ ہندی میں من موہن سے کیا، یعنی ''دلوں کا محبوب'' مطلب یہ ہے کہ محبت کے لائق صرف اللہ کریم ہی کی ذاتِ عظیم ہے۔
(''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں'' /ص:۳۱)

اہلِ علم نے اس پر بحث کی ہے کہ لفظ اللہ (جل شانہ) جامد ہے یا مشتق ؟ علامہ رازیؒ اور دیگر متعدد علماءِ اصول ولغت اس بات کے قائل ہیں کہ لفظ اللہ جامد یعنی مستقل لفظ ہے، یہ لفظ کسی سے بنا نہیں ہے، گویا جو شان مسمیٰ کی ہے وہی اسمِ ذات کی ہے، اللہ جل شانہ کی شان یہ ہے کہ " لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ " نہ اس نے جنا کسی کو اور نہ وہ جنا گیا۔ یہی شان اللہ جل شانہ کے ذاتی نام کی بھی ہے، نہ لفظ اللہ سے کوئی بنا، نہ اسے کسی سے بنایا گیا۔

مگر عام مفسرین و محققین کا خیال اور رجحان لفظ ''اللہ'' کے مشتق ہونے کی طرف ہے، پھر اس کے مادۂ اشتقاق کے متعلق بھی مختلف اقوال منقول ہیں، جو تمام ہی اللہ جل شانہ کے نام کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں، لیکن صرف دو قول نقل کرتا ہوں :

(۱) ایک قول یہ ہے کہ لفظ "اللّٰه" "لَاهَ، يَلُوهُ" سے بنا ہے۔ (مرقاۃ/ص:۵/۷۵) جس کے معنیٰ ہیں چھپ جانا، کیوں کہ ہماری ظاہری آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں، اس لیے کہ وہ خود تو پردۂ غیب میں چھپا ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں :

﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (الأنعام : ۱۰۳)

انسانوں کی بینائیاں جو یہاں ان کو ملی ہوئی ہیں اللہ کو نہیں پاسکتیں، اور وہ سب بینائیوں کو پا رہا ہے۔ اس کی ذات اتنی لطیف ہے کہ کوئی نگاہ اس کو نہیں پاسکتی، اور وہ اتنا باخبر ہے کہ ہر نگاہ کو پالیتا ہے، اور اس کے تمام حالات سے خوب واقف ہے۔

عربی شاعر نے شاید اسی آیت مبارکہ کی ترجمانی فرمائی ہے :

لَاہَ رَبّــیُ عَــنِ الُـخَـلُـقِ طُـرًّا
خـالِـقُ الُـخَـلُـقِ لَایُریٰ وَیرَانَاَ

یعنی میرا رب ساری مخلوق کی نظروں سے مخفی ہے، وہ مخلوق کا خالق خود تو دکھائی نہیں دیتا، لیکن ہمیں اور ساری مخلوق کو برابر دیکھتا ہے، بقولِ شاعر:

جسے کوئی نہیں جانتا اُسے رب جانتا ہے
راز کو راز نہ سمجھو، وہ سب جانتا ہے

قرآنِ پاک میں فرمایا:
﴿أَلَمُ یَعُلَمُ بِأَنَّ اللّٰہَ یَریٰ﴾ (العلق : ١٤)
کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟

ایک حیرت انگیز حکایت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ مقامِ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد اہل وعیال کے نان نفقہ سے مطمئن کرنے کی غرض سے حق تعالیٰ نے حکم فرمایا: موسیٰ! تمہارے قریب جو چٹان ہے اس پر عصا مارو، تعمیل ارشاد میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا مارا تو چٹان کے دوٹکڑے ہوگئے اور درمیان سے ایک پتھر نکلا، پھر حکم ہوا کہ اس پتھر پر بھی عصا مارو، حکم کی تعمیل فرمائی تو اس سے ایک اور پتھر نکلا، ارشاد ہوا کہ اس پتھر پر ایک اور ضرب مارو، اب کی بار جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو اس میں سے ایک عجیب و غریب کیڑا نکلا، جس کے منہ میں بطورِ غذا ایک ہرا پتہ تھا اور ہونٹ ہل رہے تھے، کان لگا کر معلوم کیا تو آواز آرہی تھی:

”سُبُحانَ مَنُ یرانِیُ، وَیَسُمَعُ کَلاَمِیُ، وَیَعُرِفُ مَکانِیُ، وَ یَذُکُرُنِیُ، وَلاَ یَنُسانِیُ.“

پاک ہے وہ جو اس جگہ بھی مجھے برابر دیکھتا ہے، میری بات کو برابر سنتا ہے، میرے

مکان اور مسکن سے بھی واقف ہے، مجھے برابر یاد رکھتا ہے، بھولتا نہیں۔
(از: ’’گلستانِ قناعت‘‘/ ص:۹۸)

واقعی وہ ایسے ہی بلند و بالا شان والا ہے:
﴿ لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ﴾ (سورہ شوریٰ : ۱۱)
اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔
مگر اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ
تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا تری پہچان یہی ہے مولیٰ!

اللہ جل شانہ کی رفعت:

(۲) دوسرا قول امام خلیل اور امام سیبویہؒ کا منقول ہے کہ لفظ ’’اللّٰــہ‘‘ ’’أَلَــہَ‘‘ بمعنیٰ ’’عَبَدَ‘‘ یا ’’لَاہَ‘‘ سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں بلند ہونا۔ (مرقاۃ:۵/۱۷۰)

ظاہر ہے کہ ذات خداوندی کو ’’اللہ‘‘ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ وارفع اور بلند و بالا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اتنی بلند ہیں کہ پستی کا امکان ہی نہیں، وہ عجز وفنا سے بلند، ضعف واضمحلال سے بلند، فقر ومحتاجی سے بلند، سونے اور اونگھنے سے بلند، کمزوری اور سستی سے بلند، ہر قسم کے نقص وعیب اور وہم وگمان سے بلند ہے، اس کی بلندی کے سامنے تمام بلندیاں ہیچ ہیں، اس کے علم کے سامنے سب علوم جہالت، اس کی سماعت کے سامنے سب کی سماعتیں بہرا پن، اس کی بصارت کے سامنے سب کی بصارتیں اندھا پن، اس کی فصاحت کے سامنے سب کی فصاحتیں گونگا پن، اس کے وجود کے سامنے سب کا وجود کالعدم اور اس کی بقا کے سامنے سب کی بقا فنا۔ وہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ عظمتوں کی معراج اور بلندیوں کی انتہا اسی کے لیے ہے۔

لفظ ''اللہ'' حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے:

اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح اللہ جل شانہ کی ذات وصفات بلند و بالا ہیں، ان میں اس کا کوئی ثانی اور شریک نہیں، اسی طرح اس کا اسمِ ذات بھی بلند و بالا ہے، اس میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں، اس لیے علماء نے فرمایا کہ لفظ ''اللہ'' حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا لفظ ''اللہ'' سے حق تعالیٰ ہی کو موسوم کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی کو نہیں، چناں چہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (مریم:٦٥)

کیا کوئی اور ہے؟ جو اللہ کے نام سے موسوم ہو۔

اسکی ایک تفسیر یہی منقول ہے، اسی لیےاس مبارک نام کا نہ تثنیہ ہےاور نہ جمع۔

(قاموس الفقہ ص:۴۱۶/ جلد اول)

لفظ اللہ کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں لفظ ''اللہ'' تقریباً دو ہزار نو سو چالیس (۲۹۴۰) مرتبہ آیا ہے۔ (''حکایتوں کا گلدستہ'' / ص:۳۴)

حتیٰ کہ جمہور اہل علم نے تو لفظ ''اللہ'' ہی کو اسم اعظم قرار دیا ہے۔

(مرقاۃ/ص:۷۵/ ۵)

لیکن قطب ربانی، محبوبِ سبحانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اگر لفظ ''اللہ'' زبان سے اس حال میں ادا کیا جائے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کچھ نہ ہو، تب لفظ ''اللہ'' اسم اعظم ہے۔'' (مرقاۃ/ص:۷۵/ ۵)

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''دل اگر غیر سے اور پیٹ حرام سے خالی ہو تو پھر اللہ جل شانہ کا ہر نام ''اسم اعظم'' ہے۔''

صاحبو! لفظ ''اللہ'' تو ایسا بابرکت نام ہے کہ اگر خدانہ خواستہ غفلت کے ساتھ لیا جائے تب بھی برکت سے خالی نہیں، پھر عظمت کے ساتھ لینے کی کیا فضیلت ہوگی؟

لفظ ''اللہ'' پر علمی نکتہ:

علماء نے ''لفظ اللہ'' پر ایک عجیب علمی نکتہ بیان فرمایا ہے کہ یہ لفظ اتنا بامعنیٰ ہے کہ اگر اس میں سے کوئی حرف حذف بھی کر دیا جائے تو بھی اس کے معنیٰ کا حسن برقرار رہتا ہے،، مثلاً لفظ ''اللہ'' کے شروع سے الف گرا دیا جائے تو ''للہ'' رہ جائے گا، جس کے معنیٰ ہے اللہ کے لیے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ساری کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کے لیے ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَماَ فِی الْأَرْضِ﴾ (البقرة:٢٨٤)

اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے۔

پھر لفظ ''اللہ'' میں الف کے بجائے لام گرا دیں تو ''الہٰ'' رہ جائے گا، جس کے معنیٰ ہیں ''معبود''، اور معبود اللہ ہی ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (البقرة : ١٦٣)

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

اور اگر لفظ ''اللہ'' سے الف اور لام دونوں کو حذف کر دیں تو ''لَہٗ'' باقی رہ جائے گا، جس کے معنیٰ ہیں: اس کے لیے۔ اس کے بعد اگر لام کو بھی حذف کر دیں تو صرف ''ہٗ'' ضمیر باقی رہتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا متعین مرجع ذاتِ باری کے علاوہ اور کوئی نہیں، کیوں کہ ''ہٗ'' کے معنیٰ ''وہ''، اور جب مطلقاً ''ہٗ'' بولا جائے گا تو اس سے وہ ہی مراد ہوگا جس کی شان ہر چیز سے ظاہر ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے غاروں، جنگلوں اور ویرانوں میں تلاش کیا، تو قرآن نے کہا:

﴿وَفِیْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات : ٢١)

اِدھر اُدھر بھٹکنے والو! ذرا اپنی ذات میں تو جھانک کر نگاہِ بصیرت سے دیکھو! تمہاری

رگِ جان میں وہ، تمہاری سانسوں کے زیر و بم میں وہ، تمہاری گویائی میں وہ، تمہاری بینائی میں وہ، تمہاری سنوائی میں وہ، انسانوں کی زبانِ قال میں وہ، ذرّوں کی زبانِ حال میں وہ، دن کی روشنی میں وہ، رات کی تاریکی میں وہ، آفتاب ومہتاب کی کرنوں میں وہ، کواکب کی چشمک میں، وہ، پھولوں کی چٹک میں وہ، کلیوں کی مہک میں وہ، سبزیوں کی لہک میں وہ، لہروں کی لچک میں وہ، پہاڑوں کے جلال میں وہ، درختوں کے جمال میں وہ، ماضی وحال میں وہ، مستقبل ومآل میں وہ۔

فَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ شَاهِدٌ
يَدُلُّ عَلٰى أَنَّهٗ وَاحِدٌ

شواہدِ قدرت:

قرآں کے سپاروں میں ☆ احساں کے اشاروں میں
ایماں کے سواروں میں ☆ معصوم و پیاروں میں
ماثور دعاؤں میں ☆ منثور ثناؤں میں
معمور ہواؤں میں ☆ مسحور فضاؤں میں
ہر قطرۂ باراں میں ☆ ہر ذرۂ تاباں میں
ہر برگِ گلستاں میں ☆ ہر روئے درخشاں میں
گلزار میں، خاروں میں ☆ کہسار میں، غاروں میں
گنبد و میناروں میں ☆ خلوت میں ہزاروں میں
صحرا کے غزالوں میں ☆ دریا کے اُچھالوں میں
بطحاء کے نرالوں میں ☆ طیبہ کے اجالوں میں

یا اللہ! میں نے آپ کو اور آپ کے عظمت والے نام کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اللہ جل شانہ کا مقدس نام کائنات کی روح:

کیوں کہ اللہ جل جلالہ کا مقدس نام تو اس وقت بھی تھا جب کائنات میں کچھ نہ تھا، اور اس وقت بھی ہوگا جب کچھ بھی باقی نہ رہے گا، اللہ جل جلالہ کا مقدس نام ہی کائنات کی اصل روح اور جان ہے، یہ دنیا کی بستی اسی وقت تک آباد رہے گی جب تک کسی ایک کی زبان پر بھی یہ مقدس نام جاری رہے گا، اور جس وقت کوئی زبان بھی ''اللہ، اللہ'' کا ورد کرنے والی باقی نہ رہے گی اس وقت بساطِ عالم کو لپیٹ دیا جائے گا، آسمان کی قندیلیں بجھادی جائیں گی، دریاؤں اور سمندروں کا پانی خشک ہوجائے گا، نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے گا۔
(مشکوٰۃ/ص:۴۸۰)

بس ثابت ہوگیا کہ اللہ جل شانہ کی ذات جیسے عظیم ہے اس کا مقدس نام بھی اسی طرح عظیم ہے، اور عظمت سے اس کا مقدس نام لینے والا بھی عظیم ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اللہ رب العزت کا نام اتنا عظمت والا ہے کہ اگر ہم ہزار بار بھی مشک اور عنبر سے اپنی زبان دھوکر اس کا مقدس نام لیں تو اس کے تقدس کا حق ادا نہیں کر سکتے، لیکن یہ اس کا انعام اور احسان ہے کہ اس نے اپنا مقدس اور عظیم نام ہماری ناپاک اور حقیر زبان پر بآسانی جاری فرمادیا، اب جو اس پاک نام کو وردِ زبان رکھے گا، اس کی زبان اور جسم دونوں پاک ہوجائیں گے۔'' ان شاء اللہ۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنی معرفت اور اپنے نام کی عظمت نصیب فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ

(۲)

اسلامی احکام سے اتفاق اور امن کا پیغام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلّى اللّٰه عليه و سلم قَضٰى أَنْ "لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ." (ابن ماجه/ص:١٦٩/ ج:٢/ باب من بنٰى فى حقه ما يضرّ بجاره)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فیصلہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اسلام میں نہ ضرر ہے، نہ ضرار" یعنی نہ ابتداء میں نقصان پہنچایا جائے، نہ ردِ عمل میں۔

امن واتفاق اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے:

انسانی زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کی تعمیر وترقی اور خوش حالی کے لیے امن وسلامتی اور اتفاقِ باہمی بے حد ضروری ہے، اس کے بغیر تعمیر وترقی اور خوش حالی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

آج کی سامانِ عیش واسبابِ ضرورت وسہولت سے بھری دنیا میں اگر کمی ہے تو ان

ہی دو چیزوں کی، اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں لازم ملزوم ہیں: (۱) اتفاقِ باہمی (۲) امن وسلامتی۔ حالانکہ دنیا والوں کو سب سے زیادہ ان ہی کی ضرورت، طلب اور تلاش ہے، جس کے لیے دنیا بھر میں انفرادی واجتماعی اور ملکی و بین الاقوامی طور پر مختلف تجاویز وتدابیر کی جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود قابلِ ذکر کوئی ثمرہ اور نتیجہ نظر نہیں آتا، حالات وحقیقت پر جن کی گہری نظر ہے انہیں اس کا پورا پورا احساس ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی طور پر اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ امن واتفاق صرف مادی اور دنیوی اصولوں کی بنا پر نہیں، بلکہ دینی واسلامی اصولوں کی بنا پر حاصل ہوتا ہے، اس لیے جب تک دنیا کے باشندے دین حق کی تعلیمات وہدایات کو نہیں اپنائیں گے، تب تک نہ اتفاق کی صحیح فضا قائم ہوسکتی ہے، نہ امن حقیقی نصیب ہوسکتا ہے، اور دین حق وہی ہے جو دنیا کے خالق ومالک کے نزدیک پسندیدہ ومقبول ہے، قرآن جو دنیا کے خالق ومالک کا کلام ہے اس نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ (آل عمران : ۱۹)

بلاشبہ دینِ اسلام ہی اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین ہے۔

امن وآشتی، صلح وسلامتی اور اتفاقِ باہمی دین اسلام کی بنیادی ہدایات وتعلیمات میں سے ہیں، جس کی ایک آسان مثال ہماری روزمرہ کی زندگی میں سلام ہے، جس میں اتفاقِ باہمی اور سلامتی کا بڑا پیغام ہے، نیز اسلام کے عقیدۂ توحید ورسالت میں بھی امن و اتفاق کا زبردست پیغام ہے۔

اسلام اپنے نام اور احکام سے امن واتفاق کا پیغام دیتا ہے:

بلکہ اس کے آگے کی بات یہ ہے کہ اگر دنیا میں کوئی ایسا دین ہے جو اپنے نام اور احکام دونوں میں امن واتفاق کا معنیٰ اور پیغام رکھتا ہو تو وہ اسلام ہی ہے، امن وسلامتی تو اس کے خمیر میں داخل ہے کہ اسلام کا یہ عربی لفظ ''سِلْمٌ'' سے، تو ایمان ''أَمْنٌ'' سے بنا ہے،

جس کے معنیٰ امن وسلامتی کے آتے ہیں، تو اسلام نے اپنے نام اور احکام دونوں سے انسان کو اتفاق و امن کا پیغام دیا ہے، اور اس کے لیے ایسے قانون پیش کیے جن پر عمل کرنے سے انسانی زندگی دنیوی اور اخروی دونوں اعتبار سے پر امن و پرسکون اور پروقار ہو جاتی ہے۔ چناں چہ حدیثِ بالا میں زندگی گذارنے کا ایک اسلامی قانون پیش فرمایا گیا کہ ”لَا ضَـــرَرَ وَلَا ضِـرَارَ“ اسلام میں نہ ضرر ہے، نہ ضرار، مطلب یہ ہے کہ نہ خود نقصان اٹھاؤ، نہ دوسروں کو نقصان پہنچاؤ۔ خود جیو اور دوسروں کو جینے دو۔ کتنی جامع حدیث ہے؟ درحقیقت یہ حدیث آیت کریمہ: ﴿لَا تَـظْـلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۷۹) (نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے) کی تفسیر وتشریح ہے۔

حضرات محدثین کے نزدیک اس کا جوامع الکلم میں خاص مقام ہے، اس لیے کہ بظاہر تو یہ دو مختصر لفظ ہیں، لیکن امن واتفاق، معانی ومطالب اور احکام ومسائل کے انبار کو یہ شامل ہے، اس کا پہلا جملہ: ”لَاضَـــرَرَ“ یہ کمالِ عقل کی علامت ہے، یعنی دینی ودنیوی اعتبار سے نہ خود نقصان اٹھاؤ، اور دوسرا جملہ: ”وَلَا ضِرَار“ کمالِ ایمان کی علامت ہے کہ دوسروں کو بھی (بلاوجہ) نقصان نہ پہنچاؤ! نہ نقصان اٹھانے کو روا رکھا ہے، نہ نقصان پہنچانے کو جائز کہا گیا، یعنی آدمی نہ مظلوم بنے، نہ ظالم، اس پیغام کا منشا یہ ہے کہ معاشرہ اور سماج کا ہر فرد امن و سلامتی سے رہے اور ظلم وزیادتی سے بچے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب لوگ اسلامی ہدایات کے مطابق اتفاقِ باہمی سے رہ کر ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور حسن سلوک بھی کریں۔

اسلامی احکام وقوانین میں اس کی خصوصی تاکید بار بار کی گئی کہ خود بھی امن وسلامتی سے رہو، دوسروں کو بھی امن وسلامتی کے ساتھ رہنے دو، خود بھی نقصان نہ اٹھاؤ! دوسروں کو بھی نقصان نہ پہنچاؤ! حدیث مذکور میں اسلام کی اس بنیادی وقانونی تعلیم کے علاوہ اسلام کی اعلیٰ اور اخلاقی تعلیم تو یہاں تک ہے کہ لوگو! امن وسلامتی اپنی پہچان بنالو! اس طرح کہ تم اپنی انفرادی زندگی میں نقصان پہنچانے والوں کو بھی (جب کہ ان کے خیر پر آنے کی امید ہو) نفع

پہنچاؤ، اور ستم کرنے والوں کے ساتھ بھی کرم کا معاملہ کرو! سچے مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہی طرزِ عمل اور رویّہ رہا ہے، جیسا کہ اسلامی سنہری تاریخ اس کی شاہد ہے۔

فتحِ مکہ کا واقعہ، پیغام امن واتفاق کا بہترین نمونہ:

اس سلسلہ میں فتح مکہ کا واقعہ ہم مسلمانوں کے شاندار ماضی کا تاریخ ساز اور بہترین واقعہ ہے، سن ہجری آٹھ میں رحمتِ عالم ﷺ کا اپنے جانثاروں اور مسلمانوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں جب فاتحانہ داخلہ ہورہا تھا تو صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف مسلمانوں کے دلوں میں ایک خوشی ومسرت کا جذبہ موجزن تھا، تو دوسری طرف بعض کے دلوں میں دشمنوں کی طرف سے کیے گئے مظالم پر انتقام کا ولولہ، اسی عالم میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جو انصار کے دستہ کے امیر تھے، ابوسفیان (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) کے پاس سے گذرتے ہوئے کہہ دیا کہ "اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ"، آج بدلہ کا دن ہے۔﴿وَ تِلْكَ الْأَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) یہ راتیں اور دن اللہ ہی کے قبضہ اور قدرت میں ہیں، وہ انہیں بدلتا رہتا ہے۔ ماضی تمہارا تھا، حال ہمارا ہے، آج تو دشمنوں کی گردنیں اڑانے کا دن ہے، کل تمہاری تلواریں تھیں، ہماری گردنیں، آج تمہاری گردنیں ہوں گی، ہماری تلواریں، آج ہم اپنے ماضی کے (دردناک) واقعات کا تم سے حساب چکائیں گے، ہمیں تمہارا کمزور مسلمانوں کو انسانیت سوز سزائیں دینا برابر یاد ہے، ہم بلال رضی اللہ عنہ کی آہوں، خباب رضی اللہ عنہ کے انگاروں اور سمیہ رضی اللہ عنہا کے تڑپنے کو نہیں بھولے، آج برابر کا بدلہ لیا جائے گا، "اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ"، ہوا کی لہروں نے یہ نعرہ رحمتِ عالم ﷺ کے کانوں تک پہنچادیا، آپ ﷺ بے قرار ہوگئے، انتقام انتقام سن کر آپ ﷺ کے ضمیر پر ایک چوٹ سی لگی، برجستہ اعلان فرمایا: "اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَةِ"۔ (فتح الباری: جلد: ۸/ صفحہ: ۸)

آج بدلہ کا نہیں، بھلائی کا دن ہے، آج ظلم وزیادتی کا نہیں، معافی ومہربانی کا دن ہے، آج ستم کا نہیں، کرم کا دن ہے، آج انتقام کا نہیں، انعام کا دن ہے، مسلمانو! میں بھی

جانتا ہوں کہ یہ وہی مکہ ہے جس کی زمین ہم پر تنگ کر دی گئی، یہ وہی مکہ ہے جہاں ہمیں مارا اور ستایا گیا، یہ وہی مکہ ہے جہاں سے ظلماً ہمیں نکالا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں آج اپنے فضل سے جب فتح نصیب فرمائی تو ہم دنیا کے ظالم و جابر بادشاہوں کی طرح سر اٹھا کر فاتحانہ شان سے داخل نہیں ہوں گے، نہ شہروں کو ویران کریں گے، بلکہ رب العالمین کے حضور سر جھکا کر امن و سلامتی کا پیغام دیتے ہوئے داخل ہوں گے۔ فرمایا:

﴿لَاتَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (یوسف: ۹۲)

مکہ والو! گھبراؤ نہیں، ہم تمہیں برباد کرنے نہیں، آباد کرنے آئے ہیں، ہم تمہارے جوانوں کے بازو کاٹنے نہیں، انہیں سنبھالنے آئے ہیں، ہم تمہاری بہو بیٹیوں کی عزت لوٹنے نہیں، ان کے سر پر عصمت و عفت کی چادر ڈالنے آئے ہیں، ہم تمہارے بچوں کو یتیم بنانے نہیں، یتیموں کے والی بننے آئے ہیں، کل جس نے ہمارے سینوں میں خنجر گھونپا تھا، آج اسے بھی سینے سے لگایا جائے گا، کل جس نے ہمارے گلے پر تلوار چلائی تھی، آج اسے بھی گلے سے لگایا جائے گا، کل جو موت کا پیغام لے کر آیا تھا، آج اسے بھی امن و سلامتی کا پیغام سنا کر جامِ حیات پلایا جائے گا، ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ہم معاف کرتے ہیں، اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ بھی تمہیں معاف فرما دے۔ سچ ہے:

حسن سراپا، خلق مجسم ☆ جس پہ گواہ، قرآنِ مکرم
خلق میں سب کے، یکساں ہمدم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم
آئینۂ الطافِ الٰہی ☆ رحمت جس کی لامتناہی
جس کی ہدایت: اِرْحَمْ تُرْحَم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم
راہ میں جس نے کانٹے بچھائے ☆ گالی دی، پتھر برسائے
ان پر چھڑکی پیار کی شبنم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم
خلق خدا کا راعی آخر ☆ دین ہدیٰ کا داعی آخر
جس کی دعوت: أَسْلِمْ تَسْلَمْ ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

مومن و مسلم کی شان اور حقیقی پہچان:

یہ ہے اسلامی ہدایات و تعلیمات کے صحیح پیغام کا ایک نمونہ جو پیغمبرِ اسلام ﷺ اور سچے مسلمانوں کی زندگی سے ملتا ہے، اسلام تو وہ دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو عبادات کے طریقوں میں بھی بے جا پانی بہانے سے روکتا ہے، پھر ظلم کے طریقے سے جا خون بہانے کی کیسے اجازت دے سکتا ہے؟ قطعاً نہیں، ایک سچے مسلمان سے یہ بات بہت بعید ہے، ویسے اسلام کے ماننے والوں کو ''مومن'' اور ''مسلم'' اسی لیے تو کہتے ہیں کہ یہ دونوں نام خود ہی ان کی طرف سے امن و سلامتی، رحم دلی اور امن پسندی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ مومن ''أَمْنٌ'' سے ماخوذ ہے، مومن وہ ہے جو خود بھی چین و امن سے رہے، اور دوسروں کو بھی مامون و مطمئن رکھے، اور مسلم ''سِلْمٌ'' سے بنا ہے، جس کے معنیٰ صلح و سلامتی اور شانتی کے آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم اسے کہتے ہیں جو خود صلح و سلامتی کا خوگر ہو، اور دوسرے کے لیے بھی سلامتی کا خواہاں ہو، ایک سچے مومن و مسلم کی یہی شان اور حقیقی پہچان ہے، جس کو حدیث میں یوں فرمایا: ''لَا ضَـرَرَ وَلَا ضِـرَارَ'' نہ نقصان اٹھاؤ، نہ نقصان پہنچاؤ۔ بلکہ امن و سکون سے رہ کر دوسروں کو بھی امن و سلامتی کے ساتھ رہنے دو۔ اس لیے ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

''اَلْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ.''

(مشکوٰۃ /ص:۱۵/ کتاب الإیمان/ الفصل الثانی، رواہ الترمذی)

مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کے نقصان سے محفوظ و مامون رہیں، اس سے ثابت ہوا کہ وہ شخص ہرگز مومن کامل نہیں جس سے لوگ مامون نہ ہوں، اور وہ شخص ہرگز کامل مسلمان نہیں جس سے لوگ سلامت نہ ہوں۔

صاحبو! ان گذارشات سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کا موقف، اس کی پہچان اور پیغام چاند کی سفیدی اور سورج کی روشنی سے زیادہ واضح ہو

گیا، نیز یہ کہ اسلام وایمان اور سچا مسلمان اپنے قول وعمل سے امن واتفاق کا پیغام دے کر دنیا میں بھی پرامن وپرسکون معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے، یہی اس کا حقیقی نصب العین اور اس کی ہر تحریک کی اصل روح ہے، اس کے باوجود بھی اب اگر اللہ تعالیٰ کی پاک زمین پر کوئی حکومت وقوت فتنہ وفساد پھیلاتی ہے، امن واتفاق اور صلح وسلامتی کو پامال کرتی ہے، تو ایسے شر پسند اور امن دشمن طاقتوں کو جنگ وجہاد کے ذریعہ ختم کرنے کی اسلام نے تعلیم وتاکید بھی کی ہے، قرآنِ مقدس میں جہاں قتل وقتال اور جنگ وجدال کا ذکر ملتا ہے وہ مطلقاً نہیں، بلکہ ظلم وزیادتی کے ماحول کو امن وسلامتی سے بدلنے کے لیے ہے، اس اعتبار سے تو اس حکم میں بھی اتفاق وامن کا پیغام ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور اتفاق وامن قائم فرمادیں۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰی اللّٰه عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ

☆......☆......☆
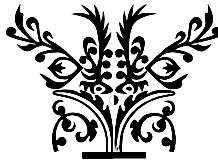
(۳)

اسلام اپنے ابتدائی اور انتہائی دور میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : " بَدَأَ الإِسْلَامُ غَرِيْباً، وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ، فَطُوْبىٰ لِلْغُرَبَاءِ." (رواه مسلم، مشكوٰة/ص: ۲۹/باب الاعتصام بالكتاب والسنة/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اسلام کی ابتداء غربت کی حالت میں ہوئی، اور پھر (اخیر میں) ایسا ہی ہو جائے گا جیسا ابتداء میں تھا، تو غرباء کے لیے خوش خبری ہو۔‘‘

اسلام کا ابتدائی دور:

رب کریم نے اس دنیائے دنی و فانی کا دستور کچھ ایسا بنایا ہے کہ اس کی ذات کے سوا یہاں ہر آغاز اور ابتداء کا انجام فنا ہونا ہے، خواہ وہ شئ مادی ہو یا روحانی، ظاہری ہو یا باطنی، دنیوی ہو یا دینی، غرض ہر آغاز کا کوئی نہ کوئی انجام اور ہر ابتداء کے لیے ایک نہ ایک اختتام ضرور ہے، حتیٰ کہ دین اسلام جو الٰہی اور فطری دین ہے، خود اس کا بھی ایک آغاز اور پھر اخیر میں اختتام ہے۔

چنانچہ دین اسلام کا آغاز تو رحمت عالم ﷺ کی بعثت سے ہوا، لیکن اختتام قیامِ

قیامت پر ہوگا، اس وقت صورتِ حال یہ ہوگی کہ اسلام اور اس کی دائمی صداقتوں اور عظمتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے (مسلمان) نہ رہیں گے، تب اس ہنستی ہنساتی دنیا، اس رنگ برنگ جہاں اور اس چمکتی دمکتی کائنات کے وجود کا کوئی جواز نہیں رہے گا، اس لیے یہ سب کچھ ملیامیٹ کر دیا جائے گا، حدیث بالا میں اسلام کے آغاز و اختتام کی کیفیت کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: "بَدَأَ الإِسْلاَمُ غَرِيْباً" اسلام جو بنی نوعِ انسان کی حقیقی، یقینی اور ابدی کامیابی کا ضامن ہے، جانتے بھی ہو اس کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس کا آغاز کوئی شان وشوکت، عظمت وجلالت اور قوت و اجتماعیت کے ساتھ نہیں ہوا، بلکہ نہایت ہی غربت اور اجنبیت کی حالت میں ہوا، بالکل اس غریب الوطن، اجنبی مسافر کی طرح جو وطن سے دوری، پھر تنہائی اور اسباب سے محرومی کے سبب کس مپرسی، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں ہوتا ہے، بظاہر اس کا کوئی پشت پناہ اور خیر خواہ نہیں ہوتا، یہی حال تھا اسلام کا اس کے ابتدائی دور میں، اس کے ساتھ بھی اجنبیت کا معاملہ کیا گیا، کوئی اس کو ماننے والا اور اس کے پیغام کو سننے سمجھنے والا نہ تھا، عملی زندگی میں کوئی اس کو اپنانے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا، (الا ماشاءاللہ) کیوں کہ وہ دنیا کی تاریخ کا سب سے بھیانک اور تاریک وقت تھا، دنیا ساری ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی، باطل اور بت پرستی کا حال یہ تھا کہ خانۂ خدا کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش ہوتی تھی، مردار خوری اور ڈاکہ زنی، چوری اور زناکاری، جوا بازی اور سود خوری، قطع رحمی اور دغا بازی، شراب نوشی وغیرہ صبح شام کا عام مشغلہ تھا، ظاہر ہے کہ ایسے گمراہی والے ماحول قابل لَاحَوْلَ میں جب اسلام کی ابتدا ہوئی، تو اس کی اجنبیت اور غربت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں! یہ اسلام کے ابتدائی دور کی دل خراش داستان کا ایک مختصر سا خاکہ ہے، جس کو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ "بَدَأَ الإِسْلاَمُ غَرِيْباً"، مطلب یہ ہے کہ صدائے اسلام اپنے اولِ مرحلہ میں غربت کی حالت میں بلند ہوئی، اور غربت ہی کے کانوں سنی گئی۔

آفتابِ اسلام جہاں جہاں سے گذر گیا وہاں وہاں سحر ہوئی:

اس کے باوجود چوں کہ اسلام میں ایک کشش تھی، جاذبیت وحقانیت تھی، اور سب سے بڑی اور سچی بات یہ کہ شرک و جہالت اور کفر و ضلالت کے دلدل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے لیے صراطِ مستقیم اور منزلِ مقصود کا پیغام تھا، اس لیے فطرت سے بغاوت کرنے والوں کو چھوڑ کر جن جن سعادت مندوں نے اسلام کا پیغام دل کے کانوں سے سنا، اسلام کی غربت ان کے لیے کافور اور اجنبیت دور ہوگئی، اور پھر جیسے آفتاب ایک بار جب طلوع ہو جاتا ہے تو چمگادڑ چاہے یا نہ چاہے، لیکن شب کی سیاہی اور رات کی تاریکی ختم ہو ہی جاتی ہے، اور سورج کی روشنی سے سارا عالم روشن ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح آفتابِ اسلام جب ایک بار طلوع ہوا تو دنیا کی ظلمت، جہالت اور ضلالت ختم ہوگئی، اور اس کے نور سے سارا عالم منور ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا کے افق پر چھا گیا، اس کی شعاعیں ہر طرف اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پھیلنے لگیں، اس کا دائرہ بڑھتا اور اس کا سورج چڑھتا ہی گیا: بقول

عالم میں دھوم مچ گئی اسلام اور فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدئ گوشہ نشین کی

﴿وَرَأَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ (النصر: ۲)

اور تم لوگوں کو دیکھ لو کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

اس وعدۂ ربانی کا منظر سامنے آ گیا، اس کے بعد پھر اسلام جہاں جہاں سے گذر گیا وہاں وہاں سحر ہوئی، وہ تمام رائج الوقت مذاہب پر فوقیت لے گیا، کیوں کہ اسلامی تعلیم و تہذیب فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، اس لیے بھی اس کے سامنے دیگر مذاہب وملل کی تہذیبیں اس طرح ماند پڑ گئیں جیسے سورج کے سامنے چراغ کی روشنی، اور اس طرح ایک اور وعدۂ ربانی: ﴿هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (الصف: ۹) پورا ہوا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچائی کا دین دے کر بھیجا ہے، تا کہ وہ اسے تمام دوسرے دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرک لوگ ناپسند کریں۔

اسلام کا پیغام کس طرح ہو گیا عام؟:

دنیا والے حیرت میں رہ گئے کہ تیئیس (۲۳) سال کے قلیل عرصہ میں اسلام کی غربت ختم ہو کر اس کا پیغام کس طرح عام ہو گیا؟ اس سلسلہ میں حق اور حقیقت یہ ہے کہ واقعی کسی خاص جدو جہد کے بغیر نہایت مختصر مدت میں دنیا کے اکثر علاقے اسلام کے زیر اثر آ گئے، تو اس میں اسلام کی فطری کشش کے علاوہ ایک خاص وجہ یہ بھی رہی ہے کہ اسلام کے سپوتوں، سپاہیوں اور مجاہدوں کے پیش نظر ملک گیری کی ہوس اور اپنے رقبے میں اضافہ کرنا نہ تھا، اس کے بجائے وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ العظیم کی بندگی وغلامی میں داخل کرنے کا مشن لے کر نکلتے تھے، اس لیے جہاں جہاں بھی ان کی فتوحات کے پرچم لہرائے، وہاں وہاں عدل واعتدال اور امن وامان کا بول بالا ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود مفتوح قومیں ان سے نفرت کرنے کے بجائے محبت کرتی تھیں، اور زمین کے جو خطّے ابھی ان کی اقتدار سے محروم تھے، ان میں اکثر ظلم وستم سے کچلے ہوئے افراد یہ تمنائیں کرتے کہ ''کاش! اسلامی لشکر ان کے علاقوں پر بھی حملہ کر کے وہاں بھی اسلامی نظام قائم کر لے! پھر وہ موقع آیا تو جہاں جہاں اسلام کے سپاہی پہنچے وہاں وہاں اسلامی سلطنتیں قائم ہو گئیں، اور اس طرح دینِ اسلام اور اس کا پیغام عام ہو گیا۔

اسلام پر ایک الزام اور اس کا اِزالہ:

مگر افسوس صد افسوس! ان حقائق کو نظر انداز کر کے معاندین نے الزام لگا دیا کہ ''اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا ہے'' حالاں کہ یہ ایک نہایت ذلیل اور قبیح جھوٹ

ہے، جسے دنیا کا ہر انصاف پسند آدمی غلط اور غیر معقول سمجھتا ہے، پھر یہ بات جہاں تاریخِ اسلام کی تصریح کے خلاف ہے، وہیں دین اسلام کے اصول کے بھی منافی ہے، کیوں کہ دین و مذہب کے حوالے سے تو اسلام نے ہر ایک کو بھرپور آزادی دی ہے، قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے: ﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ (البقرة/ ٢٥٦)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اور جس دین کی حقانیت آفتاب سے زیادہ روشن ہو اس میں زبردستی اور زیادتی کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ ہاں، اسلام اپنے اسلوبِ خاص میں تبلیغ وترغیب کا فریضہ بے شک انجام دیتا ہے، مگر جبر واکراہ کے ساتھ نہیں۔

چناں چہ آیت کریمہ کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے امام ابن جریر طبریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت سالم بن عوف انصاریؓ کے دو بیٹے نصرانی تھے، انہیں بڑی فکر تھی، چاہتے تھے کہ وہ دونوں بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں، ایک مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''حضور! کیا مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنے دونوں بیٹوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کروں؟'' اس وقت مذکورہ آیت نازل ہوئی، جس میں صاف فرما دیا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر واکراہ نہیں۔ (تفسیر طبری/ص:۲/۳، از: ''ندائے شاہی'' جون/ ۲۰۰۸)

اس سے واضح ہو گیا کہ تلوار کے زور سے جو مذہب پھیلا ہے وہ اسلام نہیں، وہ اور کوئی مذہب ہے، تلوار کے زور سے تبلیغ کس نے کی؟ یہ دنیا کی تاریخ بتلا دے گی، تعصب سے بالاتر انصاف کی نظر رکھنے والے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کر کے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں کہ آج تک مذہب کے نام پر کیا کچھ مظالم دنیا بھر میں حاملانِ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیے گئے، ان کی داستانِ دل خراش سن کر تو کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے، کیا تاریخ ان واقعات کو کبھی فراموش کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے اس سارے مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ

اپنے عیبوں کی کہاں کچھ پروا ہے؟

غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے کہ تیغ سے اسلام پھیلا ہے
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

اور؟

تنقید صرف اور پہ کرنا بجا نہیں
یہ آئینہ بھی آپ ذرا دیکھتے چلیں

صاحبو! بات اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اسلام میں کشش اور جاذبیت ہی ایسی رکھی ہے کہ اجنبیت کے باوجود دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں کو اسلام نے اپنی طرف مائل ہونے اور قبول کرنے کے لیے مجبور کر دیا، ورنہ آج جب کہ اسلام اور مسلمان بظاہر ہر طرف سے مغلوب اور ظاہری شان وشوکت اور قوت سے محروم ہیں، اب وہ کونسی تلوار ہے جو غیروں پر چل رہی ہے اور انہیں جوق در جوق اسلام میں داخل کر رہی ہے؟ یہ اس کی جاذبیت اور حقانیت ہی تو ہے جس کی وجہ سے حقیقت پسند اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

اسلام کا اختتامی دور:

لیکن اگر اسلام کی عظمت وجلالت اور شان وشوکت ہمیشہ باقی رکھی جائے تو پھر قیامت قائم نہیں ہوسکتی! کیوں کہ روئے زمین پر جب تک اسلام اور اس کے حامی باقی رہیں گے قیامت نہ آئے گی، جب کہ قیامت حق اور اس کا وقوع یقینی ہے، اس لیے اخیر میں پھر ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ لوگ اسلامی احکام بلکہ اسلامی پیغام تک کو فراموش کرتے چلے جائیں گے، حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ اسلام سے بیگانگی وبے رُخی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی، اور وہی اسلام کا اختتامی دور ہوگا۔

قرآن پاک میں فرمایا: ﴿وَ الضُّحٰی وَ اللَّیْلِ إِذَا سَجٰی﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں "الضحیٰ" سے مراد اسلام کا دورِ اول ودورِ عروج ہے، اور "اللیل" سے مراد

اسلام کا دورِ آخر ہے، جس میں اسلام کمزور اور اجنبی ہو جائے گا۔ (تفسیر عزیزی جدید/ص:۵۰۱)

حدیث پاک کی پیشین گوئی کے مطابق اس زمانہ میں اسلام کے ساتھ ابتدائی دور کی طرح اجنبیت کا معاملہ کیا جائے گا۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اب اس اختتامی دور کی ابتداء ہو چکی ہے، کیوں کہ بد قسمتی سے اس وقت مسلمان ہر قسم کی ظاہری شان و شوکت، عظمت و جلالت اور اخوت و اجتماعیت سے محروم اور مایوس نظر آتے ہیں، مسلمان کو وطن سے بے وطن اور ان سے لوگوں کو بدظن کرنے کی چاروں طرف سے ناپاک کوششیں کی جا رہی ہیں، اسلامی تعلیمات و احکامات خصوصاً پردہ، قصاص اور دیگر فرائض و واجبات کو دقیانوسی اور قدیم خیالات بتلا کر لوگوں کو اسلام اور سچے پکے مسلمانوں سے دور اور اجنبی کرنے کی سعی کی جا رہی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا والے اسلام کے قدموں میں گر کر اپنے دردِ دل کا علاج نہیں کریں گے قسم بخدا! اس وقت تک ان کے حصہ میں دکھوں، غموں، محرومیوں کے لپکتے ہوئے شعلوں اور سلگتے ہوئے انگاروں کے سوا کچھ نہیں آئے گا، کچھ نہیں آئے گا۔

غرباء سے کون لوگ مراد ہیں ؟:

اس حقیقت کے جان لینے کے بعد اب جو لوگ دامنِ اسلام سے وابستہ ہیں انہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت ہی نہیں، آج انہیں اگر چہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے چاروں طرف بیگانگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے، اس کے باوجود یہ بیگانگی ہم مسلمانوں کے لیے باعثِ کلفت و مشقت نہیں ہونی چاہیے، کہ حدیث میں ایسے ہی بیگانے مبارک قرار دیے گئے ہیں۔ فرمایا: ”فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ“ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ایمان کی حفاظت و اشاعت کر کے اس پر استقامت اختیار کریں، تا کہ ”غرباء“ کے زمرہ میں شامل ہو کر نبوی خوش خبری اور ابدی کامیابی کے حقدار بن جائیں، کیوں کہ ”غرباء“ سے وہی لوگ مراد ہیں جو اسلام کے ابتدائی اور آخری دور میں اس کی بیگانگی اور اپنی بے بسی کے عالم میں بھی برابر اس پر قائم رہیں گے اور اس کی حفاظت اور اشاعت کرتے رہیں گے، اب چوں کہ عام طور پر ایسے

لوگ دنیوی اعتبار سے زیادہ صاحب ثروت نہیں ہوتے، اس لیے غرباء سے ایسے لوگ مراد لیں جنہیں دنیا والے غریب کہتے ہیں تو بھی کچھ بعید نہیں ہے، کہ حق کی ترویج وتبلیغ میں زیادہ حصہ ان ہی کا رہا، اور غربت میں اپنے دین کی حفاظت واشاعت آسان بھی ہے، اس لیے حدیث کے ظاہری الفاظ اور حضراتِ محدثین کی توجیہات وتشریحات سے بعضوں نے ان ہی غرباء کو مراد لیا ہے، کیوں کہ مالدار عموماً دینی امور میں پیچھے رہتے ہیں، البتہ جب اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے دے تو پھر سب کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن دوسری حدیث میں خود رحمت عالم ﷺ نے ''غرباء'' کی وضاحت فرمائی وہی اصل اور قابلِ اعتبار ولائق التفات ہے، فرمایا: غرباء سے وہ لوگ مراد ہیں:

'' اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ .'' (مشکوٰۃ/ص : ۳۰، رواہ الترمذی)

جو میرے بعد میری اس سنت کو درست کریں گے جسے لوگوں نے بگاڑ دیا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، بہر حال اصلاح کرنے والے مصلحین جن کا مشغلہ احیاءِ سنت اور اصلاحِ خلق ہے، وہی لوگ دراصل غرباء ہیں، یہ لوگ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا واقعہ:

چناں چہ مفکرِ ملت حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں آپ جیل میں قید کر دیے گئے تو وہاں دیکھا کہ سارے جیل کے قیدی لہو ولعب اور تفریحات وفضولیات میں لیل ونہار گذار رہے ہیں، نمازیں بے تکلف قضا کر رہے ہیں، آپ قید خانے کے بے دینی والے ماحول سے متفکر ہو گئے، سنت یوسفی کے جذبہ سے وہاں اصلاحِ خلق کا کام شروع کر دیا، قیدیوں کو نماز کی پابندی، توبہ و استغفار، سنت نبوی اور دینداری کی طرف خلوصِ دل سے متوجہ فرمایا، اس کا اثر یہ ہوا کہ کچھ ہی

دنوں میں جیل کا ماحول بدلا، رفتہ رفتہ یہ جیل خانہ مدرسہ اور خانقاہ سے زیادہ بارونق نظر آنے لگا، حتیٰ کہ قیدیوں کو حضرت شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی ذاتِ اقدس سے اور جیل کی اس دینی، علمی اور تربیتی زندگی سے ایسی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ بہت سے قیدی رہائی پانے کے بعد بھی جیل چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ (الکواکب الدریہ، از: تاریخ دعوت وعزیمت ج:۲، ص:۸۵)

سچ ہے کہ

زمانہ یاد کرتا ہے ان انسانوں کو
روک دیتے ہیں جو بڑھتے ہوئے طوفانوں کو

اسی قسم کے لوگ ”فَطُوبٰی لِلْغُرَبَاءِ“ کے مصداق ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ اس آخری دور میں ہمیں بھی غرباءِ اسلام میں اپنی رحمت سے شامل فرما کر نبوی بشارت کا مصداق بنائے۔ آمین

☆......☆......☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍوؓ قَالَ : قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : ’’إِنَّ مِنۡ خِیَارِکُمۡ أَحۡسَنَکُمۡ أَخۡلَاقاً.‘‘ (متفق علیہ، مشکوٰۃ / ص: ۴۳۱/ باب الرفق و الحیاء و حسن الخلق/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’بلاشبہ تم میں سب سے بہترین اشخاص میں سے وہ ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے اچھا ہو‘‘۔

حسنِ اخلاق کی ترغیب و تلقین:

حسنِ اخلاق دینِ اسلام کی جامع تعلیمات اور نافع ہدایات کا خلاصہ ولب لباب ہے، اور کمالِ ایمانی کا لازمی نتیجہ وثمرہ ہے، یہ وہ وصف ہے کہ اگر وہ اخلاص وایمان کے ساتھ ہو تو اس سے متصف ایک مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر انسان اپنے خالق کی خوشنودی اور مخلوق میں ہر دل عزیزی، بلکہ دونوں جہاں کی دائمی کامیابی حاصل کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جابجا ایمان واعمال کے بعد اخلاق کی ترغیب اور تلقین وتاکید آئی ہے، ایک مقام پر فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الأعلىٰ: ١٤)

کامیاب اور بامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنا تزکیہ کر لیا۔ اپنے اخلاق درست کر لیے، یعنی جو حسن اخلاق سے متصف ہو گیا۔ اور حدیث مذکور میں گویا اس مضمون کو یوں بیان فرمایا: ”إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقاً“ بلا شبہ تم میں سب سے بہترین شخصوں میں سے خالق و مخلوق کے نزدیک (دارین میں) وہی ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، جو حسن اخلاق سے متصف ہو۔ اس لیے اخلاق کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن نے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ (البقرة: ٢٣٧)

تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور اخلاق کا معاملہ کرو، اس اخلاقی درس کو ہرگز نہ بھولو، ہر جگہ اور ہر وقت اسے یاد رکھو۔ گویا اسی مضمون کو ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ، وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ، تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ.“

(ترمذی/مشکوٰۃ/ص: ٤٣٢)

لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، جہاں کہیں بھی ہو، عاجز کے خیالِ ناقص میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق بھی یہی ہے جس کا حکم دیا گیا، فرمایا:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران: ١٠٢)

اے ایمان والو! (دل میں) اللہ کا ایسا ہی خوف رکھو جیسا خوف اس کا حق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارا اللہ سے ڈرنا کسی خاص وقت، خاص جگہ اور خاص حالت پر موقوف نہ ہو، بلکہ سفر و حضر، خوشی و غمی، خلوت اور جلوت ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرو، تب ہی گناہ سے بچنا اور نیکی کرنا آسان ہوگا، پھر بھی اگر کوئی گناہ اور برائی ہو جائے تو حدیث میں

دوسرا حکم یہ ہے کہ گناہ اور بدی کے بعد نیکی کا اہتمام کرلو، ان شاء اللہ یہ نیکی اس بدی کا کفارہ بن جائے گی، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (هود:١١٤)

یقیناً نیکیاں برائیوں کومٹا دیتی ہیں۔ لہٰذا کبھی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ، صدقہ اور نیکی کا اہتمام کرو۔

اسی کے ساتھ حدیث میں تیسرا حکم یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ کرو۔ قرآنِ پاک نے اسے یوں فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ أَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الأعراف: ١٩٩)

درگذر کا رویہ اپناؤ اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم کرو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔

معلوم ہوا کہ تقویٰ اور طاعات وحسنات کے ذریعہ گناہوں کی تطہیر کے بعد بھی کامیابی اور رضائے الٰہی کے لیے حسن اخلاق کا معاملہ کرنے کی ضرورت ہے، اس سے بھی حسن اخلاق کی اہمیت ثابت ہوئی۔

اخلاق کی حقیقت:

اب سوال یہ ہے کہ حسن اخلاق کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں علماء نے فرمایا کہ اخلاقِ مصطفوی کا نام حسن اخلاق ہے، دوسرے لفظوں میں قرآن و حدیث میں جن بھلائیوں کا حکم دیا گیا ہے انہیں اختیار کرنا اور جن برائیوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اجتناب کرنے کا نام حسن اخلاق ہے، اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کتاب وسنت کی روشنی میں حسن اخلاق کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"بَسْطُ الْوَجْهِ، وَبَذْلُ الْمَعْرُوْفِ، وَكَفُّ الْأَذٰى." (مفتاح الأسرار شرحِ مشكوٰة الآثار/ص:٢١٣)

یعنی تین چیزوں کا نام اخلاق ہے:

(۱) ملاقات کے وقت دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا پرایا، ہر ایک سے (بشرطیکہ محرم ہو) کشادہ روئی، خندہ پیشانی اور خوش دلی سے پیش آنا۔

(۲) بخشش اور سخاوت کرنا، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال، وقت، صلاحیت اور علم وغیرہ بندگانِ خدا کے نفع اور ضرورت وہدایت کے لیے اپنی بساط کی حد تک خرچ کرنا، سب جانتے ہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے اخلاق سے اچھا برا جانا جاتا ہے۔ پھر جس درخت کا پھل عمدہ اور اچھا ہوتا ہے اس نفع بخش درخت کو پسند کیا جاتا ہے، بلکہ اس کی حفاظت کی جاتی ہے اسی طرح جس انسان کے اخلاق عمدہ اور اچھے ہوتے ہیں اسے بھی پسند کیا جاتا ہے اور اس کی بھی حفاظت کی جاتی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ (الرعد : ۱۷)

یعنی جو شخص انسانیت کے لیے اپنے ایمان، اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے نفع بخش ہوتا ہے اسے زمین میں جماؤ دیتے ہیں۔ پھر دنیا سے جانے کے بعد بھی اس کا ذکر خیر زندہ رہتا ہے۔

غرض حسن اخلاق کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی ہر اعتبار سے نفع بخش بنے اور اپنی ذات سے بلا کسی وجہ کے کسی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔

(۳) ایذا رسانی سے باز رہے۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں: ”ہم نے اخلاق کا نام چاپلوسی، خوشامد اور میٹھی باتیں کرنا سمجھ لیا ہے، خواہ دل میں کچھ ہو، اس طرح حقیقت میں اخلاق کو نفاق سے بدل دیا ہے، ورنہ اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذا ظاہری یا باطنی، حضور یا غیبت میں نہ پہنچے، حتیٰ کہ ہمارے بعض اکابر کے یہاں خلافت کا اصل معیار ہی بے ضرر

ہونا تھا‘‘۔

ظاہر ہے کہ یہ تین چیزیں بھی ان اخلاق اور اوصاف میں سے ہیں کہ اگر کوئی شخص غلط اغراض سے بے لوث ہو، اور ایمان واخلاص کے ساتھ ان اخلاق سے بھی متصف ہو تو وہ خالق ومخلوق میں محبوبیت اور مقبولیت حاصل کر لیتا ہے، اور پھر دونوں جہاں کی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک شعر ہے:

حسن اخلاق ملک خدا کا تاج ہے
ہے جس کے سر پہ، ہر جگہ اس کا راج ہے

صاحبو! تلوار، ٹینک، توپ اور طاقت کے زور سے تو صرف میدان اور ملک جیتے جاتے ہیں، لیکن اخلاق اور کردار کے زور سے دل جیتے جاتے ہیں، بلاشبہ تلوار بھی مردِ مومن کا زیورِ ناگزیر ہے، مگر جو بات کردار میں ہے وہ تلوار میں کہاں؟ اخلاق میں جو قوت ہے وہ کسی اسلحہ میں کہاں؟ تاریخ کی شہادت ہے کہ از آدمؑ تا ایں دم جو چیز دشمنوں کے لیے شمشیر بے نیام سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی اور جس نے سالوں کی عداوتوں کو محبتوں سے بدل دیا وہ حسن اخلاق ہی ہے۔ ایک اور شعر ہے:

حسنِ اخلاق سے ہو جاتا ہے ہر کوئی خلیق
حسنِ اخلاق سے ہو جاتا ہے بیگانہ بھی خلیل

حسنِ اخلاق کے حیرت انگیز واقعات:

اس سلسلہ میں خیر القرون میں حضراتِ صحابہؓ کے علاوہ صلحاء اور ماضی قریب کے اکابر کے بھی بہت سے حیرت انگیز واقعات ہیں، مثلاً:

۱- حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جب آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ اسٹیشن پر شرفِ زیارت

کے لیے گئے، اس وقت حضرت کے متوسلین میں سے ایک شخص محمد عارف جھنگ سے دیو بند تک ساتھ گئے، ان کا بیان ہے کہ ٹرین میں ایک ہندو جنٹلمین بھی تھا، جس کو قضاءِ حاجت کے لیے جانا تھا، لیکن جا کر الٹے پاؤں بادلِ ناخواستہ واپس آیا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے، فوراً لوٹا لے کر پاخانہ گئے، اور اچھی طرح اسے صاف کر کے واپس آ گئے، پھر اس ہندو دوست سے فرمانے لگے: ''آپ قضاءِ حاجت کے لیے جانا چاہتے تھے تو جائیے! بیت الخلاء بالکل صاف ہے'' قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا، بہت متأثر ہوا اور قضاءِ حاجت کے بعد بھرپور عقیدت سے عرض کرنے لگا: ''یہ حضور کی بندہ نوازی ہے، جو سمجھ سے باہر ہے'' اس واقعہ کو دیکھ کر ٹرین میں سوار خواجہ نظام الدین تونسوی مرحوم نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ ''یہ کھدر پوش کون ہے؟'' جواب ملا کہ ''یہ مولانا حسین احمد مدنی ہیں'' تو خواجہ صاحب فوراً حضرت مدنیؒ سے لپٹ گئے اور رونے لگے، حضرت مدنیؒ نے پوچھا کہ ''کیا بات ہے؟'' تو کہا: ''سیاسی اختلاف کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیے اور برا بھلا کہا، آج آپ کے اعلیٰ کردار اور اخلاق کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید مر کر سیدھا جہنم میں جاتا۔'' اس پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''میرے بھائی! میں نے تو حضور ﷺ کی سنت پر عمل کیا ہے، اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے یہاں ایک یہودی مہمان نے آپ ﷺ کے بستر مبارک پر رات کھا کر پاخانہ کر دیا اور صبح اٹھ کر جلدی چلا گیا، اور اپنی تلوار وہیں بھول گیا، جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ حضور ﷺ بنفس نفیس اپنے دستِ مبارک سے بستر دھو رہے ہیں، حضور ﷺ کے اِن اعلیٰ اخلاق کو دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔'' (ماہنامہ الرشید، مدنی و اقبال نمبر: ص/۲/۱۷۱/ از کتابوں کی درسگاہ میں: ص: ۱۳۷)

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حسنِ اخلاق دعوتی میدان میں نہایت ہی مؤثر پیغام رکھتا ہے، اس کی حیثیت ایک سائلینٹ میسیج (خاموش پیغام) کی ہے، آج ہم مسلمان اسلام کی تعلیم و تاکید کے مطابق حسنِ اخلاق اختیار کر لیں تو یقیناً غیر مسلم ہمارے اخلاق کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیں، اس لیے کہ جو قوم ہر کنکر کو شنکر مان کر اس کے سامنے جھکتی

ہے وہ حسنِ اخلاق کے سامنے کیوں نہ جھکے گی؟ وہ حسنِ اخلاق سے کیسے متأثر نہ ہوگی؟ لہٰذا ضرورت ہے ایمان کے بعد اخلاص کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے کی، عاجز نے ذرا سی ترمیم کرتے ہوئے کہا ہے:

خلقِ نبی کا اب تو نمونہ دکھایئے
اغیار کو بھی اخلاص سے گلے لگایئے

۲- حضرت شاہ عطاء اللہ بخاریؒ ایک مرتبہ خیر المدارس جالندھر کے جلسے میں تشریف لے گئے، کھانے کے وقت جب دستر خوان پر بیٹھے تو ایک نوجوان بھنگی کو دیکھا، شاہ جی نے فرمایا: ''آؤ بھائی! کھانا کھالو'' اس نے عرض کیا: ''جی! میں تو بھنگی ہوں'' شاہ جی نے درد بھرے لہجہ میں فرمایا: ''تو کیا ہوا؟ انسان تو ہو، اور بھوک تو لگتی ہے'' یہ کہہ کر خود اٹھے اور اس کے ہاتھ دھلا کر ساتھ بٹھالیا، وہ بیچارہ تھر تھر کانپتا تھا، اور کہتا تھا کہ ''جی میں تو بھنگی ہوں'' تو شاہ جی نے خود ہی لقمہ توڑا اور شوربے میں بھگو کر اس کے منہ میں دے دیا، اس کا کچھ حجاب دور ہوا، تو شاہ جیؒ نے ایک آلو اس کے منہ میں ڈالا اس نے آدھا آلو دانتوں سے کاٹ لیا تو باقی آدھا حضرت نے خود کھالیا، اسی طرح اس نے پانی پیا تو اس کا بچا ہوا پانی خود پی گئے، وقت گذر گیا، وہ کھانے سے فارغ ہو کر غائب ہوگیا، عصر کے وقت وہ اپنی نوجوان بیوی کو جس کی گود میں بچہ تھا لے کر آیا اور کہا: ''شاہ جی! اللہ کے لیے ہمیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیجئے'' اور اس طرح اخلاق سے متأثر ہو کر میاں بیوی دونوں مسلمان ہوگئے۔

(بخاری کی باتیں/ص:۲۹، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۱۰۷)

سچ ہی کہا ہے:

علم و عمل کی دنیا میں اس طرح گذارا کرتے ہیں
اخلاق سے مارا کرتے ہیں، احسان سے جیتا کرتے ہیں

حسنِ اخلاق پر اخروی انعامات:

صاحبو! دراصل ایمان وہ ہے جو دل میں داخل ہوکر اخلاق کی صورت میں ظاہر ہو، کیوں کہ اسلام کے شجرۂ طیبہ کا ثمرۂ شیریں حسنِ اخلاق ہی ہے، دنیائے کفر اگر اس کا مزہ چکھ لے تو اس کے سایہ تلے آنے میں اُسے دیر نہ لگے۔

حضرت مفکر ملت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''خلوص، محبت، بے لوث خدمت اور ایثار کے ذریعہ آج بھی ایک مسلمان ہندوؤں کے درمیان مقبول اور معزز بن سکتا ہے، اور اسی میں ان بے شمار مسائل کا حل پوشیدہ ہے جنھیں مسلمانوں کی جماعتیں حل کرنے سے قاصر ہیں''۔ اس لیے کہ حسن اخلاق ہی کا دوسرا نام ''سیرت'' ہے، تو جس طرح خوبصورت انسان آنکھوں کو بھاتا ہے، اسی طرح نیک سیرت انسان دل کو بھاتا ہے، اس سے ہر انسان محبت کرنے لگتا ہے۔

غرض! حسنِ اخلاق اگر اغراض سے خالی ہو، اور ایمان واخلاص کے ساتھ ہو تو اس کا نقد انعام دنیا میں تو یہ ملتا ہے کہ اسے اس سے محبوبیت، مقبولیت اور عزت نصیب ہوتی ہے، اسی کے ساتھ وہ خلیق قیامت اور آخرت کے بے شمار فضائل کا حقدار بن جاتا ہے، چناں چہ احادیثِ مبارکہ میں حسنِ اخلاق کے دینی واخروی انعامات بیان کیے گئے ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ''جب قیامت کے دن میزانِ عدل قائم کی جائے گی تو اس میں جتنے اعمال تولے جائیں گے، ان میں حسنِ اخلاق کا وزن سب سے زیادہ ہوگا۔

عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''إِنَّ أَثْقَلَ شَيْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ. '' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۴۳۱)

سب سے زیادہ وزنی چیز جو مومن کے ترازو میں رکھی جائے گی وہ عمدہ اخلاق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسن اخلاق سے میزان کا وزن بڑھ جائے گا۔

نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمالِ ایمان کی نشانی کثرتِ عبادت نہیں،

بلکہ حسن اخلاق ہے:

"أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا." (أبو داود/ص:٦٤٣/ ج:٢، مشکوٰۃ/ص:٤٣٢)

یعنی جو شخص جس قدر حسن اخلاق کا حامل ہوگا وہ اسی قدر ایمان میں کامل ہوگا، پھر اس کی بدولت صاحبِ اخلاق کثرتِ عبادات والوں کے درجات حاصل کر لیتا ہے۔

چناں چہ حدیث میں مروی ہے کہ قیامت کے دن قائم اللیل اور صائم النہار یعنی دن میں روزہ رکھنے والا اور رات بھر نمازیں پڑھنے والا اپنے اس عمل سے جو مرتبہ اور مقام پائے گا خلیق (حسنِ اخلاق والے) کو وہی مرتبہ اور درجہ حسنِ اخلاق کی بدولت حاصل ہوگا:

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: "سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: "إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ." (أبو داود، مشکوٰۃ/ص: ٤٣١)

مومن اچھے اخلاق کی وجہ سے رات کو قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "حسنِ اخلاق سے متصف ہونے والے کے لیے جنت کے نہایت اعلیٰ درجہ میں ایک بہترین محل بنایا جائے گا۔"

"وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ بُنِيَ لَهُ فِي أَعْلَاهَا." (مشکوٰۃ/ص:٤١٢)

جس نے اپنے اخلاق کو درست کرلیا اس کے لیے جنت کے بالائی حصہ میں گھر بنایا جائے گا۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جنت حسنِ اخلاق والوں کی سوسائٹی ہے، اور وہاں ان کا خوب اکرام ہوگا، جیسا کہ منقول ہے کہ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک مرتبہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عجیب وغریب سوال کیا کہ "حضور! کسی عورت کے یکے بعد دیگرے ایک سے زائد شوہر ہوں، اور وہ سب کے سب یکے بعد دیگرے انتقال کر جائیں، تو یہ عورت جنت میں کس شوہر کے ساتھ ہوگی؟" فرمایا: "یا تو آخری شوہر

کے ساتھ ہوگی، یا پھر اسے اختیار دیا جائے گا کہ ان میں جسے چاہے پسند کر لے، یا ان میں جس کے اخلاق اچھے ہوں گے اسی کے ساتھ ہوگی، وہ کہے گی: ''الٰہی! اس کے اخلاق میرے ساتھ بہت اچھے رہے، لہٰذا میں اس کے ساتھ رہوں گی۔'' (ابن کثیر/ص: ج:۳/سورۂ واقعہ)

حسنِ اخلاق کو اختیار کرنا دین و دانش کا تقاضا ہے:

قرآن وحدیث کے ان حقائق سے معلوم ہوا کہ جس خوش نصیب کو ایمان واخلاق کی دولت نصیب ہوگی اسے یقیناً دونوں جہاں میں مقبولیت اور عزت نصیب ہوگی، اور جو اس سے محروم رہا وہ دونوں جہاں کی خیر سے محروم رہے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ضرورت ہے کہ ہم حسن اخلاق سے متصف ہو جائیں، اس کے لیے بزرگوں سے صحیح تعلق قائم کریں، اور اس طرح اپنے اخلاق کی اصلاح کر کے اپنے دل کو روشن کر لیں، ایک بزرگ نے فرمایا: ''روشن دل وہ ہے جس میں خَلْق (مخلوق کی محبت) نہ ہو، اور سیاہ دل وہ ہے جس میں خُلُق (اخلاق) نہ ہو۔''

شیخ الاولیاء سند الاصفیاء سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا قول ہے کہ ''کُنْ مَعَ الْحَقِّ بِلَا خَلْقٍ، وَمَعَ الْخَلْقِ بِلَانَفْسٍ.'' (از: رحمۃ للعالمین/ ج:۳/ص:۳۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ یہ ہونا چاہیے کہ اس میں مخلوق کا ذرا تعلق نہ ہو، اور مخلوق کے ساتھ معاملہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں نفس کا ذرا حصہ نہ ہو۔

غرض خوش اخلاقی دینداری ہے تو بداخلاقی بے دینی ہے، جو نیکی کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جیسے سرکہ شہد کو، اور اچھے اخلاق بدی کو اس طرح پگھلا دیتے ہیں جیسے پانی نمک کو، لہٰذا بداخلاقی سے اجتناب کرنا اور حسنِ اخلاق کو اختیار کرنا عقل ونقل اور دین ودانش کا تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حسنِ اخلاق سے متصف فرمائے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّی اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۵)

اتفاق کی اہمیت اور اختلاف کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ مُوۡسیٰ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلۡمُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِ کَالۡبُنۡیَانِ یَشُدُّ بَعۡضُهٗ بَعۡضاً، ثُمَّ شَبَّكَ بَیۡنَ أَصَابِعِهٖ." (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۴۲۲/باب الشفقة والرحمة علی الخلق/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے رحمت عالم ﷺ سے روایت نقل فرمائی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "(ایک) مسلمان (دوسرے) مسلمان کے لیے ایک مکان (اور اس کی دیوار) کے مانند ہے، جس کا بعض (ایک حصہ) بعض (دوسرے حصہ) کو مضبوط رکھتا ہے، پھر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل فرمایا۔

کائنات کا نظام انسانوں کے آپسی اتفاق سے چلتا ہے:

رب کریم کی سجائی ہوئی، بسائی ہوئی اور بنائی ہوئی اس کائنات کے نظام میں ذرا غور کیا جائے تو کسی بھی سمجھدار پر اتفاق کی اہمیت اور اختلاف کی مذمت واضح ہوسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ دنیا چوں کہ دارالاسباب ہے، اس لیے اسباب کے تحت کائنات کا تمام ہی نظم و

نظام اور ضبط وانتظام انسانوں کے آپسی تعاون وتناصر اور اتفاق واشتراک سے چلتا ہے، اس دنیا میں ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی دانش مند اور دولت مند کیوں نہ ہو؟ مگر وہ اپنی ساری ضروریاتِ زندگی اکیلا اور تنِ تنہا پوری نہیں کرسکتا، کیا بڑا، کیا چھوٹا، کیا عامی، کیا نامی، کیا پڑھا لکھا، کیا ان پڑھ، کیا امیر، کیا غریب، کیا گورا، کیا کالا، کیا لال، کیا پیلا، کیا عربی، کیا عجمی، کیا شہری، کیا دیہاتی، بلا تخصیص ہر ایک کو قدم قدم پر دوسرے کے سہارے اور ساتھ کی ضرورت پڑتی ہے، رعایا کو بادشاہ چاہیے تو بادشاہ سلامت کو رعایا، پبلک لیڈر کے بغیر اگر لاوارث ہے تو خود لیڈر صاحب بھی لوگوں کے بغیر، بغیر بارات کے دولہا ہیں، مزدوروں کو امیروں اور سیٹھوں کی حاجت وضرورت ہے تو امیروں کے کام بھی ان کے ملازموں کے بغیر رکے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج اگر یہ بھنگی، دھوبی، باورچی، موچی، اور منشی یا دیگر ملازمین اپنے اپنے کام کاج چھوڑ کر ہڑتال پر اتر آئیں تب دیکھئے گا کہ منشی صاحب، ڈپٹی صاحب، کلیکٹر صاحب، پروفیسر اور ڈاکٹر صاحب، انجینئر اور ایڈوکیٹ کی کیا گت بن کر رہتی ہے، مختصر یہ ہے کہ اُن کے کام ان سے وابستہ ہیں، تو اِن کی ضرورتوں کی زنجیر اُن کے دامن سے بندھی ہوئی ہے، اس طرح ربِّ کریم کی جانب سے کائنات کا یہ سارا نظام ایک دوسرے کے تعاون اور اتفاق واتحاد سے چلتا ہے۔

اتفاق کا اصل مرکز دین ہے:

اس لیے نظامِ کائنات کی بقا اور انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے آپسی اتفاق اور اتحاد نہایت اہم وضروری ہے۔ پھر اس کائنات میں اگر کوئی نیک جذبہ یا صحیح واسطہ ایسا ہوسکتا ہے جو تمام ہی انسانوں کو رنگ ونسل کے امتیاز اور زبان وذات کے اختلافات سے نجات دلا کر ہر ایک کو اتفاق اور اتحاد کی لڑی میں پروسکتا ہے تو بلا شبہ وہ دینِ حق یعنی اسلام ہی ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم سب کا دین تو ایک ہی ہے، فرمایا:

﴿ وَ إِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ (المومنون : ۵۲)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تمہارا دین ہے (سب کے لیے) ایک ہی دین۔

اور جب سب کا دین ایک ہے تو صاف ہو گیا کہ سب کے اتفاق کا اصل مرکز بھی دین ہی ہے، اس لیے حکم یہ ہے کہ

﴿ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ﴾ (آل عمران : ۱۰۳)

اللہ کی رسی یعنی دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اختلاف پیدا نہ کرو۔ آیتِ کریمہ میں "جَمِيۡعًا" کی قید لگائی، اس کا مطلب یہ ہے کہ دین تو سب کا ایک ہی ہے، اس لیے دینی و اسلامی اصولوں پر سب مل کر جمع ہو جاؤ، اور انفرادی زندگی میں اپنے مفاد سے بڑھ کر دوسرے کے مفاد کا خیال کرو، اس کی برکت سے تم میں جمعیت اور اجتماعیت خود بخود پیدا ہو جائے گی، اس کے بغیر اتحاد مشکل ہے، شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، بیرونِ دریا کچھ نہیں

حضراتِ صحابہؓ کا اتفاقِ باہمی دین اسلام کے سبب تھا:

حیاۃ الصحابہ سے دنیا و انسانیت کو یہی درس ہدایت ملتا ہے، جب صحابۂ کرامؓ کی زندگی میں دین نہیں تھا تو ہر طبقہ میں شدید اختلاف اور انتشار تھا، تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اس سے بخوبی واقف ہے، لیکن جب ان کی زندگی میں دین آیا اور صحابہؓ اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت اور حضور ﷺ کی دعوت و تربیت سے دین پر جمے، تو ان کے مابین اتفاق و اتحاد اور اجتماعیت و اخوت کی ایسی عمومی فضا قائم ہو گئی کہ مختلف علاقوں میں رہنے والے، مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف حیثیتوں اور زبانوں والے قرنِ اوّل کے تمام ہی مسلمان یک جسم و جان اور باہم شیر و شکر ہو گئے، خود قرآن نے اس کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ﴾ (آل عمران : ۱۰۳)

پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔

دربارِ رسالت میں سیدنا بلال حبشیؓ تھے، سیدنا صہیبؓ رومی تھے، سیدنا سلمان فارسیؓ تھے، سیدنا عداس نینوائیؓ تھے، سیدنا ابو ذر غفاریؓ تھے، سیدنا طفیل دوسیؓ تھے، سیدنا حذیفہ سہمیؓ تھے، سیدنا ابوسفیان امویؓ تھے، سیدنا عدی طائیؓ تھے، انصار بھی تھے، مہاجر بھی، جو کچھ بھی تھے، مگر سب نیک اور ایک تھے، اور ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰) (بلاشبہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں) کی حقیقی، عملی اور سچی تفسیر تھے، اللہ کی قسم! صحابہ کرامؓ کے پاکیزہ سماج میں جو اتفاق اور اخوت تھی پوری انسانی تاریخ میں کہیں اس کی مثال نہ ملتی ہے اور نہ ملے گی۔

ایک ہدایت آموز واقعہ:

چناں چہ ہجرت کے بعد رحمت عالم ﷺ نے اتفاق کی اہمیت کے پیش نظر مہاجرینؓ اور انصارؓ میں مواخات قائم فرمائی، تاریخ انسانی میں یہ ایسا عدیم النظیر واقعہ ہے جس میں تمام انسانوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً سامانِ عبرت ہے، اس سلسلہ کا ایک ہدایت آموز واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بھائی چارہ حضرت سعدؓ بن ربیع سے ہوا، اِن کے آپس میں اخوت قائم ہوجانے کے بعد حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے فرمایا:

”أَيْ أَخِيْ! أَنَا أَكْثَرُ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَالًا، فَانْظُرْ شَطْرَ مَالِيْ، فَخُذْهُ، وَتَحْتِيْ امْرَأَتَانِ، فَانْظُرْ أَيَّتُهُمَا أَعْجَبُ إِلَيْكَ، حَتّٰى أُطَلِّقَهَا.“

اے میرے بھائی! میں مدینہ منورہ میں الحمدللہ سب سے زیادہ مالدار ہوں، لہٰذا دیکھ لو اور اپنی پسند کا میرا آدھا مال لے لو، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری دو بیویاں ہیں، جن کے ساتھ زندگی خوشی خوشی بسر ہورہی ہے، لیکن تم میرے ایمانی بھائی ہو اور اب تک بغیر بیوی کے زندگی بسر کررہے ہو، اس لیے دیکھو، میری دو بیویوں میں سے جو پسند ہو میں اسے طلاق دے دوں گا، پھر عدت کے بعد تم اس سے شادی کر لینا، سبحان اللہ! کیا ایثار اور اخوت تھی؟

لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی غیور طبیعت نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، فرمایا: "بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْ أَهْلِكَ وَ مَالِكَ، دُلُّوْنِيْ عَلَىٰ السُّوْقِ." (حیاۃ الصحابۃ: ۱/۳۶۳) جزاکم اللہ خیرا فی الدارین اللہ تعالیٰ تمہارے اہل وعیال اور مال ومنال میں بہت ہی زیادہ برکتیں عطا فرمائے، آمین۔ آپ مجھے صرف بازار کا راستہ بتلا دیجئے، آگے اللہ تعالیٰ مالک ہے، تو حضرت سعدؓ نے بے تکلف ان کی رہبری فرمائی، اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بازار جا کر خرید وفروخت شروع کردی، اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ انہیں تجارت میں اتنا نفع ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مال بھی دیا اور شادی بھی کرادی، ان کی تجارت میں برکت کا حال خود ہی فرماتے ہیں کہ اگر میں کوئی پتھر بھی اٹھاتا تو مجھے اس سے سونا چاندی حاصل ہونے کی امید ہوتی۔

امت مسلمہ ایک وجود بن جائے تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا:

صاحبو! یہی تو ایمان اور ایمانی زندگی کی خاصیت ہے، اس سے اجتماعیت بھی نصیب ہوگی اور برکت بھی، حضرات صحابہؓ نے ایمان کے بعد اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان جہاں اور جیسا بھی ہو، جس رنگ ونسل سے بھی تعلق رکھتا ہو، لیکن مومن ہونے کی حیثیت سے وہ دوسرے مومن کا بھائی ہے، اور ساری امت مسلمہ ملت اسلامیہ کے توسط سے مربوط اور مضبوط رشتہ میں بندھی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں امت مسلمہ کو ایک مضبوط عمارت اور دیوار سے تشبیہ دی گئی: "اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ." علماء نے فرمایا کہ یہ حدیث آیت کریمہ ﴿ كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوْصٌ ﴾ (الصف: ٤) (ایمان والے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہیں) کی تفسیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جو تعلق ہوتا ہے، اس کی مثال ایک مضبوط عمارت کے مانند ہے، جس کے مختلف حصے باہم مل کر مضبوط ہو جاتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھائیں، گویا مسلمان کے آپسی تعلق کو مضبوط مکان کے ساتھ تشبیہ دے

کر اتفاق کی اہمیت اور اختلاف کی نحوست کو حدیث مذکور میں بہترین انداز سے سمجھایا گیا، کہ جس طرح مکان کے مختلف اجزاء اور حصے اینٹ، لوہا، لکڑی وغیرہ ایک دوسرے سے جڑ کر ایک مضبوط اور پختہ عمارت بن سکتی ہے، مسلمانوں کے بھی مختلف افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مضبوط جماعت بن سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی قوت جمعیت میں ہے، انفرادیت میں نہیں، ورنہ جیسے تعمیر مکان سے پہلے جب اس کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے علاحدہ تھے، تو حال یہ تھا کہ اینٹوں کا ڈھیر پڑا ہے، الگ الگ اینٹیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں، لیکن اس کے باوجود گلی کا معمولی لڑکا بھی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ٹکرا دیتا ہے، لاتعداد اینٹیں بھی اس بے حیثیت لڑکے کے سامنے بے دست و پا ہوتی ہیں، ایسے ہی لوہا اپنی ذات سے کتنا ہی مضبوط سہی، لیکن یہ کسی جگہ الگ سے یونہی پڑا ہوا ہو تو ایک کمزور شخص بھی اسے چرا سکتا ہے، یہی حال لکڑی کا بھی ہے، مگر جب یہی اینٹیں، لوہا اور لکڑی باہم مل جل کر ایک مضبوط عمارت بن جائیں تو اب بڑی سے بڑی جماعت مل کر بھی اسے دھکا دے تو ایک اینٹ بھی نہیں ہل سکتی، ٹھیک یہی حالت امت مسلمہ کی ہے، یہ امت مختلف افراد کے مجموعہ سے بنی ہے، اس حقیقت کو آپ ﷺ نے مثال دیتے ہوئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھلایا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اگر ان میں اتفاق اور جمعیت نہیں، تو پھر اس کے افراد اپنی اپنی جگہ کتنی ہی صلاحیت اور حیثیت کے مالک ہوں، مگر ایک بے حیثیت شخص بھی ان کو آپس میں ٹکرا سکتا ہے، کمزور سے کمزور شخص بھی ان کے ایمان، اعمال اور اخلاق کو برباد کر سکتا ہے، لیکن جب ایک دوسرے سے مل کر حلال امور اور معاملات میں اتفاق کر کے امت مسلمہ ایک وجود بن جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اور حکومت اپنی اکثریت کے باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔

پستی اور ذلت کا سبب اختلافِ باہمی ہے:

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ جب ہمارے ایمان میں قوت اور آپس میں اخوت اور صبر

واستقامت کا وصف تھا تو ہم دنیا پر چھائے ہوئے تھے، کامیابی ہمارے قدم چومتی تھی، ہم اقلیت میں تھے تب بھی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی ہمیں شکست نہ دے سکی، بدر کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے، لیکن جب سے ہم میں اختلاف پیدا ہوا اور ہم نے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا شروع کیا، تو ہماری جمعیت اور قوت ختم ہو کر ہوا اکھڑ گئی، قرآن نے سمجھایا تھا:

﴿وَلَاتَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (الأنفال: ٤١)

کہ اختلاف اور جھگڑا نہ کرنا، ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (تمہارا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا) افسوس! قرآن کی اس ہدایت کو ہم سمجھ نہ سکے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج امت کے ہر طبقہ میں اختلاف اور انتشار کا بول بالا ہونے کی وجہ سے ہمیں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آج جب کوئی قومی و ملی تحریک چلانے کا مسئلہ آتا ہے تو بدقسمتی سے باطل پرستوں سے پہلے ہی آپسی اختلاف اور مسلکی تفریق ہمیں کچل دیتی ہے اور ہماری صلاحیتیں کالعدم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہمیں اپنوں ہی نے لوٹا، غیروں میں کیا دم تھا؟
میری کشتی وہیں ڈوبی جہاں پانی بہت کم تھا

اور اسی پر بس نہیں، مزید ستم یہ ہے کہ ہمارا جو سرمایہ کفر و شرک، الحاد و منکرات اور خرافات و بدعات کے خلاف لگنا چاہیے تھا اب وہ ہمارے آپسی اختلاف کے سبب امت مسلمہ پر لگ رہا ہے، ہم نے اپنی توپ و ٹینک کے دہانے اپنوں ہی پر کھول دیے۔

افسوس! کہ کفار تو مسلمانوں کو ایک ہی گروہ سمجھتے ہیں، مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے علاوہ دوسرے گروہ کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں، الا ماشاء اللہ۔

اب دوستوں نے فریب دیا تو کیا ہوا؟ ☆ یہ حادثے ہم پہ کئی بار ہو گئے
اب کیا گرائے گی ہمیں دنیا نگاہ سے ☆ اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے

عالم گیر دعوت اور عالم گیر پیغام و نظام رکھنے والی امت اس وقت عصبیت و اختلافات میں بٹ گئی، إِنَّا لِلّٰہِ وإِنَّا إلیہ راجعون! ہماری پستی کا بنیادی سبب آپسی اختلاف ہی تو ہے،اس حقیقت کو کاش ہم سمجھ لیں کہ

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

اسبابِ زوالِ امت:

ہمارے بزرگوں نے اسبابِ زوالِ امت کی حقیقت ہمیں سمجھائی؛ تاکہ دیکھ سکیں وہ عروج وزوال، کیا تھا ماضی اور کیا ہے حال؟

چناں چہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ مالٹا کی چار سالہ قید سے رہائی کے بعد تشریف لائے تو ایک رات بعد عشاء دارالعلوم دیوبند میں علماء کے بڑے مجمع میں ارشاد فرمایا کہ ’’ہم نے تو مالٹا کی جیل میں دو سبق سیکھے ہیں‘‘ یہ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ حضرت استاذ العلماء نے اَسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد اس آخری عمر میں دو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ فرمایا کہ ’’میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی و دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک اُن کا قرآن کو چھوڑ دینا، دو: آپس کا اختلاف اور خانہ جنگی،اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً اور معنًی عام کیا جائے،بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں،اور بڑوں کو عوامی درس (قرآن) کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے،اور قرآنی تعلیم پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے،اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

آگے حضرت مفتیِ اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرتؒ نے باقی ایامِ

زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجومِ مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعیِ پیہم فرمائی۔
(البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر/ص:۲۵۰)

آیئے! بے جا اختلاف ختم کر کے حدیث پاک کا مصداق بنیں:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ امت کا عروج ایمان کی قوت، اسلامی سیاست، حسن تدبیر، آپس کی محبت واخوت اور صبر واستقامت میں ہے، اور زوال اختلاف میں ہے، امت کو زوال سے بچانے کے لیے ذاتی طور پر ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ اپنے افکار و خیالات کو قرآن وسنت اور مسلَّمہ اسلامی اصولوں سے متصادم ہونے (ٹکرانے) سے بچائے، اختلاف اگر شرعی حدود میں نیک نیتی کے ساتھ ہو تو وہ مذموم نہیں ہے، لیکن اس صورت میں بھی اختلاف رائے کے باوجود فریق ثانی کے احترام سے ہرگز گریز نہیں کرنا چاہیے، پھر ان شاء اللہ وہ اختلاف بھی رحمت ثابت ہوگا، کیوں کہ نہ مطلقاً اتفاق مستحسن ہے اور نہ مطلقاً اختلاف مذموم ہے، بلکہ مقاصد پر نظر کر کے ان کے حسن و قبح (اچھے برے ہونے) کا فیصلہ کیا جائے گا، نیکی میں اعتدال کے ساتھ اتفاق اچھا اور اختلاف برا ہے، جب کہ بدی میں اس کے برعکس اختلاف اچھا اور اتفاق برا ہے۔قرآنِ کریم نے اصحابِ کہف کے متعلق فرمایا:

﴿ وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ إِذْ قَامُوْا﴾ (الكهف : ١٤)

جب وہ حق کی دعوت لے کر اٹھے تو ہم نے ان کے دلوں میں ربط وتعلق اور وحدت ویگانگت پیدا کر کے انہیں کئی قالب و یک جان بنا کر متحد ومتفق کر دیا، یہ اس لیے کہ انہیں دنیا کی باطل قوت سے ٹکر لینا تھی، جس کے لیے ایمان کی قوت کے ساتھ آپسی اخوت اور حسنِ تدبیر یعنی اسلامی سیاست اور صبر واستقامت بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’احقاقِ حق وابطالِ باطل کے علم برداروں کے لیے قرآن نے یہ واضح معیار پیش کر دیا کہ موقف کی سچائی کے بعد

اہلِ حق کی کامیابی کا جوگُر ہے وہ ان کا باہمی اتحاد ہے، اگر اُن میں اتفاق واتحاد نہیں تو موقف کی سچائی کے باجود کامیابی کی حقیقی منزل سے وہ محروم رہیں گے۔

صاحبو! یقیناً ہم ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں، نہ عزت سے جی سکتے ہیں نہ چین سے مر سکتے ہیں، اس لیے تہیہ وارادہ کیجئے کہ آپس میں بے جا اختلاف کو ختم کر کے بنیانِ مرصوص بن جائیں، اللہ تعالیٰ کی رسی کو حکم قرآنی کے مطابق مضبوطی سے تھام لیں، اور حدیث مذکور میں حضور ﷺ کے اس ارشاد کے مصداق بنیں، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے مضبوط مکان (اوراس کی دیوار) کے مانند ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے سے مل کر تقویت پاتا ہے، اگر معمولی ذرات مل کر بلند پہاڑ بن سکتے ہیں، پانی ایک ایک قطرہ مل کر سمندر بن سکتا ہے، ایک ایک ٹہنی اور شاخ مل کر درخت بن سکتا ہے، جسم کے اعضا مل کر بہترین انسان بن سکتا ہے، تو یقیناً امت کے تمام افراد بھی ایک دوسرے سے مل کر بہترین امت بن سکتی ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے انسان کو
اُخوّت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا

حق تعالیٰ ساری امت کو صراطِ مستقیم پر جمع فرمادے۔ (آمین)

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ .

(۶)

اسلام میں سلام کی اہمیت اور احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :"لَاتَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا، وَلَا تُؤۡمِنُوۡا حَتّٰی تَحَابُّوۡا، أَوَلَا أَدُلُّکُمۡ عَلیٰ شَیۡءٍ إِذَا فَعَلۡتُمُوۡہُ تَحَابَبۡتُمۡ؟ أَفۡشُوۡا السَّلَامَ بَیۡنَکُمۡ." (مسلم،مشکوٰۃ/ص: ۳۹۷/کتاب الآداب/ بابُ السّلام/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک (کامل) ایمان نہ لے آؤ، اور تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم (اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے) آپس میں محبت نہ کرنے لگو، اور کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس کو اختیار کرکے تم باہم محبت کرنے لگو؟ تو وہ یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کو خوب پھیلاؤ۔

سلام سے سلامتی وجود میں آتی ہے:

قرآن وسنت کی رو سے اسلام ایک مذہب ہی نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب اور دین میں فرق یہ ہے کہ مذہب تو اسے کہتے ہیں جو چند عقیدوں، عبادتوں اور اخلاقیات کے مجموعہ پر مشتمل ہو، جب کہ دین ایک مکمل نظامِ حیات، ضابطۂ زندگی اور زندگی کے تمام شعبوں کو شامل ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں بھی اسلام کو مذہب کہا گیا ہے وہ مجازاً ہے، ورنہ حقیقتہً اسلام

ایک مکمل دین ہے، کیوں کہ اسلام زندگی کے ہر ہر شعبہ کے لیے ایک مکمل دستور العمل رکھتا ہے، اس نے انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں بھرپور رہبری کی ہے، گھریلو زندگی سے لے کر خاندانی زندگی تک، اور ملکی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک کونسا ایسا شعبہ ہے جو اسلام کی روشن تعلیمات وہدایات سے مربوط اور وابستہ نہیں ہے؟ زندگی کا ہر شعبہ اور ہر پہلو ہر سمت اور ہر جہت اس کی گراں قدر رہنمائیوں سے لبریز ہے۔

اگر اسلامی تعلیمات وہدایات پر بنظرِ عمیق (گہرائی سے) غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کی تعلیمات وہدایات انسانوں کی سلامتی، خیر خواہی اور بھلائی پر مبنی ہیں، جس کی ایک چھوٹی سی مثال ''سلام'' ہے، جو مسنون ہے، اور اسلامی تہذیب اور معاشرت کا ایک رکن ہے، سلام اسلام میں کوئی رسمی اور رواجی چیز نہیں، بلکہ امن وامان کا ایک عظیم الشان پیغام ہے، اس میں پیار ومحبت کا رس بھرا ہوا ہے، اس سے سلامتی، خیر خواہی اور بھلائی وجود میں آتی ہے، اس لیے آپس کی ملاقات کے وقت پیار ومحبت، خیر خواہی وخیر رسانی کے اظہار کے لیے سلام سے بہتر کوئی کلمہ نہیں ہے، نہ کسی مذہب نے اس سلسلہ میں اتنی بہتر تعلیم دی ہے۔

اسلامی سلام سے بہتر کوئی سلام نہیں:

یوں تو دنیا میں ہر مہذب سمجھی جانے والی قوم کا تقریباً یہ رواج ہے کہ آپسی میل ملاپ اور ملاقات کے وقت موانست ومحبت کا کوئی نہ کوئی جملہ اپنے مخاطب کو مانوس ومسرور کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، مثلاً ہمارے ہندوستان میں برادران وطن ملاقات کے وقت ''نمستے'' یا ''نمسکار'' کہتے ہیں، اس میں کچھ پرانے قسم کے لوگ ''رام رام'' کہا کرتے ہیں، اور تہذیب نو کے علم بردار و دعوے دار صبح کی ملاقات کے وقت کہتے ہیں گڈ مارننگ، یعنی اچھی صبح، شام کی ملاقات کے وقت گڈ اوننگ یعنی اچھی شام، اور رات کی ملاقات کے وقت گڈ نائٹ یعنی شب بخیر، عجیب بات یہ ہے کہ یہ رواج کوئی نیا نہیں، بلکہ زمانۂ جاہلیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل خود عربوں میں بھی اس طرح کے کلمات کہنے کا رواج

تھا، چناں چہ ابوداود شریف میں حدیث ہے: سیدنا عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ ’’زمانۂ جاہلیت میں ہم جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو کہتے: ’’حَيَّاكَ اللّٰهُ‘‘، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں زندہ رکھے، ’’أَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا‘‘، یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے، یا ’’أَنْعِمْ صَبَاحًا‘‘، یعنی تمہاری صبح اچھی اور خوش گوار ہو، پھر جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور ہم دورِ جاہلیت کی تاریکی سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آئے تو ہمیں حضور ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔‘‘ (مشکوٰۃ شریف/ص:۳۹۹)

آپ ﷺ نے اس طرزِ تحیہ کو بدل کر ’’السلام علیکم‘‘ کہنے کا طریقہ جاری فرمایا، اس کے معنیٰ ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور سلامتی ہو، اللہ اکبر کبیرا! اسلامی سلام کس قدر جامع دعا بھی ہے، یعنی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی دعا نہیں، بلکہ حیاتِ طیبہ کی دعا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمام بری چیزوں، بلاؤں، آفتوں، مصیبتوں اور تکلیفوں سے محفوظ اور سلامت رکھے، پھر اسی کے ساتھ سلام کرنے والا سلامتی کی اس دعا کے ضمن میں گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم خود بھی مجھ سے سلامت ہو، میرے ہاتھ اور زبان کی تکلیف سے محفوظ اور مامون ہو، اور میں تمہاری جان مال اور آبرو کا محافظ ہوں، چنانچہ اسی کو ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہؒ سے نقل کیا کہ ’’أَتَدْرِيْ مَا السَّلَامُ؟ يَقُوْلُ: أَنْتَ آمِنٌ مِنِّيْ‘‘ یعنی تم جانتے ہو سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو، اسلامی سلام کا ان حقائق کے پیش نظر دوسری اقوام کے سلام سے موازنہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا اسلام نہیں۔ نیز اس کے بہتر ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے، جیسا کہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

’’اَلسَّلَامُ اِسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ اللّٰهِ، وَضَعَهُ اللّٰهُ فِي الْأَرْضِ.‘‘ (مرقاۃ/ ص:۴۱۲/ ۸)

سلام تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کا وہ پیارا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زمین پر اتارا ہے، لہٰذا اس سے بہتر کوئی سلام کیسے ہوسکتا ہے؟ اسی لیے حدیث میں ہے کہ

ایک دفعہ کسی صحابیؓ نے آپ ﷺ کو سلام کیا، حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ ابتداءِ اسلام کا زمانہ تھا، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام وضو کیے بغیر لینا مکروہ تھا۔ (اصلاحی خطبات ج:۱۱/ص:۱۵۶)

(اور اتفاقاً آپ ﷺ اس وقت وضو سے نہ تھے اور نہ وضو کا موقعہ تھا تو) آپ ﷺ نے پہلے تیمّم کیا، پھر جواب دیا، ارشاد فرمایا: ''مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ بغیر تیمّم (اور طہارت) کے اللہ تعالیٰ کا نام لوں''۔ (سلام کروں) (از: ''اللہ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں''/ص:۳۸)

سلام کی مشروعیت وجامعیت:

سلام کی مشروعیت وجامعیت کے متعلق اس نکتہ پر بھی غور کیجیے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے سلام کی تعلیم وتاکید بالکل ابتدائی زمانے میں فرمائی، جس کا اصل مقصد بھی اپنے مخاطب کو سلامتی وخیر خواہی کا پیغام اور دعا دے کر مانوس اور مطمئن کرنا ہے، اس لیے کہ سلام کی مشروعیت جن حالات میں ہوئی ان میں بقول علامہ محمد نعیم صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند (وقف) اسلام اور مسلمان نہایت کمزور تھے، مخالفین اور دشمنانِ دین ہر وقت ایذا رسانی اور شرارت پر کمر بستہ رہتے تھے، مسلمانوں کو جہاں راستہ میں چاہتے مارتے اور تکلیف دیتے، اس زمانے میں مسلمان ہونا اپنی جان کو ہتھیلی میں رکھنے کے برابر تھا، ان سخت حالات میں یہ ہدایت ملی کہ جب تم باہم ملو تو سلام کرو، تاکہ سننے والا پہلے ہی مرحلہ میں یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جائے کہ میرا مخاطب مسلمان ہے، اور اس طرح اس کی وحشت انسیت ومحبت سے بدل جائے۔

پھر جو کلمہ سلام کے لیے تعلیم وتلقین فرمایا اس کے الفاظ کسی بھی وقت تبدیل نہیں ہوتے، دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام، خوشی ہو یا غم، کوئی بھی وقت ہو، اسلامی سلام کے الفاظ ایک ہی طرح ادا کیے جائیں گے، خواہ سلام کرنے والا چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا فقیر، عامی

ہو یا نامی، شہری ہو یا دیہاتی، عربی بولنے والا ہو یا انگریزی، غرض دنیا بھر کے تمام ہی مسلمان سلام کے لیے ایک ہی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی امت ہے: ﴿إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (المؤمنون : ۵۲) اور ان کے درمیان ایسا دینی رشتہ قائم ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا، بلکہ سلام اس کو اور بھی مضبوط کرتا ہے۔

سلام کی برکت سے محبت و جنت نصیب ہوگی:

ان حقائق سے ثابت ہوا کہ سلام اسلام کے پیغامِ امن کا نہایت ہی دل کش عنوان اور ایک سچے مسلمان کا ترجمان اور اس کی پہچان ہے، اس میں صرف اظہارِ محبت ہی نہیں، ادائے حقِ محبت بھی ہے، اس لیے محبت و الفت کی عمومی ہوا اس سے پھیلے گی، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ صاحبو! اسلامی سلام اگر سمجھ کر سنت کے مطابق کیا اور سنا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس میں انسانوں کی سلامتی، خیر خواہی اور اتفاقِ باہمی کا درس ہے، اس لیے اسے اتنا عام کرنا چاہیے کہ پوری کائنات کی فضا سلام کی خوش گوار ہوا اور لہروں سے معمور ہو جائے، اور انسانی معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن کر دنیا ہی جنت کا نمونہ ہو جائے۔

اسی کی طرف رحمتِ عالم ﷺ نے حدیثِ مذکور میں اپنی امت کو مخصوص انداز میں متوجہ فرمایا: "لَاتَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا"......الخ یعنی تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے یا جنت کا داخلہ اول مرحلہ میں اس وقت تک تمہیں نصیب نہیں ہو سکتا جب تک تم مومن کامل نہ ہو جاؤ، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا یا تمہیں ایمان کی برکتیں اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتیں جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائے؟ وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو۔

مطلب یہ کہ ہر مسلمان کو سلام کرو، خواہ اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو، وہ امیر ہو یا

فقیر ہو، اس حدیث شریف سے صراحۃً معلوم ہو گیا کہ مومن کو سلام کی برکت سے دنیا میں آپسی محبت اور آخرت میں جنت نصیب ہوگی، اسی لیے حضور ﷺ نے بڑے اہتمام سے اس طرف توجہ دلائی، جس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اپنی پہلی تقریر میں جن باتوں کی تاکید فرمائی ان میں سب سے پہلی چیز یہی تھی کہ سلام کو عام کرو، چناں چہ فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ ! أَفْشُوا السَّلَامَ، وأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الأَرْحَامَ، وَ صَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الجَنَّةَ بِسَلَامٍ." (رياض الصالحين/ص:٣٦٦، (ترمذی/ص:٧٥/٢، مشكوٰة/ص:١٦٨)

لوگو! سلام کو پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، رشتہ جوڑو اور رات میں جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تب تم یادِ الٰہی میں کھڑے ہو جاؤ، ان اعمال کی بدولت تم سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور جنت ہمارا اصلی ٹھکانہ اور وطن ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ہر شخص کے تین وطن ہیں: (۱) جسمانی (۲) ایمانی (۳) روحانی۔ وطنِ جسمانی تو وہ جگہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا، اور وطنِ ایمانی ہر مومن کا مدینۃ الرسول ہے، جہاں سے اسے ایمان نصیب ہوا، اور ہمارا وطن روحانی واصلی جنت ہے۔ ان شاء اللہ۔ (مفتی اعظم نمبر/ص:۱۳۵)

الغرض! حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام محبت و امن کا پیغام ہونے کے علاوہ دخولِ دارالسلام کا سبب بھی ہے۔

ایک شعر ہے:

سلام ہے اسلام کا شعار اور امن کا پیغام
سلام سے ہوگا سہل دخولِ دارالسلام

اسلامی سلام واقعات کی روشنی میں:

اسلامی سلام کے متعلق رحمتِ عالم ﷺ کے اس قسم کے ارشادات کا جو اثر حضراتِ صحابہؓ پر ہوا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرتِ ابی بن کعبؓ کے صاحب زادے حضرت طفیل کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہمیں لے کر بازار جاتے اور جس دکان دار اور جس فقیر مسکین کے پاس سے گذرتے اس کو سلام کرتے، اور کچھ خرید وفروخت کے بغیر ہی واپس آجاتے، ایک وقت جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حسبِ معمول مجھے ساتھ لے کر بازار جانے لگے، تو میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! بازار جا کر کیا کریں گے؟ نہ تو آپ کسی دکان پر کھڑے ہوتے ہیں، نہ کسی چیز کا سودا کرتے ہیں، نہ بھاؤ تال کی کوئی بات کرتے ہیں، اور نہ بازار کی کسی مجلس میں بیٹھتے ہیں، اس سے تو بہتر یہ ہے کہ یہیں بیٹھئے، کچھ باتیں کریں گے، ہمیں فائدہ ہوجائے گا'' اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ''بھائی! ہم تو صرف اس غرض اور نیت سے بازار جاتے ہیں کہ جو سامنے آئے اسے سلام کریں، اور ہر ہر سلام پر نیکیاں، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں کما کر اللہ تعالیٰ کے بندوں کے جوابی سلام کے ذریعہ دعائیں حاصل کریں۔'' (مشکوٰۃ/ ص: ۴۰۰ رواه مالك والبيهقي في شعب الإيمان)

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ حضرت معروف کرخیؒ کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ کہیں تشریف لے جارہے تھے، راستے میں ایک سقہ کو دیکھا جو لوگوں کو پانی پلاتا ہوا آواز دے رہا تھا کہ ''اللہ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پئے'' سن کر آپ اس سقہ کے پاس گئے اور اس سے پانی لے کر پی لیا، خدام میں سے کسی نے کہا: ''حضرت! آپ تو روزے سے تھے، پھر پانی کیسے پی لیا؟'' فرمایا: ''بھائی! بات اصل میں یہ ہے کہ پانی پلانے والا یہ دعا دے رہا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پئے'' تو مجھے خیال ہوا کہ معلوم نہیں، اس سقہ کی دعا میرے حق میں قبول ہوجائے، میں نے اس دعا کو حاصل کرنے کے

لیے روزہ جو نفل تھا توڑ دیا، کہ اس کی قضا تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے، دعا بعد میں نہیں مل سکتی"۔
(اصلاحی خطبات/ص:۶/۱۶۹)

مسند احمد میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہٗ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رحمتِ دو عالم ﷺ حضرت سعد بن عبادہؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، اور اپنے معمول کے مطابق اجازت چاہنے کے لیے سلام کیا، حضرت سعدؓ نے جواب دیا، مگر اتنا آہستہ کہ حضور ﷺ نہ سن سکے، آپ ﷺ نے دو بارہ سلام کیا، پھر سہ بارہ سلام کیا، ہر بار حضرت سعدؓ سن کر آہستہ سے جواب دیتے رہے، تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد حضور ﷺ لوٹنے لگے، جب حضرت سعدؓ نے دیکھا تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور عذر پیش کیا کہ "یا رسول اللہ! ہر مرتبہ آپ کی آواز سنی اور سلام کا جواب دیا، مگر آہستہ دیا، تاکہ آپ کی زبانِ مبارک سے سلامتی کی دعا میرے لیے زیادہ سے زیادہ نکلے، جو موجبِ برکت و رحمت ہے۔" علماء نے لکھا ہے کہ حضرت سعدؓ کا یہ عمل تو حضور ﷺ سے محبت اور غلبۂ عشق کی وجہ سے تھا، اسی لیے ذہن اس طرف نہ گیا کہ غریب خانہ پر سرکارِ دو عالم ﷺ تشریف فرما ہیں، لہٰذا فوراً مجھے قدم بوسی کر لینی چاہیے، بلکہ ذہن اس طرف گیا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے "السلام علیکم" جتنی مرتبہ زیادہ سے زیادہ نکلے گا، سلامتی کی یہی دعا میرے لیے صلاح و فلاح اور نجات کا ذریعہ ہوگی۔ پھر رحمتِ عالم ﷺ کی مزاج شناسی کی وجہ سے حضرت سعدؓ کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ میرے اس طرزِ عمل سے ناراض نہیں ہوں گے، چناں چہ ایسا ہی ہوا، حضور ﷺ نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اس نیک جذبہ کی قدر فرمائی، اور حضرت سعدؓ کے گھر تشریف لے جا کر میزبانی قبول فرمائی اور دعا دی: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى اٰلِ سَعْدٍ" "الٰہ العالمین! سعد کے گھر والوں پر اپنی خاص نوازشیں اور رحمتیں نازل فرما۔" (معارف حدیث/ص:۶/۱۶۹)

اور شرح السنۃ کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ نے میزبانی میں خشک انگور پیش کیے، آپ ﷺ نے ان کو تناول فرمایا، جب فارغ ہوئے تو ان کے لیے یہ دعا فرمائی: "أَكَلَ

طَعَامَكُمُ الْأَبْرَارُ، وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَأَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ." کہ تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں، اور فرشتے تمہارے لیے دعا کریں، اور روزے دار تمہارے ہاں افطار کریں۔(مشکوٰۃ:۳۶۹/ باب الضیافۃ)

سلام کے احکام:

الغرض! سلام ایک بہترین عمل و دعا ہے، اور اسلام میں اس کی خاص اہمیت و فضیلت ہے، لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب کہ اس کے احکام و آداب کی رعایت کے ساتھ ہو، اسلام نے جہاں ہر چیز کے احکام و آداب بتلائے وہیں سلام کے بھی احکام بیان فرمائے، مثلاً:

(۱) سلام کرنا سنت ہے، مگر اس کا جواب دینا واجب ہے، البتہ فقہی نقطۂ نظر سے پیشہ ور سائل کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں، کیوں کہ بقول فقیہ النفس علامہ سعید احمد پالنپوری مدظلہ "اس کا سلام سلام نہیں ہے، بلکہ سوال ہے۔" (تحفۃ الالمعی/ ج:۴/ص:۵۸۵)

(۲) سلام اور اس کا جواب خلوصِ نیت کے ساتھ سنت کے مطابق سمجھ کر جمع کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے، اگر چہ مخاطب فردِ واحد ہو، تاکہ فرشتے (کراماً کاتبین) جو ہر ایک کے ساتھ ہیں سلام میں مخاطب کے ساتھ شامل ہو کر ان کو سلام کرنے کا بھی ثواب مل جائے، اور پھر جب وہ سلام کا جواب دیں تو ان کی دعا ہمیں مل جائے۔

(۳) سوار شخص پیدل چلنے والے کو، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں، یہ حکم دراصل تواضع وانکساری کی طرف راغب کرنے کے لیے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذکورہ لوگ سلام نہ کریں تو ہم پہل بھی نہ کریں، بلکہ اس وقت ہم سلام میں پہل کر کے ابتداء بالسلام کی فضیلت کے حقدار بن جائیں۔

حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِيْئٌ مِّنَ

الْکِبْرِ."(مشکوٰۃ/ص : ٤٠٠)

سلام میں پہل کرنے والا (اس عمل کی وجہ سے)تکبر سے پاک ہے۔تکبر کا بہترین علاج یہ بھی ہے کہ ہر ملنے والے مسلمان کوسلام کرنے میں سبقت کرے۔

(۴) آپس میں ملاقات کے وقت بات چیت اور گفتگو سے قبل سلام کریں، اس لیے کہ حدیث شریف میں یہ ہدایت ہے:

عَنْ جَابِرؓ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : "اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْکَلَامِ." (مشکوٰۃ/ص : ۳۹۹)

آج کل ٹیلیفون اور موبائل آمنے سامنے کی ملاقات کا بدل ہے اور ملاقات کا ذریعہ ہے، اس لیے سلام کا جو حکم آپسی ملاقات کا ہے وہی فون کرتے اور اٹھاتے وقت کا ہوگا، لہٰذا ''ہیلو'' کے بجائے ''السلام علیکم'' کہنا مسنون ہوگا، اور جہاں تک انجانے میں غیر مسلم کوفون پر سلام کرنے کی بات ہے تو بقول مفتی شبیر احمد قاسمی مرادآبادی مدظلہٗ اس میں کوئی گناہ نہیں، اور نہ یہ خلافِ احتیاط ہے، بلکہ اس میں بھی ہمیں سلام کرنے کا ثواب مل جائے گا، البتہ پہلے سے معلوم ہو کہ غیر مسلم کا فون ہے، یا خود آپ فون کر رہے ہیں، تو سلام سے ابتدا نہ کریں۔

(از: ''انوارِ نبوت'' /ص:۳۱۶)

(۵) بعض مواقع اور حالتیں سلام سے مستثنیٰ ہیں، اس سلسلہ میں فقہاءِ کرام کی تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ تین صورتوں اور حالتوں میں سلام کرنا منع ہے:

(۱) جب کوئی طاعت میں مشغول ہو، مثلاً نماز، ذکر، دعا، تلاوت، اذان و اقامت، خطبہ یا کسی دینی مجلس کے وقت۔

(۲) جب کوئی بشری حاجت میں مشغول ہو، مثلاً کھانے پینے، سونے اور پیشاب پاخانہ وغیرہ کے وقت۔

(۳) جب کوئی معصیت میں مشغول ہو، تو اس موقع پر بھی سلام کی ممانعت ہے۔سلام کے یہ اجمالی احکام ہیں۔

سلام کی فضیلت:

بہرکیف! حقیقت یہ ہے کہ سلام کے آداب واحکام کی رعایت کرتے ہوئے اسے عام کیا جائے تو یہ خیر، رحمت، برکت اور آپسی محبت کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ ہونے کے ساتھ اسبابِ مغفرت میں سے بھی ہے، کاش! ہم اس پاکیزہ کلمۂ سلام کو عام لوگوں کی طرح رسمی طور پر ادا نہ کریں، بلکہ حقیقت کے ساتھ سنت اور خلوصِ نیت سے ادا کریں تو یہی سلام اتحادِ ملت کے لیے جہاں معین ہوسکتا ہے وہیں مغفرت کا سبب بھی ہوسکتا ہے۔

حدیث میں ہے:

إِنَّماَ مُوجِبَاتُ الْمَغْفِرَةِ بَذْلُ السَّلَامِ وَ حُسْنُ الْكَلَامِ." (كنز العمال: ۱۱۶/ ۹، ازگلدستۂ مغفرت/ص:۲۳۶)

مغفرت واجب کرنے والے اعمال میں سلام کو پھیلانا اور کلام کو نرمی وخوبی سے پیش کرنا بھی داخل ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ:

" مَنْ سَلَّمَ عَلىٰ عِشْرِيْنَ رَجُلاً مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ يَوْمٍ جَمَاعَةً أَوْ فُرَادىٰ، ثُمَّ مَاتَ مِنْ يَوْمِهِ ذَالِكَ، وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، وَفِيْ لَيْلَةٍ مِّثْلُ ذَالِكَ." (رواه الطبرانی، مجمع الزوائد/ص: ۸/۳۰۰،از فیضانِ حلیم)

ترجمہ: جو شخص اپنے مسلمان بھائیوں میں سے بیس لوگوں کو خواہ وہ مجمع میں ہوں یا فرداً فرداً ہوں، کسی دن یا رات میں سلام کرے، پھر اس دن یا رات میں اس کا انتقال ہوجائے تو اس کے لیے جنت واجب ہے۔

غور کیجیے! اسلام میں سلام کی کس قدر عظمت وفضیلت ہے۔حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرمائے۔آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ .

(۷)

تقویٰ دارین کی نعمتوں کا سرچشمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ : سُئِلَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: "أَيُّ النَّاسِ أَکۡرَمُ؟" قَالَ: أَکۡرَمُھُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ أَتۡقَاھُمۡ." (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص:٤١٧)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "یارسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم کون ہے؟" فرمایا: "جو ان میں سب سے زیادہ متقی ہو۔"

عَنۡ أَبِیۡ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لَہٗ: "إِنَّكَ لَسۡتَ بِخَیۡرٍ مِنۡ أَحۡمَرَ وَلَا أَسۡوَدَ إِلَّا أَنۡ تَفۡضُلَہٗ بِتَقۡوٰی." (رواہ أحمد، مشکوٰۃ/ص: ٤٤٣/کتاب الرقائق/ الفصل الثالث)

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ان سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تو کسی گورے یا کالے سے بہتر نہیں، البتہ تیری فضیلت تقویٰ کی وجہ سے ہے۔"

تقویٰ کے معنیٰ :

حق تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو مشرف اور مکرم بنایا، لیکن اسی کے ساتھ اس کی فطرت میں نیکی و بدی، بھلائی و برائی، تابعداری اور سرکشی اور خوبی و خامی دونوں ہی قسم

کی صلاحیتیں یکساں رکھ دی ہیں:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (الشمس:۸)

پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری کی ہے۔

یہ اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ کسی بھی انسان سے نیکی اور بدی دونوں ہی وجود میں آتی ہیں اور آسکتی ہیں، ایک انسان سے حسنات بھی ممکن ہیں اور سیئات بھی، اس کے باوجود اگر کوئی شخص سیئات ومعصیات، بدی وبدکاری، بداخلاقی وسرکشی کے تقاضوں کو دباکر اپنی زندگی اور اس کے قیمتی لمحات کو حسنات وطاعات، نیکی وبھلائی اور تابعداری اور فرمانبرداری سے مزین اور آراستہ کر لے تو یہ اس کے کامیاب اور خالق ومخلوق کے نزدیک اشرف واکرم ہونے کی سب سے بڑی نشانی ہے، اور یہی تقویٰ وپرہیزگاری ہے۔ فرمایا:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (الشمس : ۹)

شاید اسی وجہ سے اس جگہ فجور کو تقویٰ پر مقدم کیا گیا (واللہ اعلم) کہ انسان میں فجور وگناہ کا مادہ نہ ہوتا تو تقویٰ کا وجود بھی نہ ہوتا، اسی لیے فرشتے معصوم تو ہیں، متقی نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں گناہ کی صلاحیت ہی نہیں، اور تقویٰ کہتے ہیں: " كَفُّ النَّفْسِ عَنِ الْهَوٰى" نفس کو برائیوں سے روکنا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (النازعات: ٤٠)

اور جو شخص نفس کو غلط خواہش سے روکے وہ ہے متقی۔ اس لیے کہ نفس کی غذا گناہ ہے تو روح کی غذا تقویٰ، اور نفس کو گناہ سے روکنے ہی کا نام تقویٰ ہے، لہٰذا اب جو بھی بندہ تقویٰ حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ فجور وگناہ کے تقاضے پر عمل نہ کرے، تو وہ خود بخود متقی بن جائے گا۔ پھر جس کی زندگی میں جتنا زیادہ تقویٰ ہوگا وہ اتنا ہی اکرم وافضل ہوگا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات : ۱۳)

درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

تقویٰ کی اہمیت:

حدیثِ مذکور سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے،اس بنا پر ایمان کے بعد انسانی زندگی میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی بہت زیادہ اہمیت ہے،اسی لیے قرآن وحدیث میں جا بجا ''تقویٰ'' کا ذکر آیا ہے، کہیں اس کی افادیت کا بیان ہے تو کہیں اس کی ضرورت کا اعلان ہے،ایک جگہ اس کو اپنانے کی تعلیم ہے تو دوسری جگہ اسے برتنے کی تلقین،غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مختلف پیرایوں میں،مختلف مقامات پر تقویٰ کی ترغیب دی ہے،جس کی بنیادی وجہ ایک یہ ہے کہ مقصدِ زندگی تو اللہ کی بندگی ہے،قرآنِ کریم کہتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات: ۵٦)

اور میں نے جنات وانسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

لیکن مقصدِ بندگی خود قرآن کے اعلان وحکم کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة : ۲۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں،تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

پس ثابت ہوا کہ تمام عبادات واعمال کی اصل جڑ تقویٰ ہے،حتیٰ کہ ایک حدیث

میں تو یہاں تک ارشاد ہے کہ اگر تم نماز پڑھتے پڑھتے کمانوں کی طرح ٹیڑھے ہو جاؤ، اور روزہ رکھتے رکھتے سوکھ کر کانٹا ہو جاؤ، پھر بھی نفع تو تقویٰ ہی سے ہوگا۔

(تنبیہ الغافلین مترجم/ص:٤٦٩)

مشکوٰۃ میں ترمذی کی روایت منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کی عبادت و محنت کا تذکرہ ہوا، اور دوسرے کے تقویٰ کا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَاتَعْدِلُ بِالرِّعَةِ، يَعْنِىْ اَلْوَرَعَ." (رواه الترمذی، مشکوٰة: ٤٤١/ کتاب الرقائق)

تقوے کے برابر کوئی عبادت وعمل نہیں۔

خود قرآنِ کریم میں بھی ارشاد ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّمَنِ اتَّقٰى ﴾ (البقرة / ١٨٩)

بلکہ اصل نیکی کی راہ یہ ہے کہ بندہ تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

تقویٰ کی حقیقت:

اب رہا یہ سوال کہ یہ کہ تقویٰ ہے کیا چیز؟ تو یاد رکھو! مختصر لفظوں میں تقویٰ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس کی عظمت کی وجہ سے پیدا ہو جائے، اور اس کے مواخذہ کی فکر پیدا ہو جائے، جس کے اثر سے زندگی میں تیقظ یعنی دینی بیداری پیدا ہو جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہر چیز سے آدمی بچ سکے۔ ویسے تقویٰ کی تعریفات و توجیہات میں علماءِ امت نے مختلف تعبیرات استعمال فرمائی ہیں، اور کتاب وسنت سے مختلف انداز میں اس کی وضاحت کی ہے، مگر ان میں حضراتِ محققین نے جسے سب سے زیادہ راجح اور پسندیدہ قرار دیا ہے وہ ہے حضرت ابی ابن کعبؓ کی تعریف و تحقیق، جب آپؓ سے سیدنا فاروق اعظمؓ نے تقویٰ کی حقیقت معلوم کی، تو آپؓ نے آسان اور بہترین مثال سے تقویٰ کی حقیقت سمجھائی، فرمایا: "اے امیر المومنین! کیا کبھی کسی خاردار راستہ سے آپ کا گذر ہوا ہے؟" فرمایا: "جی ہاں! متعدد بار گذرا ہوں"، "اچھا! تو اس وقت آپ نے کیا طرزِ

عمل اختیار کیا تھا ؟'' حضرت ابی ابن کعبؓ نے سوال کیا، جواباً حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''اس موقع پر خود کو اور اپنے کپڑوں کو نہایت سمیٹ کر بڑی احتیاط سے چلا ہوں کہ کہیں دامن کانٹوں سے الجھ نہ جائے'' تب حضرت ابی ابن کعبؓ نے عرض کیا: ''حضرت ! یہی تو تقویٰ ہے!'' (ابن کثیر/ ج:۱/ص:۲۸)

یہ دنیا ایک خاردار وادی ہے، اس خارستان میں ہر طرف گناہوں کے کانٹے موجود ہیں، اس لیے دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرنا کہ ہمارا ایمانی دامن گناہوں کے کانٹوں سے الجھنے نہ پائے اسی کا نام تقویٰ ہے، اور جو اس صفت سے متصف ہو جائے وہ متقی ہے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰه عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ، و حُجِبَتِ الْجنَّةُ بِالْمَكَارِهِ. " (متفق علیه، مشکوٰة/ص:۴۳۹)

اور مسلم شریف کی روایت میں "حُجِبَتُ" کی جگہ "حُفَّتُ" ہے، تو دونوں ہی ہم معنی ہیں۔

اس کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

حُفَّتِ الْجنةُ بمکروهاتِنَا
حفت النیرانُ مِن شَهَوَاتِنَا

یعنی جنت کو مشکلات اور حرام خواہشات کی باڑ اور پردے کے ساتھ گھیر لیا گیا ہے، اور دوزخ کو شبہات وخواہشات کی باڑ سے، اب جو شہوات وخواہشات کی باڑ اور پردے سے بچ کر نکل گیا وہ ہے متقی، اور جو شہوات وخواہشات میں الجھ گیا وہ پھنس گیا۔

تقویٰ آسان ہے:

عام طور پر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تقویٰ محال ہے اور متقی ہونا مشکل ہے، یہ سب

کے بس کی بات نہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرنا بہت آسان کام ہے، اور متقی بننا ایک اختیاری عمل ہے، ورنہ تو حق تعالیٰ اتنی کثرت سے اس کا حکم ہی کیوں دیتے؟ جب کہ اہل ایمان کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ ربِ کریم نے انسانوں کو کوئی ایسا حکم ہرگز نہیں دیا جو ان کی طاقت اور استطاعت سے باہر ہو، اب جب تقویٰ کا بار بار حکم دیا، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

یعنی جتنا تقویٰ اختیار کر سکتے ہو کرو! تو اس کا صاف مطلب یہ نکلا کہ تقویٰ آسان اور اختیاری عمل ہے، کوئی دشوار نہیں ہے، بس ذرا سا پختہ عزم کر کے ہمت سے کام لیں، گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں تو قسم بخدا! تقویٰ اختیار کرنا آسان ہے، اور ہر مسلمان کم از کم درجہ کا متقی تو ضرور ہی بن سکتا ہے۔

دوگام چل کے کوئی اس راہ پر بھی دیکھے ☆ کتنی حسین ہیں راہیں، کتنا حسین ہے منظر

تقویٰ کے تین درجات:

آج کل ہمارے ذہنوں میں متقی کا ایک خاص مفہوم بیٹھ گیا ہے، جب ہم لفظ متقی سنتے ہیں تو وہی مفہوم ذہن میں آتا ہے، یعنی دودھ کا دھلا ہوا، اعلیٰ درجہ کا پرہیزگار، حالاں کہ بات یہ ہے کہ ہر سچا پکا مسلمان جو منافق نہیں وہ متقی ہے، کیوں کہ علماءِ امت کی تصریح کے مطابق تقویٰ کے تین درجات ہیں: ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ۔

تقویٰ کا پہلا درجہ: تو یہ ہے کہ بندہ کفر اور شرک سے بچ جائے، یہ سب سے کم اور ادنیٰ درجہ ہے، جو الحمد للہ! ہر مسلمان کو حاصل ہے، اور اگر زیادہ نہیں تو بندہ کم از کم اتنا کر لے کہ کفر و شرک سے بچے، تب بھی وہ آخرت کے دائمی عذاب سے محفوظ رہے گا، اسی لیے تقویٰ کا یہ درجہ فرض و لازم قرار دیا گیا، ارشاد ہے:

﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ (الفتح: ٢٦)

آیت کریمہ میں تقویٰ سے یہی مراد ہے۔(مدنی مظاہر حق جدید/ ج:۳/ص:۶۰)

حدیث قدسی میں ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿هُوَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾ (المدثر : ٥٦)

یعنی وہ اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی معافی اور مغفرت کے اختیارات بھی رکھتا ہے۔حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"أَنَا أَهْلُ أَنْ أُتَّقىٰ، فَمَنِ اتَّقَانِىْ، فَلَمْ يَجْعَلْ مَعِيَ إِلٰهًا، فَأَنَا أَهْلُ أَنْ أَغْفِرَلَهٗ." (ترمذی:۲/ص:۱۷۰، مشکوٰۃ/ص:۲۰۵/ حدیث قدسی نمبر:۱)

میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہوں، اور جس نے تقویٰ اختیار کیا، یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، تو میری شان (رحمت کا تقاضا) یہی ہے کہ میں اس کی مغفرت کردوں۔

حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ "متقی وہ قوم ہے جو شرک اور بت پرستی سے بچتی ہے، اور خالص اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرتی ہے۔" (درسِ محمد احمد، از گلدستۂ تفاسیر/ص:۱/۴۹)

تقویٰ کا دوسرا درجہ: یہ ہے کہ ایک انسان جیسے کفر و شرک سے بچتا ہے، تمام صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے بھی بچ جائے، یہ درمیانی درجہ کا تقویٰ ہے، جو ہر مسلمان پر واجب ہے، اور محاورہ میں اسی کا نام تقویٰ ہے، ارشادِ باری:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرىٰ آمَنُوْا واتَّقَوْا﴾ (الأعراف : ٩٦)

میں تقویٰ کا یہی معنی مراد ہے۔(مدنی مظاہر حق جدید/ ج:۳/ص:۶۰) اب جو شخص جتنا زیادہ گناہوں سے بچے گا اور بچنا چاہے گا وہ اتنا ہی زیادہ متقی ہوگا، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض بجالائے"۔

(گلدستۂ تفاسیر/ص:۸/۴۸)

امام محمدؒ سے کسی نے فرمائش کی کہ آپ تقویٰ پر ایک کتاب لکھیں، تو انہوں نے

فرمایا: ’’صَنَّفْتُ كِتَابَ الْبُيُوْعِ‘‘ میں نے خرید وفروخت اور دوسرے معاملات پر ایک کتاب لکھ دی ہے، مقصد یہ تھا کہ معاملات میں شریعت (کے احکامات) کی پابندی اور محرمات سے بچنا تقویٰ پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ (عبادت وخدمت/ص:۲۳)

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا پیارہ بننا اور گناہوں سے بچنا چاہتا ہے ربِ کریم اسے ضرور بالضرور اپنا پیارا بناتا اور گناہوں سے بچاتا ہے، چناں چہ آیت قرآنی و ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے۔ اس کی تفسیر بعض علماء نے یہی بیان فرمائی ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک عبرت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں علامہ عبدالرحمٰن صفویؒ نے اپنی کتاب ’’نزہۃ المجالس‘‘ میں اور ابن کثیرؒ نے تفسیر ابن کثیر میں ایک عبرت آموز واقعہ بیان فرمایا ہے کہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں ایک شخص نوجوان، عبادت گزار اور پرہیزگار تھا، ایک عورت اس پر فریفتہ تھی، وہ اس کو مسلسل اپنی طرف مائل کرتی رہتی تھی، حتیٰ کہ وہ نوجوان ایک دن اس کے گھر آ ہی گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان! اسی وقت اسے یاد آیا قرآن! جس میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا﴾ (الأعراف: ۲۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ ’’جو لوگ متقی ہیں، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خطرہ (گناہ کا) لاحق ہوجاتا ہے، تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاتے ہیں۔‘‘ یکایک اس کی حقیقی ایمانی آنکھ کھلی، خوابِ غفلت سے بیدار ہوگیا اور ارادۂ معصیت ترک کردیا، اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت کا اس قدر غلبہ اس پر ہوا کہ وہ بے ہوش ہوگیا، جب ہوش میں آیا تو پھر یہی آیت بار بار پڑھنے لگا، حتیٰ کہ پڑھتے پڑھتے جان بحق ہوگیا، إِنَّا لِلّٰهِ

وَإِنَّـــا إِلَيْــهِ رَاجِـعُـوْنَ...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور دعاءِ مغفرت کے بعد اس کی قبر سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے نوجوان!

﴿وَلِمَن خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ (الرحمٰن : ٤٦)

جو اللہ سے ڈر گیا اس کے لیے اللہ کی طرف سے دو جنتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کو سن کر قبر کے اندر سے آواز آئی:

اے عمر! اللہ تعالیٰ نے مجھے دونوں جنتیں بخشی ہیں۔ سبحان اللہ! سچ ہی کہا ہے:

ہر کہ دارد خوفِ حق در دل دوام

جنت الماویٰ دہد او را مقام

ظاہر ہے کہ یہ مقام خوفِ الٰہی اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے، وہ جس کی زندگی میں ہے حق تعالیٰ اس کی دنیا بھی جنت کدہ بنا دیتے ہیں، اس لیے بعض مفسرین فرماتے ہیں:

﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ (الرحمٰن : ٤٦)

میں ایک تو آخرت کی جنت مراد ہے، اور دوسری دنیا کی۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ متقیوں کے لیے دنیا میں بھی جنت کا لطف ہے، آیت قرآنیہ میں شاید اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَوْ أَنَّ أَهْـلَ الْـقُـرٰى آمَـنُـوْا وَاتَّـقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ﴾ (الأعراف : ٩٦)

اگر یہ بستی والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ برکتیں تقویٰ سے حاصل ہوتی ہیں، اور سب سے بڑا تقویٰ یہی ہے کہ بندہ ہر قسم کے معاصی اور محرمات سے بچ جائے، جسے یہ درجہ حاصل ہو جائے وہ متقی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، قرآن کہتا ہے: ﴿إِنْ أَوْلِيَـــاؤُهٗ إِلَّا الْـمُـتَّـقُوْنَ﴾ یعنی متقی ہی

دراصل اللہ کے ولی ہیں۔ (الأنفال : ۳٤)

نیز فرمایا:

﴿ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَـاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾ (يونس: ٦٢-٦٣)

یاد رکھو! جو اللہ کے دوست اور ولی ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے، ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔ اور تقویٰ کہتے ہیں ترکِ معاصی کو، جیسا کہ عرض کیا گیا۔

تقویٰ کا تیسرا اور سب سے اعلیٰ درجہ :

لیکن تقویٰ کا تیسرا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک انسان اپنے اللہ اور انجام کے خوف سے جملہ معاصی اور محرمات سے تو بچتا ہی ہو، اسی کے ساتھ مکروہات اور مشتبہات سے بھی بچ جائے، اور اپنے باطن کو غیر اللہ میں مشغول نہ کرے۔ یہی حق تقویٰ اور حقیقی تقویٰ ہے، اور جس کا حکم رب العالمین نے اس طرح فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ (آل عمران : ١٠٢)

اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے۔ آیت کریمہ میں تقویٰ اسی معنی میں ہے۔ (مدنی مظاہر حق جدید/ ج:۳/ص:۶۱)

اور حدیث میں ہے کہ بندہ اس وقت تک حقیقی متقی نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان چیزوں کو ترک نہ کردے جن میں حرج نہیں، اس خوف سے کہ کہیں حرج میں نہ پڑ جائے۔

(ترمذی، از: گلدستۂ تفاسیر/ص:۴۸)

سلفِ صالحین اور ان میں بھی خصوصاً متقدمین کا تقویٰ یہی تھا، اس سلسلہ میں متقدمین کے تو بڑے ہی عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں، چناں چہ امامنا

العلام حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؒ نے تجارت میں اپنے ایک شریک (حضرت حفص بن عبدالرحمٰن) کے پاس کچھ کپڑا بھیجا، کپڑے کا ایک تھان ذرا سا عیب دار تھا، تو حضرتؒ نے بتایا کہ ''خریدار کو اس سے ضرور آگاہ کر دینا'' اتفاق سے وہ خریدار کو بتلانا بھول گئے (اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ عیب دار تھان کس کے ہاتھ فروخت کیا) امام صاحبؒ کو جب معلوم ہوا تو بہت افسوس کا اظہار فرمایا، پھر اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ سارے تھانوں سے حاصل ہونے والی قیمت صدقہ کر دی، جس کی رقم تیس ہزار درہم تھی، تاکہ مشتبہ مال سے مکمل اجتناب ہو۔ (الخیرات الحسان فی مناقب أبی حنیفة النعمان/ص: ۴۳، از: ''کتابوں کی درسگاہ میں'' /ص:۵۲)

یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے، جو فرض تو نہیں، البتہ افضل ضرور ہے، خلاصہ یہ ہے کہ کفر وشرک سے بچنا ادنیٰ درجہ کا تقویٰ ہے، فسق وفجور سے بچنا اوسط درجہ کا تقویٰ ہے، اور غیر اللہ سے بچنا، اسی طرح ہر اس چیز سے بھی بچنا جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں رکاوٹ پیدا ہو، جیسے شکوک وشبہات، تو یہ اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہے۔

تقویٰ کے انعامات:

اب جو جس اعتبار سے تقویٰ اختیار کرے گا اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں جہاں میں نوازا جائے گا اور انعامات کا مستحق ہوگا، چناں چہ قرآنِ کریم نے تقویٰ کے عظیم الشان انعامات بیان فرمائے ہیں، مثلاً سورۂ طلاق میں تین انعامات کا ذکر ہے۔

پہلا انعام: مصائب سے نجات وحفاظت:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ (الطلاق : ۲)

''جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا اس کے لیے ہر قسم کی مشکلات ومصائب (بلکہ معاصی) سے نجات وخلاصی کا راستہ نکالا جائے گا''۔ یہ کتنا بڑا انعام ہے، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، علاوہ ازیں مزید انعامات کو بیان کرتے ہوئے دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئٰاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الأنفال:۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کروگے، اللہ سے ڈروگے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے گا، اور تم سے تمہارے گناہوں کو دور کردے گا، اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

یہاں تقویٰ پر فرقان کا وعدہ فرمایا، اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ''فرقان'' کے متعلق ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد فیصلہ کن فراست وبصیرت ہے، جس کے ذریعہ حق وباطل، طاعت ومعصیت میں امتیاز وفرق کرنا آسان ہوجائے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نصرت وحفاظت ہے، اور یہی اکثر کا قول ہے، اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں مخالفین اور حاسدین کے شر سے حفاظت کا بہترین ذریعہ تقویٰ کو فرمایا، ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (آل عمران: ۱۲۰)

اور اگر تم صبر وتقویٰ سے کام لوگے تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔

کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ہر کہ ترسید از حق وتقویٰ گزید ترسد از وے جن وانس وہر کہ دید

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے، تو جن وانس اور جو بھی اسے دیکھے وہ اس سے ڈرتا ہے۔

علاوہ ازیں ان کی زندگی میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی عظمت وہیبت عام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوجاتی ہے، فرقان کے مفہوم میں یہ سب داخل ہے۔ پھر فرقان جیسے عظیم الشان انعام کے ساتھ ساتھ آیتِ مبارکہ میں دو وعدے اور بھی فرمائے:

(۱) دنیا میں کفارۂ سیئات: ﴿ وَيُكَفِّرُ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ ﴾

(۲) اور دوسرا آخرت میں معافی ومغفرت: ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ ثابت ہوا کہ تقویٰ سے مصائبِ دنیا کی طرح مصائبِ عقبٰی سے بھی حفاظت ہوگی، جیسا کہ خود ارشادِ ربانی ہے:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا﴾ (مریم:۷۲)

پھر ہم متقین کو (ہر قسم کے مصائب سے) نجات دیں گے۔

﴿ وَمَنْ يَّتَقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾

نیز حدیث میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِنِّيْ لَأَعْلَمُ آيَةً لَوْ أَخَذَ النَّاسُ بِهَا لَكَفَتْهُمْ: ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجَا﴾ (رواه أحمد، مشكوٰة/ص:٤٥٣)

میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل کرلیں تو دین، دنیا کے لیے وہی آیت کافی ہو، اور وہ آیت یہی سورۂ طلاق کی ہے ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ ......الخ ﴾ کہ جو بھی تقویٰ اختیار کرے گا اس کے لیے ہر قسم کی مصائب سے نجات کا راستہ نکالا جائے گا۔

رزق کی وسعت:

دوسرا انعام: نقد یہ ملے گا کہ:

﴿وَيَرْزُقْهُ مِن حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق:٤)

ہم اسے وسعت والا رزق ایسی جگہ سے دیں گے جہاں کا گمان بھی نہ ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اسی لیے فرماتے تھے:

عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ إِنْ كُنْتَ عَاقِلًا
يَأْتِيْكَ بِالْأَرْزَاقِ مِنْ حَيْثُ لَاتَدْرِيْ

ضروری ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو اگر تم عقلمند ہو، وہ (اللہ) تمہیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جس کی تمہیں خبر بھی نہیں۔

صاحبو! گویا تقویٰ اختیار کرنا اللہ تعالیٰ سے تجارت اور سودا کرنا ہے، اور اللہ کی قسم! اس میں کبھی خسارہ نہیں ہوسکتا۔

ہر طرح کی آسانی اور سہولت:

علاوہ ازیں تقویٰ کا تیسرا انعام یہ بیان کیا گیا کہ اس کی برکت سے تمہیں ہر طرح کی آسانی اور سہولت نصیب ہوگی، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ أَمْرِهٖ يُسْرًا﴾ (الطلاق: ٤)

جو بندہ تقویٰ اختیار کرے گا حق تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی اور سہولت پیدا فرمائیں گے۔ اب اس وعدۂ الٰہی کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کے باوجود جب کبھی پریشانی آئے تو سمجھ لو کہ تقویٰ میں ضرور کمی آئی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، دنیا اور عقبیٰ کی ساری سعادتیں تقویٰ کے ساتھ وابستہ ہیں، تقویٰ دارین کی نعمتوں کا سرچشمہ ہے، اسی لیے غالبًا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اکثر و بیشتر یہ اشعار پڑھتے تھے:

يُرِيْدُ الْمَرْءُ أَنْ يُّعْطٰى مُنَاهٗ ☆ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا مَا يُرَادُ

يَقُوْلُ الْمَرْءُ: فَائِدَتِيْ وَ ذُخْرِيْ ☆ وَتَقْوَى اللّٰهِ أَفْضَلُ مَا يُسْتَفَادُ

اس کے برخلاف اگر گناہ کی حالت ہے تو قرآن پاک ہر جگہ بار بار یہی بتا رہا ہے کہ جو قومیں ایمان اور تقویٰ سے محروم اور عاری ہیں وہ دارین کی کامیابی اور عیشِ ابدی سے تو خیر محروم ہی ہیں، دنیا میں بھی ان کا تنعم محض ظاہری اور سطحی ہوتا ہے، اندر سے بالکل کھوکھلا۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے تقویٰ کا اعلیٰ درجہ عطا فرمائیں۔

﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا﴾ آمین.

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۸)

فضائل رمضان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ :"إِذاَ دَخلَ رَمَضَانُ فُتِحَتُ أَبۡوَابُ السَّمآءِ، وَفِیۡ رِوَايَةٍ: "فُتِحَتُ أَبۡوَابُ الۡجَنَّةِ" وَ غُلِّقَتُ أَبۡوَابُ جَهَنَّمَ، وَسُلۡسِلَتِ الشَّيَاطِيۡنُ، وَفِیۡ رِوَايَةٍ:" فُتِحَتُ أَبۡوَابُ الرَّحۡمَةِ." (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ۱۷۳/ كتاب الصوم/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں، اور ایک روایت میں بجائے ابواب جنت کے ابواب رحمت کھول دیے جانے کا ذکر ہے۔

رمضان اور اس کے معانی واسرار:

رمضان سال بھر کے اسلامی مہینوں میں سب سے زیادہ عظمتوں، فضیلتوں، برکتوں اور رحمتوں والے مہینہ کا مشہور نام ہے، جو گویا ایمان واعمال ریچارج کرنے کے لیے ہے، یہ لفظ عربی مصدر ''رمـــــض'' سے بنا ہے، جس کے لغوی معنی جلانے اور شدت حرارت کے

ہیں، اس مہینے کو رمضان اس مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس ماہ میں رب العالمین اپنی خاص رحمت سے ایمان والوں کے گناہوں کو بخش دیتے ہیں، چناں چہ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِیْمَاناً وَّاحْتِسَاباً، غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ." (مشکوٰۃ/ص: ۱۷۳)

جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان، اخلاص اور حصولِ ثواب کی نیت سے، اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ تو رمضان چوں کہ تمام صغیرہ گناہوں کو جلا دیتا اور معاف کرادیتا ہے، اس لیے یہ اس نام سے موسوم ہوا:

"إِنَّمَا سُمِّيَ رَمَضَانُ لِأَنَّهٗ یَرْمَضُ الذُّنُوْبَ." (غنیة الطالبین، جامع صغیر، سیوطی، از: برکاتِ رمضان/ص: ۱٦)

امامِ ربانی محبوبِ سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ رمضان کے روحانی اسرار بیان کرتے ہوئے عجیب بات ارشاد فرمائی:

"رَمَضَانُ" خَمْسَةُ أَحْرُفٍ، اَلرَّاءُ رِضْوَانُ اللّٰهِ، وَ اَلمِیْمُ مَحَبَّةُ اللّٰهِ، وَالضَّادُ ضَمَانُ اللّٰهِ، وَ الْأَلِفُ أُلْفَةُ اللّٰهِ، وَ النُّوْنُ نُوْرُ اللّٰهِ." (غنیة الطالبین ص: ۹، از: راہِ عافیت/ص: ۳۳/ ستمبر/۷)

"رمضان" پانچ حرفوں سے مل کر بنا ہے، جس میں سے پہلا حرف:

(راء) اس سے مراد رضوان اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

(میم) سے مراد اللہ تعالیٰ کی محبت وعطا ہے۔

(ضاد) سے مراد اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے۔

(الف) سے مراد اللہ تعالیٰ کی الفت ہے۔

(نون) سے مراد اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔

معلوم ہوا کہ رمضان رضائے الٰہی، عطاءِ الٰہی، ضمانتِ الٰہی، اُلفتِ الٰہی اور نورِ الٰہی

کا مہینہ ہے۔شاید اس کی ان ہی عظمتوں کی وجہ سے رمضان کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) اور سید الشہور (مہینوں کا سردار) کہا گیا ہے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ راء سے مقربین کے لیے رضائے الٰہی اور میم سے گنہگاروں کے لیے مغفرتِ خداوندی اور ضاد سے مطیعین کے لیے ضمانت باری اور الف سے متوکلین کے لیے الفت الٰہی اور نون سے صادقین کے لیے نوالِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔واللّٰہ أعلم وعلمه أحکم وأتم. (نزهة المجالس مترجم/ ۱/۳۳۰)

رمضان کی حیثیت:

مزید اس کی عظمت کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جو حیثیت اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسانوں کی ہے، اور انسانوں میں پیغمبروں کی ہے، اور پیغمبروں میں سید الانبیاء ﷺ کی ہے وہ حیثیت مہینوں میں رمضان کی ہے، رمضان سید الشہور رہے، اور جیسے میدانِ محشر میں سید الانبیاء ﷺ گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے ایسے ہی سید الشہور رمضان بھی روزہ داروں کی شفاعت کرے گا۔

حدیث میں ہے:

”عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْروٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ”اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ.“ (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة، ص:۱۷۳/ الفصل الثالث)

رمضان اور قرآن قیامت میں دن کے صائم اور رات کے قائم کے لیے شفاعت کریں گے، اور ان کی شفاعت بھی قبول کی جائے گی، علماء نے فرمایا: اس کا اثر یہ ہوگا کہ روزۂ رمضان کی شفاعت سے تو روزہ دار بندے کے گناہ معاف ہوں گے، اور قرآن کی شفاعت کی برکت سے اس کے جنت میں مرتبے بلند ہوں گے۔ یا جو حیثیت سارے شہروں میں حرمِ پاک کی ہے وہی حیثیت سارے مہینوں میں رمضان المبارک کی ہے، حرم شریف سارے شہروں میں سب سے مقدس ہے، تو رمضان شریف سارے مہینوں میں سب سے مقدس ہے،

اور جیسے حرم پاک اپنے سے دجالِ لعین کو دور رکھتا ہے ایسے ہی رمضان المبارک بھی اپنے سے شیطانِ لعین کو دور رکھتا ہے؛ کیوں کہ حدیث کے مطابق شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے، تا کہ گنہ گاروں کے دل میں وسوسہ نہ ڈالے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس ماہ میں گناہ کم ہوتے ہیں، اور جو ہوتے ہیں تو وہ پہلے سے شیطان کے بہکانے کا اثر ہوتا ہے وغیرہ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سب سے افضل حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، تو سال کے بارہ مہینوں میں سب سے افضل مہینہ رمضان ہے۔ یا جو حیثیت سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تھی وہی حیثیت تمام (بارہ) مہینوں میں رمضان المبارک کی ہے، اور جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں سب سے زیادہ محبت حضرت یوسف علیہ السلام سے کرتے تھے، ایسے ہی حق تعالیٰ تمام مہینوں میں سب سے زیادہ محبت ورحمت کا معاملہ رمضان میں فرماتے ہیں، اور جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی برکت سے گیارہ بیٹوں کے گناہوں کو حق تعالیٰ نے معاف فرما دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام سے ملاقات کے وقت راز ظاہر ہونے کے بعد انہوں نے کہا:

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ إِنْ كُنَّا لَخَاطِئِيْنَ﴾ (یوسف: ۹۱)

اللہ کی قسم! اللہ نے آپ کو ہم پر ترجیح دی اور ہم یقیناً خطا کار ہیں۔

﴿قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ﴾ (یوسف: ۹۲)

حضرت یوسف کریم نے فرمایا: ”آج تم پر کوئی ملامت نہیں، (میں تمہیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ) اللہ تمہیں معاف کردے اور وہ سارے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“ تو یوسف علیہ السلام کی برکت سے گیارہ بھائیوں کے گناہ معاف ہوئے، اسی طرح رمضان المبارک کی برکت سے گیارہ مہینوں کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی رحمت:

صاحبو! اگر سارے سال میں گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کو تلاش کرتے ہیں، تو رمضان المبارک میں خود اللہ تعالیٰ کی رحمت گنہگاروں کو تلاش کرتی ہے، اور گیارہ مہینوں میں اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت تقسیم کی جاتی ہے تو رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی رحمت لٹائی جاتی ہے، بلکہ یہ تو رحمت الٰہی کے سیلاب کا مہینہ ہے، کہ جب سیلاب آتا ہے تو ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے، ایسے ہی جب رمضان المبارک آتا ہے تو ہر چھوٹے (اور سچی پکی توبہ کے بعد) بڑے گناہ کو اپنی طغیانی و روحانی رو میں بہا کر لے جاتا ہے، رمضان تو روحانی، رحمانی، و ایمانی بارش کا موسم اور سیزن ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت موسلا دھار بارش کے مانند برستی ہے، فرق اتنا ہے کہ برسات میں آسمان سے پانی برستا ہے تو رمضان میں آسمان سے رحمت برستی ہے، اور عام طور پر جب کہیں پانی اور ابر رحمت برستا ہے تو ویرانوں میں بھی گھاس اُگ جاتی ہے، مردہ چٹانوں کے سینوں پر بھی درختوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں، مرجھائے ہوئے پھولوں میں شادابی آجاتی ہے، رمضان کی حیثیت بھی بالکل ایسی ہی ہے کہ اس کی آمد سے انسانوں کے ویران دلوں میں ایمانی گھاس اُگ جاتی ہے، سخت سینوں میں عباداتِ الٰہی، رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے، مرجھایا ہوا باغِ اسلام پھر ایک بار مسلمانوں کے نیک اعمال واخلاص اور اخلاق سے بھرا ہوا اور سر سبز شاداب ہوجاتا ہے، اور یہ سب حدیث مذکور کے مطابق "فُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ جَهَنَّمَ، وُ سُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ." کی برکت ہے۔ عربی کا شاعر کہتا ہے:

أَتَىٰ رَمَضَانُ مَزْرَعَةُ الْعِبَادِ
لِتَطْهِيْرِ الْقُلُوْبِ مِنَ الْفَسَادِ

رمضان بندوں کی ایمانی وروحانی کھیتی کا زمانہ آگیا، ہر قسم کے خار اور دل کے فساد کو پاک کرنے کے لیے۔

پھر منشا الٰہی تو یہ ہے کہ ہماری پوری زندگی رمضان کی طرح گناہوں سے پاک صاف ہو جائے، یا کم از کم رمضان صحیح طور پر گذار لیں، تا کہ پورا سال صحیح گذرے، اس لیے کہ سال بھر کے مہینوں میں رمضان کی ایک حیثیت وہ بھی ہے جو جسم انسانی میں دل کی ہے، جب دل صحیح ہوگا تو جسم صحیح ہوگا، اسی طرح جب رمضان صحیح گزرے گا تو ان شاء اللہ پورا سال صحیح گزرے گا۔ ہمارے شاہ جی علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے کہ ''زندگی رمضان کی طرح کرلو، تو موت عید بن کر آئے گی''۔

رمضان کا انتظار:

رمضان المبارک کی اسی عظمت کے پیش نظر عموماً مسلمان، اور خصوصاً نیک لوگ ہمیشہ اس سراپا عظمت اور خیر و برکت والے مہینے کے انتظار میں رہتے ہیں، حضرت ابوالفضلؒ ایک مشہور تابعی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں رمضان کا اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ:

" كَانُوا يَدْعُوْنَ اللّٰهَ سِتَّةَ أَشْهُرٍ أَنْ يُبَلِّغَهُمْ رَمَضَانَ، ثُمَّ يَدْعُوْنَهُ سِتَّةَ أَشْهُرٍ أَنْ يَقْبَلَهُ."

ہم لوگ رمضان سے پہلے آدھا سال اللہ رب العزت سے دعا مانگتے تھے کہ وہ اپنے فضل سے ہمیں رمضان تک پہنچا دے، پھر رمضان کے بعد بقیہ آدھا سال یہ دعا کرتے تھے کہ الٰہی! رمضان کی نیکیوں کو قبول فرمالے۔ (خطباتِ ذوالفقار/ص:۲۵۵/۹)

پھر جب رمضان المبارک آجاتا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا، وہ اس میں بڑھ چڑھ کر کارِ ثواب اور اعمالِ صالحہ انجام دیتے، اور نجاتِ اخروی حاصل کرتے۔ امیر المومنین سیدنا فاروق اعظمؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب رمضان آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ ''تمہیں مبارک بادی ہو! ایک ایسے مہینے کی جس میں نیکیاں ہی نیکیاں ہیں، اس کے دن میں صیام (روزہ) اور رات میں قیام (تراویح) ہے، اور اس مہینے میں اپنے آپ اور گھر والوں پر خرچ کرنا گویا راہِ الٰہی میں خرچ کرنا ہے۔ (از: ''برکاتِ رمضان''/ص:۸)

اور تو اور، خود رحمتِ عالم ﷺ بھی رمضان المبارک کا انتظار فرماتے تھے، محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”صرف ظاہر کو دیکھ سکنے والی ہماری نگاہوں میں تو رمضان اور غیر رمضان میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا، جس طرح اور دن اور راتیں رمضان سے پہلے اور اس کے بعد ہوتی ہیں، اسی طرح دن اور راتیں رمضان کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی کو وہ آنکھ نصیب فرمائے، جو آسمان سے نازل ہونے والی رحمتوں اور برکتوں کو اور دوسری نورانی و روحانی حقیقتوں کو دیکھ سکے تو اس کو رمضان اور غیر رمضان میں ایسا فرق محسوس ہوگا جیسا کہ ہم اور آپ کو دن اور رات میں محسوس ہوتا ہے۔“

اور رمضان کے انوارات اور برکات کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محسوس کرنے والے رحمت عالم ﷺ تھے، اس لیے آپ ﷺ کا یہ حال تھا کہ مہینوں پہلے سے ہمہ تن شوق ہو کر اس کا انتظار فرماتے، بعض روایات میں آتا ہے کہ دو مہینے پہلے جب رجب کا چاند دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے:

”عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا دَخَلَ رَجَبُ قَالَ: ”اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبَ وَ شَعْبَانَ، وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ.“ (مشکوٰۃ/ص: ۱۲۱)

الٰہ العالمین! ہمیں رجب اور شعبان میں برکت عطا فرما، یعنی کثرتِ عبادت کی توفیق عطا فرما، اور ہمیں رمضان تک پہنچا، تا کہ رمضان کی عبادت سے تیرا قرب نصیب ہو۔

حالاں کہ زندگی کی آپ ﷺ کو کوئی خاص تمنا نہ تھی، مگر رمضان کی وجہ سے آپ ﷺ یہ دعا فرماتے کہ یا اللہ! جب رجب تک آپ نے ہمیں پہنچا دیا تو اب کہیں ایسا نہ ہو کہ رمضان سے پہلے موت واقع ہو جائے، اور رمضان کے فیوض اور برکات نصیب نہ ہوں، اس لیے ہمیں بھی رمضان تک پہنچانا، پھر جب شعبان کا مہینہ آتا تو آپ ﷺ (اس کی تیاری اس طرح کرتے کہ) مسلسل روزے رکھتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قریب قریب پورا مہینہ شعبان کا آپ ﷺ روزے رکھتے تھے، (متفق علیہ، مشکوۃ/ص:۱۷۸) اور رمضان میں تو

آپ ﷺ کی طبیعتِ مبارکہ میں گویا موسم بہار آجاتا، آپ ﷺ خطبات اور مواعظ کے ذریعہ بھی حضرات صحابہؓ کو اس کی ترغیب دیتے تھے کہ اس مہینے کی برکتوں اور رحمتوں سے وہ حصہ لیں اور اس کے دنوں اور راتوں کی پوری قدر کریں۔ (وصیۃ العرفان/ص:۲۹)

رمضان کی دعائیں:

چناں چہ ایک موقع پر رمضان کی آمد پر رحمت عالم ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں رمضان کی فضیلت بیان فرمائی:

لوگو! تم پر عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، پھر آپ ﷺ نے رمضان کی سب سے بڑی فضیلت کو بیان فرمایا کہ اس میں ایک ایسی رات ہے (شب قدر) جو ہزار دنوں اور راتوں سے نہیں، بلکہ ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ (القدر:۳)

خطبہ کے آخر میں فرمایا کہ رمضان کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ جہنم سے نجات و برأت کا ہے۔ (مشکوٰۃ/ص:۱۷۳/ الفصل الثالث)

عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحی صاحبؒ فرماتے تھے: ”مجھے بطورِ لطیفہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رمضان المبارک کے تین عشرے اس دعاءِ ربانی کے مصداق ہیں:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرۃ ع:۲۰)

الٰہ العالمین! ہمیں دنیا میں بھی (اپنی رحمت سے) بھلائی عطا فرما، اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما (ہماری مغفرت فرما) اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

(۱) پہلا عشرہ رحمت کا (گویا آیت کے پہلے جزو میں اس کو فرمایا) ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾

(۲) دوسرا عشرہ مغفرت کا (گویا آیت کے دوسرے اور درمیانی جزو میں اس

کو فرمایا) ﴿وَ فِی الآخِرَةِ حَسَنَةً﴾

(۳) اور تیسرا حصہ جہنم سے نجات کا ہے (تو گویا آیت کے تیسرے اور آخری جزو میں اس کو فرمایا) ﴿وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (رمضان المبارک انوارات اور برکات/ص:۱۵)

اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ رمضان میں اس دعا کی بھی کثرت کرنی چاہیے۔ علاوہ ازیں پہلے عشرۂ رحمت میں: ﴿رَبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ أَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ﴾ (المؤمنون:۱۱۸) (اے میرے رب! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے) دوسرے عشرۂ مغفرت میں: "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَ أَتُوْبُ إِلَيْهِ" (مشکوٰۃ:۲۰۵) (میں اللہ تعالیٰ سے تمام گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، جو زندہ اور ہر چیز کو تھامنے والا ہے، اور اس کی طرف میں رجوع کرتا ہوں) اور تیسرے عشرۂ نجات میں: "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّيْ." (مشکوٰۃ:۱۸۲) (اے اللہ! تو بلاشبہ خوب معاف کرنے والا ہے، اور معافی کو پسند کرتا ہے، مجھے معاف کر دے) یہ دعائیں بہتر ہیں۔ (واللہ اعلم)

الغرض! رمضان المبارک کی فضیلت اتنی کثرت سے بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے خواص تو خواص، عوام بھی اس سے واقف ہیں، حدیثِ مذکور میں فرمایا کہ رمضان داخل ہوتے ہی آسمانوں اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور دوزخ کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے، اور شیاطین مضبوطی سے جکڑ دیے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جنت جو مقامِ رحمت ہے اس کے دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے، اور جہنم جو مقامِ غضب ولعنت ہے، اس کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے رمضان المبارک میں جب بندے رحمت والے کاموں میں منہمک ہو جاتے ہیں اور لعنت والے کاموں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے، دراصل یہی جنت کے دروازوں کا کھلنا اور لعنت کی آندھی کا رک جانا جہنم کے دروازوں کا بند ہونا ہے، پھر شیطان بندوں کو گمراہ کرنے سے

عاجز ہو جاتے ہیں، اور یہی ان کا قید ہونا ہے۔

اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ظاہری معنوں پر بھی محمول ہو سکتی ہے، لہٰذا جنت کے دروازوں کا کھلنا، دوزخ کے دروازوں کا بند ہونا اور شیطانوں کا قید ہونا اس مہینے کی آمد کی اطلاع اور اس کی عظمت اور حرمت و فضیلت کی وجہ سے ہے، شیاطین کا بند ہونا اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ اہل ایمان کو وسوسوں میں مبتلا کر کے ایمانی و روحانی اعتبار سے ایذا نہ پہنچا سکیں، جیسا کہ دستورِ زمانہ بھی ہے کہ جب کوئی اہم موقع ہوتا ہے تو خصوصی انتظامات کیے جاتے ہیں، تمام شر پسندوں کو قید کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اس موقع پر کوئی رخنہ و فتنہ پیدا نہ کریں، اور حکومت اپنے حفاظتی دستوں کو ہر طرف پھیلا دیتی ہے، یہی حال رمضان المبارک میں بھی ہوتا ہے کہ شیطانوں کو قید کر دیا جاتا ہے۔

اور اس سے مجازی معنیٰ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ شیاطین کا اکسانا اس ماہ میں کم ہو جاتا ہے، اس لیے گویا وہ قید ہو جاتے ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت کے دروازے کھولنے سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر طاعات اور عبادات کے دروازے اس ماہ میں کھول دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو عبادتیں کسی اور مہینے میں عام طور پر واقع نہیں ہو سکتیں وہ عموماً رمضان میں بآسانی ادا ہو جاتی ہیں، یعنی روزے رکھنا، قیام کرنا وغیرہ۔ (نووی شرحِ مسلم، از: برکاتِ رمضان/ص: ۴۴)

الغرض رمضان المبارک کی بڑی فضیلت ہے، اسی وجہ سے کہا گیا کہ اگر لوگوں کو رمضان المبارک کی ساری فضیلتوں اور برکتوں کا پتہ چل جائے تو وہ تمنائیں کریں کہ کاش! سارا سال رمضان ہو جائے۔

رمضان کی خصوصیات:

اسی کے ساتھ اس کی بے شمار خصوصیتیں بھی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) رمضان کی پہلی تاریخ ہی سے جنت کے آٹھوں دروازوں کو اہل ایمان کے لیے کھول دیا جاتا ہے، اور جہنم کے ساتوں دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے، اور تمام سرکش شیاطین کو بھی قید کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد ہوا۔

اور ظاہر ہے کہ جب کہ رمضان کے شروع ہی میں جنت کے دروازوں کو کھول کر جہنم کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں تو رمضان میں مرنے والے مومن کے جہنم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ابویعلی موصلیؒ کی روایت ہے کہ جس کا رمضان میں انتقال ہوگا وہ عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جائے گا۔ (اعمالِ رمضان/ص:۲۶، وعظ مولانا افتخار الحسن کاندھلویؒ) اور جو بندہ عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جائے گا وہ - ان شاءاللہ - عذابِ دوزخ سے بھی محفوظ رہے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا۔

(۲) سال بھر کے تمام مہینوں میں رمضان ہی ایک ایسا منفرد مہینہ ہے کہ قرآنِ پاک میں اس کا نام صراحت کے ساتھ آیا ہے، ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

اور کلام اللہ میں نام آنا اور تعریفی انداز میں وارد ہونا بجا طور پر بہت بڑی فضیلت اور خصوصیت ہے، اس لیے رمضان اپنی انفرادیت پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۳) قرآن کریم کے نزول کی ابتدا رمضان المبارک ہی سے ہوئی، بقول مولانا دریا آبادیؒ: ''اس بابرکت موسم میں انسان کے کان میں پہلی بار نغمۂ ازل کی سریلی آواز بے ہوشوں کو بیدار اور ہوشیاروں کو مست کرنے والی پکار پہنچی، جس سے بڑھ کر کوئی دولت، جس سے اونچی کوئی نعمت، جس سے برتر کوئی رحمت عالمِ تصور میں نہیں۔''، ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن رمضان میں آیا تو رمضان کا تذکرہ قرآن میں آیا، دونوں میں خاص مناسبت ہے، شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے کہ ''رمضان اور قرآن کا جسم اور روح کا سا تعلق ہے، رمضان جسم ہے تو قرآن روح ہے''۔

ماہِ صیام تیرا کیوں نہ ہو احترام
کہ نازل ہوا تجھ میں اللہ کا کلام

اسی لیے ہمارے بزرگوں نے رمضان میں صیام و قیام کے علاوہ قرآن کی تلاوت کو سب سے بہتر عبادت فرمایا۔

(۴) شبِ قدر رمضان میں ہے، جس میں سارا قرآن اکٹھا ایک ہی بار لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نازل ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ رحمت عالم ﷺ پر قرآنِ کریم کا نزول سب سے پہلے شب قدر میں شروع ہوا، ارشاد ہے:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ﴾ (القدر: ۱)

اس کا ایک اور مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن ماہِ رمضان کی فضیلت میں اس طرح نازل ہوا ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت حضرت عمرؓ کی شان میں نازل ہوئی۔ (واللہ اعلم) (تو جیسے اس آیت کریمہ کے نازل ہونے سے حضرت عمرؓ کی شان اور بڑھ گئی، اسی طرح رمضان میں قرآن کے نازل ہونے کی وجہ سے رمضان کی شان بھی بڑھ گئی) (واللہ اعلم) (برکاتِ رمضان/ص:۶۰)

ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ نے فرمایا: ''رمضان میں شب قدر بھی ہے، اور شب بدر بھی''۔

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت اور نبوت ملی رمضان میں، کیونکہ قرآن کا نزول رمضان میں ہونا خود قرآن سے ثابت ہوا، اور غارِ حرا میں حضورِ پرنور ﷺ کی ذات بابرکات پر وحی اور قرآن کا نزول درحقیقت آپ ﷺ کی نبوت کا اعلان تھا، جیسا کہ ایک

عربی کا شاعر کہتا ہے:

وَأَتَتْ عَلَيْهِ أَرْبَعُونَ فَأَشْرَقَتْ
شَمْسُ النُّبُوَّةِ فِي رَمَضَانَ

جب عمر مبارک چالیس سال کی ہوگئی تو ماہ رمضان میں آپ ﷺ کی نبوت کا آفتاب جلوہ گر ہوا۔

(٦) اس ماہ میں نیکیوں کا بھاؤ بڑھا دیا جاتا ہے، چناں چہ حدیث شریف میں ہے کہ اس میں نفل اعمال وعبادات کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرائض کے مانند ملتا ہے۔ (مشکوٰۃ/ص:۱۷۳)

ایک روایت میں ہے کہ "تَسْبِيحَةٌ فِي رَمَضَانَ أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ تَسْبِيحَةٍ فِي غَيْرِهِ." (ترمذی/ص:۱۸۵/ ج : ۲)

رمضان میں ایک مرتبہ سبحان اللہ کہہ لینا غیر رمضان میں ایک ہزار مرتبہ کہہ لینے سے بہتر ہے۔

(٧) رمضان کی ہر رات ایک منادی اعلان کرتا ہے:

"يَابَاغِيَ الْخَيْرِ! أَقْبِلْ، وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ! أَقْصِرْ." (مشکوٰۃ/ص : ۱۷۳)

او خیر کے طالب! آگے بڑھ، اور شر کے طالب! رک جا، بس کر۔ اللہ کی طرف بڑھ، اس کی رضا والے کاموں میں مشغول ہو، گناہوں سے باز آجا، کیوں کہ یہ تو مبارک وقت ہے۔ رمضان کی اس ندائے رحمان کو اگر چہ ہم اپنے کانوں سے نہیں سنتے اور نہیں سن سکتے، تاہم اس کا اثر اور ظہور اس دنیا میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ رمضان میں عموماً اہل ایمان کا رجحان ومیلان خیر وسعادت والے اعمال کی طرف بڑھ جاتا ہے، یہاں تک کہ غیر محتاط آزاد منش عام مسلمان بھی رمضان میں اپنی روش کچھ بدل لیتے ہیں، یہی اس ملأ اعلیٰ کی ندا کا ظہور واثر ہے۔ (معارف الحدیث/ص:۹۸/۴)

ہمیں اس ندائے رحمان پر دل وجان سے لبیک کہہ کر نیکی کی طرف بڑھنا اور ترقی کرنا چاہیے، اور بدی سے توبہ واستغفار کے ساتھ بار بار بچتے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس کے لیے اس دعا کی کثرت نہایت مفید ہے:

” لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، نَسْتَغْفِرُاللّٰهَ، نَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ، وَنَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ“

یہی گویا رمضان میں ندائے رحمان کا جواب ہے۔ (واللہ اعلم)

رمضان کی حرمت کا لحاظ کرنا سبب مغفرت ہے:

بہر حال! اس کی عظمتوں، برکتوں اور خصوصیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حرمت کا پورا لحاظ رکھے کہ رمضان اللہ تعالیٰ کا شاہی مہمان ہے، جو ہمارے پاس بوجھ بن کر نہیں، رحمت کی موج بن کر آتا ہے، اس لیے اس کے منافی کوئی کام نہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ ایک یہودی نے اپنے بیٹے کو رمضان کے دن میں کھاتے دیکھا، تو اسے مارا، کہ تو نے اس کی حرمت کو باقی نہ رکھا، کہتے ہیں کہ پھر اسی ہفتہ اس کا انتقال ہوگیا، تو شہر کے کسی عالم نے خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں ہے، تعجب سے پوچھا: ”میاں! تم یہاں کیسے؟“ تو اس نے کہا: ”جب میری موت کا وقت آیا تو حرمت رمضان کی وجہ سے مجھے کلمہ پڑھا کر مشرف باسلام کر دیا گیا، اور الحمد للہ! میرا خاتمہ ایمان پر ہوا۔“ (نزہۃ المجالس مترجم: ۳۲۵۱)

پس ثابت ہوگیا کہ رمضان کی حرمت کا لحاظ کرنا بھی سبب مغفرت ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو اس کی حرمت کا لحاظ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰی اللّٰه عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ .

(۹)

فضائل روزہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَؓ قَالَ: قُلْتُ: "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! مُرْنِیْ بِأَمْرٍ یَنْفَعُنِي اللّٰهُ بِهٖ، قَالَ: "عَلَیْكَ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهٗ لَامِثْلَ لَهٗ." (رواہ النسائی، ج: ۱/ ص: ۱٤۰)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے عرض کیا: "مجھے کسی ایسے عمل کا حکم دیجئے جس سے حق تعالیٰ مجھے نفع دے" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "روزہ رکھا کرو! اس کے مثل (مانند) کوئی عمل نہیں ہے"۔ (یعنی تمہارے خاص حالات میں تم کو اس سے زیادہ نفع ہوگا)۔

روزہ کے مانند کوئی عمل نہیں:

اسلام کی حقانیت اس کے اعمال اور عبادات سے بھی واضح ہوتی ہے، اس کے ہر عمل اور عبادت کی ایک حقیقت، حکمت، انفرادیت، اور خصوصیت ہے، ویسے مجموعی طور پر نماز، زکوٰۃ، صدقہ، روزہ، حج، خدمتِ خلق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ تمام اعمالِ صالحہ، ظاہرہ و باطنہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ تو ہیں ہی، لیکن ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ کچھ خاص تاثیرات اور خصوصیات بھی ہیں، جن میں یہ اعمال ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہیں، گویا "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ مگر ان سب میں چند انفرادی و امتیازی

خصوصیات کے لحاظ سے روزہ ایک ایسا عمل ہے جو اپنی مثال آپ ہے، اسی لیے حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا: " لَا مِثْلَ لَہٗ " روزہ کے مانند کوئی عمل نہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ فضائل رمضان میں ایک حدیث نقل فرماتے ہیں کہ "ساری عبادتوں کا دروازہ روزہ ہے"۔ اس لیے کہ روزہ کی وجہ سے قلب منور ہو جاتا ہے (تقویٰ اور تزکیہ کے سبب) جس کی وجہ سے عبادت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ (فضائل اعمال/ص:۵۷۶)

اور واقعہ یہ ہے کہ افادیت، حکمت اور فضیلت کے اعتبار سے کوئی عمل روزہ کے مانند نہیں ہے، کیوں کہ قرآن کے بیان کے مطابق روزہ کی سب سے بڑی حکمت تقویٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ : ۱۸۳)

اور حدیث کے بیان کے مطابق اس کی سب سے بڑی فضیلت خود اللہ تعالیٰ اور اس کی رضا ہے: "اَلصَّوْمَ لِیْ، وَأَنَا أَجْزِیْ بِہٖ۔" (ترمذی/ص:۹۵/۱، حدیث قدسی نمبر:۲)

ظاہر ہے کہ کسی بھی عمل کی اس سے بڑھ کر اور کیا حکمت و فضیلت ہو سکتی ہے جو روزہ کی ہے۔

روزہ کی حقیقت: اظہارِ عبدیت:

پھر روزہ کی حقیقت اور حکمت میں بھی خاص مناسبت ہے، وہ اس طرح کہ روزہ کی حقیقت تو اظہارِ عبدیت ہے، کہ روزہ بندۂ مومن کی جانب سے اللہ تعالیٰ کی بندگی، تابعداری اور فرماں برداری کا بہترین مظاہرہ ہے، جس کا ادنیٰ درجہ یہ کہ مومن بندہ طلوعِ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک اللہ تعالیٰ کی رضا و منشا کے مطابق کھانے، پینے اور بیوی کے تعلق سے رکتا ہے، اسے جسمانی روزہ بھی کہتے ہیں، لیکن روزہ کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مومن بندہ تمام معاصی و محرّمات سے بچا رہے، یہی تقویٰ ہے، اسے روحانی روزہ بھی کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ روزہ دار بندہ روزہ کے ذریعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے تمام اعمال، افعال، احوال، حرکات، سکنات

حتیٰ کہ جینا اور مرنا سب کا مرکزی اور بنیادی نقطہ امر الٰہی اور مرضیٔ مولیٰ ہے:

﴿إِنَّ صَلاَ تِىُ وَنُسُكِىُ وَمَحُيَايَ وَمَماَتِىُ لِلّٰهِ رَبِّ الُعٰلَمِيُنَ﴾ (الأنعام: ١٦٢)

بیشک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے، جو رب العالمین ہے۔ یہ حقیقی اور سچی کیفیت زندگی میں پیدا ہو جائے تو یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔ اور کیوں کہ یہ جذبہ اور حوصلہ روزہ سے پیدا ہوتا ہے، اس اعتبار سے روزہ تقویٰ کی تربیت کا کام کرتا ہے، روزہ کے ذریعہ تھوڑی دیر کے لیے اس کی پریکٹس کروائی جاتی ہے کہ اگر تجھے بھوک لگی ہے، اور گھر میں حلال کھانا اور غذا موجود ہے، مگر مولیٰ کی مرضی کے مطابق فاقہ کرنے کا عادی بن جا، تجھے پیاس لگی ہے، گھر میں ٹھنڈا پانی اور میٹھا شربت موجود ہے، مگر مولیٰ کے حکم کی نسبت پر پیاسا رہنے کا عادی بن جا، تیرے نفس کی خواہش ابھری، اور گھر میں بلکہ پاس میں پیاری حسین وجمیل بیوی موجود ہے، مگر حکم الٰہی کے مطابق کچھ دیر اس سے بھی رکے رہنے کا عادی بن جا، روزے سے بندہ اس کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے، اور اسی سے اس میں تقویٰ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، جو روزہ کی حکمت ہے۔ اس لیے جب روزہ کے ذریعہ جو شخص اپنے گھر کی حلال چیزوں سے بچنے اور رکنے کا عادی بنے گا وہ حرام اور دوسرے کے مال پر کیسے ہاتھ ڈالے گا؟ اور جو روزہ کے ذریعہ اپنی بیوی سے جائز شہوت سے بچنے اور رکنے کا عادی بنے گا وہ حرام طریقہ سے دوسروں کی آبرو اور بیٹی، بہو پر ناجائز نظر بھی کیسے ڈالے گا؟

روزہ تزکیہ کا ذریعہ:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شاید روزہ کی اس تربیت کو سال بھر باقی رکھنے کی غرض سے رحمت عالم ﷺ نے کہیں ماہِ محرم میں دو روزوں کی ترغیب دی، کہیں ہر ماہ تین روزوں کی تلقین فرمائی، کہیں شوال کے چھ روزوں کی فضیلت بیان فرمائی، تو کہیں ذی الحجہ کے نو روزوں کی فضیلت بتلائی، تاکہ اس سے انسان کا تزکیہ ہوتا رہے۔ اس لیے کہ ایک حدیث میں فرمایا:

”عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ”لِکُلِّ شَیْءٍ زَکوٰةٌ، وَزَکوٰةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ.“ (رواه ابن ماجه، مشکوٰة/ ۱۸۰ کتاب الصوم/الفصل الثالث)

کہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی زکوٰۃ ہے، جس کے نکالنے سے وہ چیز پاک ہوجاتی ہے، اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے، جیسے زکوٰۃ دل اور دولت کی طہارت وتزکیہ کا ذریعہ ہے، ایسے روزہ بھی جسم اور روح دونوں کی طہارت وتزکیہ کا ذریعہ ہے، جسمانی روزہ سے بطن کا تزکیہ ہوتا ہے، تو روحانی روزے سے باطن کا۔

صاحبو! قلب ونظر کی عفت وطہارت میں جو تاثیر نکاح کی ہے وہی تاثیر روزہ کی بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ نکاح کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں روزہ کا حکم ہے، ارشاد ہے:

”فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ، فَعَلَیْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهٗ لَهٗ وِجَاءٌ.“ (مشکوٰة/ص:۲۶۷ کتاب النکاح/الفصل الأول)

معلوم ہوا کہ تزکیۂ نفوس میں روزہ کو خاص دخل ہے، پھر جس کا تزکیہ ہوگیا وہ کامیاب ہوگیا۔ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی﴾ (سورة الأعلیٰ/ پ: ۳۰)

فلاح اس نے پائی جس نے (تزکیہ یعنی اخلاق کی) پاکیزگی اختیار کرلی۔

آیاتِ صوم کا عاشقانہ ترجمہ:

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے روزہ فرض فرمادیا، قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرة: ۱۸۳) آیت صوم میں اہل ایمان کو خطاب اس لیے فرمایا کہ روزہ کا اصل محرک ایمان ہے۔ مرشدی حضرت شیخ الزماں فرماتے ہیں کہ ”روزہ ایمان سے ہے، اسی لیے حدیث میں بھی: ”مَنْ صَامَ إِیْمَانًا“

(مشکوٰۃ ص: ۱۷۳) فرمایا، معلوم ہوا کہ ایمان نہیں تو روزہ بھی نہیں۔''

بقول حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم
قوم ہے قرآن سے، قرآن رخصت قوم گم

تو ایمان اور روزہ لازم ملزوم ہیں، اس لیے شاہی خطابِ الٰہی کو لفظ ''آمَنُوْا'' سے شروع فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ: ''اے حسن ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو! اے اپنے معبود کی یکتائی کا کلمہ پڑھنے والو! توحید کے فرزندو! ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ تم پر روزوں کی فرضیت لکھ دی گئی، اس شاہی حکم کا اندراج ہو چکا، اس کا تمہیں قرآنی اور تحریری آرڈر مل چکا، لہٰذا تم اپنے دعوئ ایمانی وعشقِ الٰہی، آئین وفاداری اور تابعداری میں سچے اور پکے ہو، تو اب پوری زندگی یا کم از کم ماہِ صیام میں ما سوا اللہ سے اپنی نظر ہٹالو، دل کی دنیا سے غیر کو نکالو، اور من چاہی زندگی کو رب چاہی زندگی پر اور تمام ہی دنیوی، عارضی اور نفسانی لذتوں کو آخرت کی دائمی اور حقیقی لذتوں کے تصور پر قربان کرو۔ ''كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' یاد رکھو! یہ شاہی فرمان خاص تمہیں کو نہیں دیا گیا، بلکہ از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم ﷺ یعنی از آدم تا ایں دم، انٹرنیشنل اور بین الاقوامی طور پر جس کسی نے بھی ہم سے پیمانِ وفا باندھا اور راہِ الفت میں قدم رکھنے کا دعویٰ کیا، ان سب کو اپنے دعوے کا کچھ ایسا ہی ثبوت پیش کرنا پڑا۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ رہی بات اس کی غرض وغایت، افادیت اور حکمت کی، تو اس فرمانِ الٰہی کی غرض تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ تمہاری تربیت اور تزکیہ مقصود ہے، تمہارے ہی کمالاتِ ظاہرہ وباطنہ کی نشو نما مطلوب ہے، تمہاری پاکیزگی کی کھلی اور چھپی ہوئی قوت کو ابھارنا، اور تمہیں حیوانیت کے غار اور دلدل سے نکال کر ملکوتیت کے پہاڑ اور آسمان پر پہنچانا منظور ہے۔

تو روزے کی سب سے بڑی افادیت اور حکمت یہی ہے کہ اس سے تقویٰ حاصل

ہوگا، جو دارین کی نعمتوں کا سر چشمہ ہے، ظاہر بات ہے کہ اس صفت میں کوئی دوسرا عمل روزے کے مانند نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا: ’’ لَا مِثْلَ لَهٗ ‘‘

ہمارے حضرت شیخ الزمان مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ’’ قرآن سے ثابت ہے کہ بزرگی کے لیے تقویٰ ضروری ہے، ارشاد ہے: ﴿ إِنْ أَوْلِيَآؤُهٗٓ إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ اور تقویٰ کے لیے روزہ ضروری ہے، فرمایا: ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

روزہ کی سب سے بڑی فضیلت:

حدیث پاک میں اس بے مثال عبادت اور عمل کے اور بھی فضائل بکثرت وارد ہوئے ہیں، اور واقعی اگر روزہ اس کے پورے آداب، مستحبات، اخلاص اور احتیاط کی رعایت کے ساتھ رکھا جائے اور آدمی سارا کا سارا روزہ دار بن جائے، یعنی تمام معاصی اور محرمات سے بچ جائے جو روزہ کی اصل غرض وغایت ہے، تو پھر اس کے ذریعہ روزہ دار اللہ تعالیٰ کا ولی بن سکتا ہے، علاوہ ازیں اس کے وہ فضائل ہیں کہ وہ اپنی فضیلتوں میں بھی بے مثال ہے۔

حدیث قدسی جو روزے کے فضائل میں وارد ہوئی ہے اس کے الفاظ میں ذرا غور کیجیے! تو معلوم ہوگا کہ روزہ سے بڑی فضیلت کسی عمل کی نہیں، فرمایا: ’’اَلصَّوْمُ لِيْ، وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ‘‘ روزہ خاص میری پسندیدہ عبادت ہے، یا میرے لیے ہے، اس ارشاد میں غیر کی شرکت کی بالکل ہی نفی کردی، کسی دوسری عبادت کے لیے ایسا نہیں فرمایا گیا، جب کہ ساری عبادتیں بلا شرکت غیر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں، مگر روزہ کی شان کچھ اور ہی ہے، یوں سمجھ لو جیسے ساری مسجدیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں: ﴿ وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ ﴾ (الجن: ۱۸) لیکن مسجد حرام کی شان ہی کچھ اور ہے، اسے بیت اللہ اور خانۂ خدا ہونے کا شرف حاصل ہے، بالکل اسی طرح ساری عبادتیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں، مگر روزہ ایک ایسی منفرد عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کا شرف حاصل ہے، ارشاد ہوتا ہے: ’’اَلصَّوْمُ لِيْ‘‘ اور یہ اس لیے بھی فرمایا کہ روزہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے درمیان ایک راز ہے، یہاں تک

کہ بعض علماء نے فرمایا کراماً کاتبین تک اس روزے کے راز پر مطلع نہیں ہوتے ہیں، اور نہ وہ اسے لکھتے ہیں۔ (الجواہر الزواہر/ص:۱/۵۳۱)

اس لیے اسے اپنی ذات کے ساتھ خاص فرما دیا، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ مزید اس خصوصی عمل کا خصوصی بدلہ اس طرح بیان فرمایا کہ "وَ أَنَا أَجْزِیْ بِهٖ" اس جملہ کی بھی بڑی دل نشین تشریح بیان کی گئی ہے، فرمایا گیا کہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کا علم چوں کہ مجھ ہی کو ہوتا ہے، لہٰذا اس کا بدلہ بھی میں خود ہی دوں گا۔ دنیا میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق دیتا ہے، چھوٹا اپنی حیثیت کے مطابق، تو بڑا اپنی حیثیت کے مطابق، اور بادشاہوں کا تو پوچھنا ہی کیا، جب وہ کسی سے خوش ہو جاتے ہیں تو جھولیاں بھر بھر کے عطا کرتے ہیں۔

ہارون رشید کا واقعہ:

چناں چہ ہارون رشید کا ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ وہ کہیں جا رہے تھے، کسی بوڑھے کو دیکھا کہ وہ اپنی زمین میں آم کا درخت لگا رہا تھا، بادشاہ نے ویسے ہی پوچھ لیا: ''بڑے میاں! کیا کرتے ہو؟'' کہا: ''آم کا پودا لگا رہا ہوں'' بادشاہ کو مذاق سوجھی، اس نے کہا: ''کیا آپ اس کا پھل کھانے تک زندہ رہیں گے؟'' بوڑھے نے کہا: ''حضرت! بات یہ ہے کہ آم کا پودہ ہمارے اگلوں نے بویا تو ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا پھل کھایا، اب آج ہم بوئیں گے تو ہمارے بعد والے اس کا پھل کھائیں گے'' بادشاہ کو جواب بہت پسند آیا، حکم دیا کہ انہیں ایک ہزار اشرفیاں انعام دے دو، بڑے میاں نے انعام لینے کے بعد موقع غنیمت جانتے ہوئے عرض کیا: ''حضرت! دیکھئے! اگلوں نے آم کا پودہ لگایا تو اس کا پھل ہم نے کھایا، لیکن میرا حال یہ ہے کہ ابھی تو میں نے پودا ہی لگایا، اور مجھے اس کا پھل آپ کے انعام کی صورت میں مل گیا'' اس بات سے بادشاہ اور متاثر ہو گیا، اور مزید ایک ہزار اشرفیاں انعام دینے کا حکم دیا، اب کی بار بوڑھے نے کہا: ''میرے آقا! لوگوں کے درخت سال میں

ایک ہی مرتبہ پھل دیتے ہیں، جب کہ میں اپنے لگائے ہوئے اس پودے کا دو مرتبہ پھل کھا چکا'' بادشاہ اس حاضر جوابی پر حیران رہ گیا، اور خوش ہوکر مزید ایک ہزار اشرفیوں کا حکم دے دیا، وزیر نے کہا: ''حضرت! آگے چلیں! ورنہ بوڑھا خزانہ صاف کردے گا!''

(خطباتِ منوّر/۳/۲۱۲)

جب دنیا کے بادشاہ کسی سے خوش ہوکر اتنا دے سکتے ہیں تو خزائن السماوات والارض کے مالک کے متعلق کیا خیال ہے!

لیکن دوسرا مطلب بعض صوفیہ کے نزدیک صیغۂ مجہول ہونے کے سبب یہ ہے کہ اس کا بدلہ تو میں خود ہی ہوں، جنت نہیں، جنت کے باغات ومحلات نہیں، جنت کی حوریں، نہریں اور نعمتیں نہیں، کہ ہر عمل صالح کا بدلہ اور صلہ بالآخر جنت ہی ہے:

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (البقرة : ۲۵)

لیکن روزہ ایسا انفرادی اور خصوصی عمل ہے کہ اس کا بدلہ میں خود ہی ہوں، رہی بات جنت کی، تو جنت میری ہے، مجھ سے ہے، لیکن مجھ سے بڑی نہیں، لہٰذا جسے اور جس عمل سے میں مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ سبحان اللہ! سچ ہے: ''مَنْ کَانَ لِلّٰهِ کَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' جو اللہ تعالیٰ کا ہوگیا، ساری خدائی اس کی ہوگئی۔

اس حدیث قدسی میں روزے کی بے حد وحساب جزا اور صلہ جنت والے مالک نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ''روزہ کا بدلہ میں خود ہوں''۔

کیا زمینوں اور آسمانوں میں موجود ساری نعمتیں اور دولتیں مل کر بھی اس جزا وصلہ کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں؟ ہر گز نہیں، پھر کیسی سنگین نادانی ہوگی کہ روزہ نہ رکھ کر اتنے سستے سودے کو بھی غفلت کی نذر کردیا جائے، العیاذ باللہ العظیم۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنے کرم سے سراپا روزہ دار بنادے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰی اللّٰه عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۱۰)

عظمتِ قرآن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُمَرَ بۡنِ الۡخَطَّابِؓ قَالَ: قَال رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : "إِنَّ اللّٰہَ یَرۡفَعُ بِھٰذَا الۡکِتَابِ أَقۡوَاماً، وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیۡنَ﴾ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۱۸٤/کتاب فضائل القرآن/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رفعت وعظمت عطا فرماتے ہیں اس کتاب (قرآن کریم) کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو اور پست کرتے ہیں دوسروں کو۔''

عظمتِ قرآن کی سب سے عظیم دلیل:

رب کریم کی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے سب کا سب خالق حقیقی کی مخلوق ہے، یہاں تک کہ زمینی مخلوقات میں حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام اور کعبۃ اللہ نیز آسمانی مخلوقات میں ملائکہ، جنت اور اس کی نعمتیں، لوح وقلم اور عرش وکرسی، یہ سب کے سب اپنی معلوم ومسلم فضیلت وعظمت کے باوجود مخلوق ہیں۔

لیکن قرآن عظیم کی یہ ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں ہے، ربِ کریم کی پیدا کی ہوئی اور اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ ربِ کریم کا کلام اور

اس کی حقیقی اور یقینی صفت ہے، جو اس کی ذاتِ عالی کے ساتھ قائم ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ کلام متکلم کی صفات، امتیازات اور خصوصیات کا مظہر تام ہوتا ہے، تو ربِ کریم کا کلام بھی اس کی جملہ صفات و امتیازات کا مظہر و ترجمان ہے) یہی عظمت قرآن کے لیے سب سے عظیم دلیل ہے، اب جسے قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے اسے کھلا چیلنج خود قرآن نے دیا:

﴿قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنْسُ وَ الجِنُّ عَلىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا القُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (بنى إسرائيل : ٨٨)

محبوبم! کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس کام پر اکٹھے بھی ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کلام بنا کر لے آئیں، تب بھی وہ اس جیسا نہیں لاسکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کرلیں۔

قرآن نے صاف اعلان کیا ہے کہ اگر تمام جن و انس مل کر بھی قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے، ارے پورا قرآن تو کیا، ﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ﴾ (هود : ١٣) قرآن کی طرح دس سورتیں ہی لے آؤ، اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ (البقرة : ٢٣) قرآن کی سورتوں کی طرح ایک ہی سورت پیش کر کے بتاؤ، بلکہ قرآن کی آیتوں کے مانند ایک آیت ہی لا کر بتاؤ: ﴿فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِثْلِهٖ﴾ (الطور : ٣٤)

اس بات پر تاریخ عالم شاہد ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج تک اس چیلنج کا کوئی جواب نہ دے سکا، کسی زمانے میں منکرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآنِ کریم لوگوں کو تیزی سے متاثر کر رہا ہے، تو یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے، انہوں نے اس مقصد کے لیے ابن مقفع (م ۷۲۷) کو تیار کیا، جو اس زمانے کا زبردست پڑھا لکھا بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین آدمی تھا، اسے بھی اپنے اوپر پورا اعتماد تھا، اس لیے اس نے ایک سال میں یہ کام پورا کرنے کا وعدہ کیا، اور اپنی کفالت ان کے ذمہ ڈال کر کام

شروع کیا، نصف مدت گذر گئی تو لوگوں نے جاننا چاہا کہ کام کہاں تک پہنچا، وہ گئے تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی، کیا دیکھتے ہیں کہ کاغذ کے پرزے بکھرے ہوئے ہیں، پوچھا کہ کیا ہوا؟ تو اس نے جواب دیا اور پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ ''قرآن جیسا ایک فقرہ لکھنے کی جدو جہد میں چھ مہینے گذر گئے، مگر میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔'' چناں چہ وہ شرمندہ ہو کر اس خدمت سے سبک دوش ہو گیا۔ (ماخوذ از صوت القرآن/ص:۷/نومبر/۲۰۰۱ء)

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے ☆ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس کے بعد بعض حقیقت پسند عربوں نے اعتراف بھی کیا: ''مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَر'' کہ یہ انسانی کلام نہیں، ربانی کلام ہے۔ لہٰذا اس کے مانند کلام پیش کرنا ناممکن ہے، پھر چوں کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ ہی نے لیا ہے، اس لیے اس میں کسی قسم کی تبدیلی بھی ممکن نہیں، چناں چہ قرآن کریم کا بغیر کسی تغیر و تحریف کے ہمیشہ سے باقی رہنا بھی اس کے کلام اللہ ہونے کی کھلی دلیل ہے، اور اس کی عظمت کے لیے تو اتنا بھی کافی ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا۔

عظمت قرآن اسماءِ قرآنی سے:

مزید اس کی عظمت سے آگاہ و آشنا کرانے کے لیے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اور حدیث میں حضور ﷺ نے اپنے امتیوں کو مختلف انداز اور عنوان سے عظمت قرآنی کو بیان فرما کر اس کی طرف متوجہ کیا، مثلاً قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا:

﴿حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ (حٰمٓ السجدة : ۱-۲-۳)

یہ رحمٰن و رحیم کی جانب سے نازل ہونے والی کتاب ہے، جس کی آیتیں (علم حاصل کرنے والوں کے لیے) مفصل ہیں، جس کا نام قرآن ہے، جس کی زبان عربی ہے، عقل مندوں کے لیے نفع بخش ہے۔ پس جب یہ کتاب رحمٰن و رحیم کی جانب سے ہے تو جیسے

اس کی شان بے مثال ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) تو اس کا کلام بھی بے مثال ہے، وہ احکم الحاکمین اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے، تو اس کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہے، "كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ" عظمت قرآنی کی یہ بھی ایک دلیل ہے۔

نیز اس کی عظمت شان اس کے ناموں کی کثرت سے بھی ظاہر ہے۔ چناں چہ بعض علماء نے اسماءِ حسنیٰ کی طرح قرآنِ کریم کے بھی ننانوے نام بیان فرمائے، لیکن علامہ ابوالمعالیؒ نے کلامِ مقدس کے پچپن نام شمار کیے ہیں، اور فرمایا: "مشہور و مقبول نام قرآنِ کریم کے کل پانچ ہیں، جن میں تین کا ذکر اسی آیت میں ہے:

(۱) التنزیل۔ (۲) الکتاب۔ (۳) القرآن۔

اور دو کا دوسری جگہ، وہ یہ ہے:

(٤) الفرقان (الفرقان: ۱) (٥) الذکر۔ (الحجر: ۹)

پھر ان میں سب سے زیادہ مشہور نام قرآن ہے۔ شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے لکھا ہے کہ "حق تعالیٰ نے کم از کم ۶۱ مقامات پر اپنے کلامِ مقدس کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔" (مستفاد از علوم القرآن/ص: ۲۳)

قرآنِ کریم کے مقدس ناموں کی تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے صرف کلامِ الٰہی کے اسی نام یعنی لفظ "قرآن" ہی کو موضوعِ سخن بنایا جائے تو اس سے بھی اس کی بہت زیادہ عظمت ثابت ہوتی ہے۔

عظمت قرآن لفظ قرآن سے:

علماء محققین کے بیان کے مطابق لفظ "قرآن" کے ماخذ اشتقاق میں چار احتمالات ہیں:

ایک احتمال یہ ہے کہ:

(۱) "قرآن" دراصل "قَرَأَ يَقْرَأُ" سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنیٰ ہیں جمع کرنا،

ارشاد ہے:﴿إِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهُ وَقُرۡاٰنَهُ﴾ (القيامة : ۱۷)

''بلاشبہ اس کا جمع کرانا اور پڑھوانا ہمارے ہی ذمہ ہے۔'' کیوں کہ اس میں حروف وکلمات کو جمع کیا گیا ہے، اس اعتبار سے اسے قرآن کہتے ہیں کہ اس کے حروف جمع کیے گئے تو کلمات بنے، کلمات جمع کیے گئے تو آیتیں بنیں، آیات جمع کی گئیں تو سورت بنی، اور سورتیں باہم ملائی گئیں تو قرآن بن گیا۔

یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں سب کچھ جمع کیا گیا ہے، اس لیے اسے قرآن کہتے ہیں، اور اس میں شک ہی کیا ہے، خود رب العالمین کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيۡ كِتَابٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (الأنعام : ۵۹)

''کوئی تر اور خشک چیز ایسی نہیں ہے جس کا بیان اس واضح کتاب میں نہ ہو۔'' یعنی تمام علوم ومعارف اس میں جمع ہیں، بلکہ علم الاولین والآخرین کا سرچشمہ وگلدستہ قرآن ہی ہے، اس میں زبور کی طرح مجموعۂ مناجات بھی ہے، انجیل کی طرح ذخیرۂ امثال بھی، اور تورات کی طرح یہ گنجینۂ شریعت بھی ہے، اس میں عقائد وعبادات کا بیان بھی ہے، معاملات ومعاشرات کے احکام بھی ہیں، اخلاق واعمال کو سنوارنے والی باتیں بھی ہیں، معاشرتی وتجارتی اصولوں کی طرف رہنمائی بھی ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ طبیات وفلکیات کی جن حقیقتوں کی طرف اس قرآن نے اشارے کیے ہیں، آج علم وفن کے دور میں اس سے استفادہ اور افادہ کیے بغیر بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی اپنی تحقیقات اور ریسرچ آگے نہیں بڑھا سکتا، جب یہی بات ہے تو پھر ہمیں کہنے کا حق ہے۔

صاحبو! قرآن کے بغیر کوئی ایجوکیشن مکمل نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب بھی آج تک بیک وقت اتنے مختلف علوم ومضامین پر اتنی گہری معلومات فراہم نہ کرسکی ہے اور نہ کرسکتی ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایسی ہستی کا کلام ہے کہ جو انسان کی ضروریات اور نفسیات سے اس سے زیادہ واقف ہے جتنا خود انسان

واقف نہیں، یہ بھی قرآنِ کریم کے کلام الٰہی ہونے پر کھلا ثبوت ہے، لیکن اسے وہی سمجھتے ہیں جن میں عقل سلیم ہوتی ہے، اس لیے قرآن نے مختلف مقامات پر حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۲۱) "لاولی الاسباب" نہیں فرمایا، یعنی قرآنی حقائق کو عقلمند ہی سمجھتے ہیں، دولت مند نہیں۔ شاعر کہتا ہے:

جَمِيعُ الْعِلْمِ فِي الْقُرْآنِ، لٰكِنْ   تَقَاصَرَتْ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَالِ

قرآن میں سارے علوم موجود ہیں، مگر انہیں سمجھنا سب کے بس کی بات نہیں۔

عظمت قرآن، اس کی حقانیت سے:

دوسرا احتمال یہ ہے کہ:

(۲) قرآن "قرائن" سے مشتق ہے، اور "قرائن" یہ "قرينة" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ علامت اور دلیل کے ہیں۔ قرآنِ کریم کو اس معنی میں قرآن اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حقانیت وصداقت کی وجہ سے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ہے، اس کی سچائی اور اس کے کلام الٰہی ہونے کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، قرآن شک اور تردد کے روحانی مریضوں کو بہت پہلے چیلنج کر چکا کہ اگر تمہیں میرے منزل من اللہ ہونے اور کلام الٰہی ہونے میں کچھ شک ہے تو ایک ایسا دوسرا قرآن یا اس کے جیسی دس سورتیں یا کم از کم ایک سورت ہی لاؤ، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو صرف ایک آیت پیش کردو، مگر اس کا جواب نہ اس زمانہ کے عرب ادباء وشعراء دے سکے، نہ اس زمانہ کے معترضین ومستشرقین۔

روایات میں ایک عجیب وغریب واقعہ ملتا ہے کہ عرب کا ایک مشہور شاعر جو جماعتِ کفار سے تعلق رکھتا تھا وہ شہر کے شوروشر اور اس کی متعفن آب وہوا اور عام لوگوں کی ناخوش گوار صحبت سے بچنے کے لیے پہاڑ کے ایک غار میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگیا، کیونکہ یہ باتیں اس کے دل ودماغ پر برا اثر ڈالتی اور یکسوئی میں خلل انداز ہوتی تھیں، اس کے بہت

سے شاگرد تھے، جو اپنا اپنا کلام بغرضِ اصلاح اس غار کے اندر ڈال آتے، اور دوسرے روز وقت مقرر پر غار کے باہر سے اٹھالاتے، ایک روز ایک شاگرد نے قرآنِ کریم کی سورۂ کوثر کو اپنا کلام ظاہر کر کے اس کا چوتھا مصرع بنانے کی درخواست کی، ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ دوسرے روز جب اپنا پرچہ واپس لینے گیا، تو اس میں چوتھے مصرع کی جگہ یہ درج تھا کہ: ﴿لَيْسَ هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ یعنی یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔ (بلکہ انسانوں کے رب کا کلام ہے) (از مخزنِ اخلاق/ص: ۴۵۸)

عظمت قرآن اس کی قرأت سے :

تیسرا احتمال یہ ہے کہ:

(۳) قرآن "قراء ۃ" سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ہیں پڑھنا، اس لحاظ سے قرآن کے معنیٰ یا تو یہ ہیں کہ وہ کتاب جسے سب سے زیادہ پڑھا گیا، یا یہ کہ وہ کتاب جو پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم ہی وہ کتاب ہے جسے دنیا کی ساری کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا اور پڑھایا گیا، پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور قیامت تک پڑھا اور پڑھایا جاتا رہے گا، اور کہاں نہیں پڑھا اور پڑھایا گیا؟ دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں اسے پڑھا اور پڑھایا نہ گیا ہو! پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، اور کسی بھی موضوع سے متعلق کیوں نہ ہو، اور پڑھنے والا کیسا ہی باذوق کیوں نہ ہو، مگر وہ دو چار یا دس بیس دفعہ اس کتاب کو پڑھ کر اکتا جائے گا، لیکن عظمت قرآن دیکھئے کہ اسے ہزاروں دفعہ پڑھنے سے بھی روشن ضمیر کا دل نہیں اکتاتا، اس سے سیری نہیں ہوتی۔

ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہ نے فرمایا: "سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر لوگوں کے قلوب گناہوں کی وجہ سے زنگ آلود نہ ہوتے تو تلاوتِ کلام اللہ سے کبھی سیری نہ ہوتی۔" اور حقیقت یہ ہے کہ جب دنیا کی دیگر تمام کتابوں کا اس کتاب اللہ کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ایک غیر متعصب انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ واقعی یہی وہ کتاب

ہے جو پڑھنے کے قابل ہے، پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ قرآنِ کریم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس کا آغاز ہی لفظ ''اقــــرء''یعنی پڑھنے کے حکم سے ہوا، اورالحمدللہ! اہل قرآن وایمان اس پر ہمیشہ سے عمل کرتے چلے آئے ہیں۔

عظمت قرآن اس کی ہدایت سے:

چوتھا احتمال یہ ہے کہ:

(۴) قرآن ''قـــــــرن'' سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ہیں متصل اور ملا ہوا ہونا، اس اعتبار سے کلامِ خداوندی کو قرآن کہنے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

نمبر(۱) قرآنِ کریم میں مومنوں کا ذکر منکروں کے ساتھ، بشارت کی آیتیں انذار کی آیتوں کے ساتھ، عفو و درگذر اور وعدوں کا ذکر وعید وعذاب اور عقاب کے ساتھ، اوامر ونواہی کا ذکر قصص وامثال کے ساتھ اور دنیا کا ذکر عقبیٰ کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس بنا پر اسے قرآن کہتے ہیں۔

نمبر(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہدایت قرآن کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ہدایت اور کتابِ ہدایت (قرآن کریم) اس طرح متصل اور باہم لازم ملزوم ہیں کہ ان میں جدائی کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

صاحبو! جس طرح آفتاب ومہتاب نور سے، خوشبو پھول سے، جسم روح سے، بلندی آسمان سے، اور پستی زمین سے ملی ہوئی ہے، جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، ٹھیک اسی طرح ہدایت قرآن سے ملی ہوئی ہے، اسی لیے اسے کتابِ ہدایت بھی کہتے ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ شمس وقمر بے نور ہوسکتے ہیں، پھول خوشبو سے محروم ہوسکتے ہیں، روح جسم سے الگ ہوسکتی ہے، اور آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی بھی ختم ہوسکتی ہے، لیکن قرآن سے ہدایت الگ نہیں ہوسکتی، کیوں کہ قرآن خود کتاب ہدایت اور اس کے نزول کا مقصد ہی

ہدایت ہے، فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے رمضان جیسے عظیم الشان ماہ میں قرآن جیسی عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ اس موقع پر ایک اعتراض ہوسکتا ہے کہ قرآن کا مقصد نزول "هُدًی لِّلنَّاسِ" بتلایا، یعنی قرآن عام لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے، جب کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں فرمایا: "هُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ" جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن صرف متقیوں کے لیے درس ہدایت ہے، تو بظاہر دونوں میں تضاد ہو گیا؟ حالاں کہ بات یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کہ قرآن تو درسِ ہدایت سب ہی کو دیتا ہے، اس لیے کہ قرآن صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے، اس وجہ سے اس کی بارانِ ہدایت تو سب ہی پر برستی ہے، لیکن جس کے دل کی زمین ہی ویران اور بنجر ہے، جس کے دل میں خوفِ الٰہی اور تقویٰ ہی نہیں اسے اس ہدایت کی بارش سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔

بے عمل دل ہے اگر، تو جذبات سے کیا ہوتا ہے ☆ بنجر زمین ہے اگر، تو برسات سے کیا ہوتا ہے

پھر یہ بھی تو دیکھئے گا کہ قرآن نے "هُدًی لِّلنَّاسِ" فرمایا، اور حقیقی معنٰی میں انسان وہی ہیں جن کے دل میں تقویٰ اور خوفِ الٰہی ہو، اور جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے وہ الناس مین شامل ہی کب ہیں! وہ تو "كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ" ہیں، ورنہ جن کے دلوں کی زمین صاف تھی وہ قرآن سن کر ابوبکر صدیقؓ بن گئے اور مقبول ہو گئے، اور جن کے دلوں کی زمین بنجر تھی وہ ابوجہل زندیق بن کر محروم ہو گئے، ہمیشہ سے یہی ہوتا رہا ہے۔ ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْراً وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْراً﴾ (البقرة : ۲۶)

حق کے متلاشی اس سے ہدایت پاتے ہیں اور ضدی گمراہی۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حدیث مذکور کا پیغام:

اسی کو حدیث مذکور میں فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَاماً"، حق تعالیٰ کا

فیصلہ ہے کہ جو قوم اور امت خواہ وہ کسی رنگ و نسل، اور کسی بھی زبان اور زمان و مکان سے تعلق رکھتی ہو قرآنِ کریم کو اپنا رہبر و رہنما بنا کر اس کی ہدایتوں پر عمل کرے گی اور عظمت قرآن و حقوقِ قرآن کا لحاظ رکھ کر اپنے آپ کو اس کا تابعدار بنا دے گی، تو حق تعالیٰ اس کو دنیا و عقبیٰ کی سر بلندی سے سرفراز فرمائیں گے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ نے سلطان محمود غزنویؒ کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا، تو پوچھا: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟'' جواب دیا: ''قرآن کی عظمت میری مغفرت کا سبب بنی'' جس کا واقعہ یہ ہوا کہ ایک رات میں کسی قصبہ میں مہمان تھا، جس مکان میں میرا قیام تھا وہاں طاق پر قرآن شریف رکھا ہوا تھا، میں نے قرآن کی عظمت کے خاطر وہاں سونا پسند نہ کیا، دل میں خیال آیا کہ قرآن کو کسی دوسرے کمرہ میں رکھوا دوں، مگر ساتھ ہی مجھے یہ غیرت آئی کہ اپنے آرام کے خاطر قرآن کو دوسری جگہ رکھوا دوں اور خود یہاں آرام کروں، یہ قرآن کی عظمت اور ادب کے خلاف ہے، لہٰذا ایسا نہ کر کے پوری رات جاگتا رہا، میں نے اس رات قرآن مجید کے ساتھ جو عظمت اور ادب کا معاملہ کیا اس کے بدلے حق تعالیٰ نے میری مغفرت فرما دی۔'' (دلیل العارفین/ص:۲۲، از حکایتوں کا گلدستہ:۱۲۸)

اس کے برعکس جو قوم و ملت قرآن سے بغاوت کرے گی، اس کے فرمان سے اختلاف و انحراف کرے گی اور اس کے احکام سے سرتابی اور سرکشی کرے گی، تو حدیث پاک کے بیان کے مطابق ''وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ'' کا مصداق ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر بلندیوں کے آسمانوں پر بھی ہوگی تو نیچے گرا دی جائے گی، عروج سے زوال کی طرف پہنچا دی جائے گی۔ شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیمؒ فرماتے ہیں کہ ''قرآن تنکوں کو شہتیر بنا دیتا ہے، اور قرآن سے ہٹ کر شہتیر تنکے بن جاتے ہیں''۔ چناں چہ اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ قرآن کے متعلق نبی ﷺ کے اس فرمان کی گواہ ہے، اور حق تعالیٰ کے اس فیصلہ کی آئینہ دار ہے، ڈاکٹر اقبال اسی کو فرما گئے:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

یاد رکھو! جب جسم انسانی پر نفس کی حکومت ہوتی ہے، زندگی حیوانی بن جاتی ہے، لیکن جب جسم پر قرآن کی حکومت ہوتی ہے تو پھر زندگی ایمانی اور نورانی بن جاتی ہے، پھر دنیا میں جنت کا لطف آنے لگتا ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنے کلام سے حقیقی اور صحیح معنیٰ میں کامل ومکمل وابستگی نصیب فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۱۱)

نمازِ تراویح

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: "كَانَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يُرَغِّبُ فِیۡ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنۡ غَیۡرِ أَنۡ يَّاۡمُرَهُمۡ فِيۡهِ بِعَزِيۡمَةٍ، فَيَقُوۡلُ: "مَنۡ قَامَ رَمَضَانَ إِيۡمَاناً وَّ احۡتِسَاباً، غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِهٖ"، فَتُوُفِّيَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَالۡأَمۡرُ عَلىٰ ذَالِكَ، ثُمَّ كَانَ الۡأَمۡرُ عَلىٰ ذَالِكَ فِیۡ خِلَافَةِ أَبِیۡ بَكۡرٍ رضی اللہ عنہ، وَصَدۡراً مِنۡ خِلَافَةِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَلىٰ ذٰلِكَ." (رواه مسلم، مشكوٰة ص: ۱۱٤/ باب قيام شهر رمضان / الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں قیام (نمازِ تراویح) کی ترغیب دیا کرتے تھے، لیکن (آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشقت کے خوف سے تاکیداً اس کا حکم نہ فرماتے) ارشاد فرماتے تھے: "جس نے رمضان میں ایمان اور احتساب (اخلاص) کے ساتھ قیام کیا (نمازِ تراویح پڑھی) اس کے تمام گذشتہ گناہ (صغیرہ) معاف کردیے جائیں گے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا اور معاملہ یہیں تک رہا، پھر سیدنا صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت اور سیدنا فاروق اعظمؓ کے ابتدائی دورِ خلافت میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا۔

رمضان مولیٰ کی یاد کا خصوصی موسم:

دنیوی زندگی کے متعلق کتابِ ہدایت قرآن کریم نے جو وضاحت کی اس سے ایک ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی ضرور واقفیت رکھتا ہے کہ مقصد زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے، اور یوں تو یادِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے ہی ساری زندگی ہے، لیکن مولیٰ کی یاد کا مخصوص زمانہ، موقع اور موسم کہنا چاہیے کہ ماہِ رمضان ہے، علماءِ محققین نے فرمایا ہے کہ ''رمضان میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت کے دروازے کھول کر جہنم کے دروازے بند کر دیے جانے اور سرکش شیاطین کو قید کر دیے جانے کا حدیث میں جو ذکر ہے وہ اسی وجہ سے کہ رمضان جو یادِ الٰہی اور عبادتِ الٰہی کا خصوصی موسم اور زمانہ ہے، اس میں بندے بکثرت عبادت کرسکیں۔'' اور ہر مسلمان اس بات کا تجربہ کرسکتا ہے کہ جس قدر سہولت کے ساتھ رمضان میں مختلف عبادتیں انجام دی جاسکتی ہیں غیر رمضان میں وہ بات نہیں ہوتی، پھر عبادت کے اس مخصوص موسم میں اعمال کا ثواب بھی بہت زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے، نفلوں کا اجر وثواب فرضوں کے برابر، اور ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر دیا جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ/ص: ۱۷۳)

یعنی عام دنوں اور مہینوں میں تو ایک نیکی کا اجر کم از کم دس گنا دیا جاتا ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ١٦٠)

لیکن رمضان المبارک میں کی جانے والی ایک نیکی کا اجر وثواب ستر گنا زیادہ دیا جاتا ہے، اس کا حق اور تقاضا یہ ہے کہ اس میں اعمال کا انہماک بڑھ جائے، حدیث پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق منقول ہے کہ رمضان المبارک میں بہت ہی کثرت سے آپ ﷺ عبادت، تلاوت اور سخاوت فرمایا کرتے تھے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ، وَكَانَ أَجْوَدَ مَايَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ''. (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ١٨٣/ باب الاعتكاف/ الفصل الأول)

اس میں نبیوں اور سخیوں کے سردار، دو جہاں کے تاجدار، آقائے نامدار، جناب محمد

رسول اللہ ﷺ کا رمضان میں بکثرت اعمال اور مال میں سخاوت کرنے کا ذکر ہے۔ اعمال میں سخاوت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علم وعمل سے لوگوں کو خوب نفع پہنچاتے تھے، جہاں تک مالی اعتبار سے سخاوت کی بات ہے تو آپ ﷺ کا جذبۂ سخاوت اتنا تھا کہ ایک موقع پر فرمایا کہ ''اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہوتا تو مجھے یہ بات پسند تھی کہ میں تین دن کے اندر اندر ہی اس کو بانٹ دیتا، کچھ اس میں سے نہ رکھتا، مگر قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ رکھ دیتا۔'' (مشکوٰۃ /ص: ١٦٤ /باب الإنفاق و كراهية الإمساك/ الفصل الأول)

رہی بات عبادت کی، تو رمضان کے دن میں صیام اور دیگر فرائض ومعمولات کے بعد رات بھر اللہ تعالیٰ کے حضور قیام فرمایا کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات پیر مبارک پر ورم آجاتا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ /ص:۱۰۹) تب حق تعالیٰ نے بڑے پیار سے فرمادیا:

﴿ يَآيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (المزمل : ١)

پیارے! رات میں کچھ آرام بھی کر لیا کیجیے۔ کام اور قیام کے ساتھ آرام بھی ضروری ہے، یہ تیری خوشی ہے کہ تو میری عبادت میں رات بھر قیام کرکے اپنے کو تھکائے، مگر میری مرضی یہ ہے کہ تو ذرا آرام بھی کر لے۔

نمازِ تراویح کی فضیلت:

رحمت عالم ﷺ رمضان کی رات کے ابتدائی حصہ میں نمازِ عشاء کے بعد نمازِ تراویح کی بیس رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ (السنن الكبرىٰ /ص: ٢/٤٩٦ للبيهقى)

اور پھر آخری حصہ میں تہجد کی آٹھ رکعات کے بعد اخیر میں تین رکعات وتر پڑھتے تھے۔ (بخاری :ص:۱/۱۵۴) تراویح وتہجد کے علاوہ ہر رات حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن کا دور سناتے تھے۔

اس طرح تقریباً ساری رات یادِ الٰہی میں برضا ورغبت گذارا کرتے تھے، جیسا کہ

حدیث مذکور میں وارد ہے کہ رمضان میں عبادت ونماز کے لیے قیام آپ ﷺ کا بہت ہی مرغوب ومحبوب عمل تھا، چاہتے تھے کہ امت بھی ایسا کرے، لیکن اس خیال سے کہ کہیں امت مشقت میں نہ پڑ جائے آپ ﷺ قیامِ رمضان کا تاکیدی حکم نہ فرماتے، بلکہ ترغیبی انداز میں توجہ دلا کر فرماتے:

”مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّ احْتِسَابًا، غُفِرَلَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.“ (مشكوٰة شريف/ص:١١٤)

جس نے رمضان میں ایمان اور احتساب واخلاص کے ساتھ قیام کیا (نمازِ تروایح پڑھی) اس کے گذشتہ سارے گناہِ صغیرہ معاف کر دیے جائیں گے۔

حدیث میں قیامِ رمضان سے مراد نمازِ تراویح ہے، تہجد نہیں ہے، محدثین نے اسے ”قیامِ لیل“ سے بیان فرمایا ہے، ”قیامِ لیل“ اور ”قیامِ رمضان“ میں فرق ہے: ”قیامِ رمضان“ سے مراد ”نمازِ تراویح“ ہے، اور ”قیامِ لیل“ سے مراد ”نمازِ تہجد“ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ولی الدین محمد بن عبداللہ علامہ خطیب تبریزیؒ نے بھی اپنی کتاب مشکوٰۃ شریف میں تراویح اور تہجد کے لیے دو الگ الگ باب قائم فرمائے، تراویح کے لیے ”بَابُ قِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ“ (مشكوٰة شريف/ص:١١٤) قائم فرما کر اس میں ”نمازِ تراویح“ کو ذکر فرمایا، لہٰذا یہاں ”مَنْ قَامَ رَمَضَانَ“ سے مراد نمازِ تراویح ہے، اور ”إِيمَانًا وَّ احْتِسَابًا“ کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ تراویح کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت سمجھتے ہوئے خلوصِ نیت اور احسانی کیفیت کے ساتھ ادا کی جائے تو سارے گناہِ صغیرہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے نمازِ تراویح کی ترغیب وفضیلت بیان فرمائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت نضر بن شیبانؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کوئی ایسی فضیلت والی حدیث سناؤ! جس میں رمضان کا تذکرہ ہو، اس پر انہوں نے کہا: ”مجھ سے میرے والد (حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ) نے بیان فرمایا کہ ”رحمت عالم ﷺ نے رمضان المبارک کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وتعالىٰ فَرَضَ صِيامَ رَمَضَانَ عَلَيْكُمْ، وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهٗ، فَمَنْ صَامَهٗ وَقَامَهٗ إِيْمَاناً وَاحْتِسَاباً، خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهٗ.“

(نسائی /ج:۱/ ص: ۲۳۹)

کہ حق تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے ہیں، اور میں نے تمہارے واسطے (رمضان کی) نماز (تراویح) سنت قرار دی ہے، اب جو شخص بھی ان امور کو ایمان اور ثواب کی امید کے ساتھ بجالائے گا وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے گا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اس موقع پر یاد رہے کہ فقیہ النفس علامہ سعید احمد پالن پوری مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ”گناہ کے چار درجے ہیں:

۱- معصیۃ (نافرمانی) ۲- سیئۃ (برائی)

۳- خطیئۃ (غلطی) ۴- ذنوب (کوتاہی)

یہاں ”ذنب“ کا لفظ آیا ہے، (جو سب سے کم درجہ ہے، اور اس کے بعد خطیئۃ، پھر سیئۃ کے بعد معصیت ہے، اور ان میں صرف معصیت ہی کبیرہ ہوتی ہے، باقی سب صغائر ہیں۔ الکوثری/ص:۳۸/ ج:۱) پس معلوم ہوا کہ تراویح کی برکت سے ذنوب معاف ہوں گے، اس سے اوپر کے گناہ نہیں۔ (تحفۃ الالمعی/ ج:۳/ص:۴۹)

اور چوں کہ رمضان اور قرآن میں خصوصی تعلق بھی ہے، بقولِ علامہ سید عبدالمجید ندیم صاحبؒ ”رمضان اور قرآن میں روح اور جسم کا سا تعلق ہے“ اس لیے اس کا تقاضا یہ ہے کہ عام دنوں کے علاوہ رمضان میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھا اور سنایا جائے، جس کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ نمازِ تراویح ہے، کہ حفاظ کو قرآن پڑھنے اور سنانے اور غیر حفاظ کو سننے کا موقع ملتا ہے۔

نمازِ تراویح کا حکم:

اس کے علاوہ رمضان المبارک میں دن کی خصوصی عبادت صیام (روزے) ہیں، تو رات کی خصوصی عبادت قیام (نماز تراویح) ہے، دن کے صیام کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا، اور رات کے قیام کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے سنت قرار دیا، چناں چہ حدیث میں نمازِ تراویح کا حکم بیان کیا "جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً، وَ قِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا" (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ۱۷۳) کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس کے روزے کو فرض کیا اور اس کے قیام یعنی نمازِ تراویح کو سنت قرار دیا۔

حضرت شیخ الحدیث استاذ الاساتذہ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا ارشاد بھی خود حق سبحانہ وتقدس کی طرف سے ہے، پھر جن روایات میں نبی کریم ﷺ نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ میں نے اس کو سنت کیا، ان سے تاکید مراد ہے کہ حضور اکرم ﷺ تو (بذاتِ خود) اس کی تاکید بہت فرماتے تھے، اسی وجہ سے سب ائمہ اس کے سنت ہونے پر متفق ہیں۔ برہان میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں سے روافض کے سوا کوئی شخص اس کا منکر نہیں۔ حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے "ما ثبت بالسنۃ" میں بعض کتب فقہ سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی شہر کے لوگ نمازِ تراویح ترک کر دیں تو اس کے چھوڑنے پر امام ان سے مقابلہ کرے۔" (فضائل اعمال/ ص: ۵۶۷)

رکعاتِ تراویح کی تعداد:

بہر کیف! نمازِ تراویح کے مسنون ہونے پر علماءِ امت کا اتفاق ہے، البتہ تعداد میں اختلاف ہے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے نمازِ تراویح کی ترغیب تو دی، لیکن خود تعیین اور تفصیل بیان نہیں فرمائی، اور کبھی کبھی آپ ﷺ اپنے اس پسندیدہ اور مرغوب عمل کو امت کی آسانی کے خیال سے چھوڑ بھی دیتے، فرمایا کرتے:

"خَشِيتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمْ." (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ١١٤)

مجھے اندیشہ ہے کہ میری پابندی کی وجہ سے تم پر نمازِ تراویح فرض نہ کردی جائے، پھر کہیں اس کی ادائیگی سے قیامت تک کی امت مشقت میں نہ پڑ جائے، اس وجہ سے نمازِ تراویح کی تعداد میں ذرا اختلاف ہوگیا، جمہورِ امت کے صحابہؓ، صلحا، علماء اور فقہاء کے نزدیک نمازِ تراویح کی تعداد بیس رکعات ہے، اس سلسلہ میں ایک مرفوع روایت سے استدلال کیا گیا ہے، جس کی سند اس طرح ہے:

"حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُوْنَ قَالَ أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ عُثْمَانَ عَنْ حَكَمٍ عَنْ مِقْسَمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَالْوِتْرِ." (مصنف ابن أبى شيبة: ٢/٣٩٤، باب كم يصلى فى رمضان من ركعة)

حضرت یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ ہم سے حضرت ابراہیم بن عثمان نے حدیث بیان کی، اور وہ حکم سے روایت کرتے ہیں، اور حضرت حکم مقسم سے، اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ رمضان میں بیس رکعات (تراویح) اور وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور روایت کی سند میں بقول فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ ایک راوی ابراہیم بن عثمان ہیں، جن کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، اس لیے یہ روایت باعتبارِ سند ضعیف ہے، البتہ مختلف صحابہؓ سے بیس رکعات تراویح پڑھنا ثابت ہے، چناں چہ منقول ہے:

"كَانَ النَّاسُ يَقُوْمُوْنَ فِيْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ فِيْ رَمَضَانَ بِثَلَاثٍ وَّعِشْرِيْنَ رَكْعَةً." (مؤطا إمام مالكؒ مع زرقانى/ص: ١/٢٣٩)

حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں لوگ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح اور وتر ملا کر ۲۳ رکعتوں (یعنی ۲۰ تراویح اور تین وتر) کا اہتمام کرتے تھے۔ پس حدیث ابن عباسؓ پر صحابہؓ کے زمانے سے آج تک اسلامی دنیا کے طول وعرض میں ہمیشہ جمہورِ امت

مسلمہ کا ہر صدی میں عملی اتفاق رہا، اور اصولِ حدیث کے مطابق جو حدیث عملی تواتر کے درجہ کو پہنچی ہو اس کی سند سے بحث کرنا اصول کے خلاف ہے، لہٰذا مذکور حدیث ابن عباسؓ کی سند پر بحث کرنا فضول ہے۔

دوسری بات یہ کہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں بیس رکعت نمازِ تراویح کا معمول ایسے ہی نہیں ہو گیا تھا، بلکہ مزاج شناسِ رسول ﷺ "لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِيٌّ لَکَانَ عُمَرَ" (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۵۵۸) نے حضرات انصار ومہاجرین صحابہؓ کے مشورے سے اس مقدس ومرغوب عمل کو باضابطہ شکل دی، چوں کہ وحی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اب فرضیت کا خطرہ نہ تھا، پھر ہمیں اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اس فرمانِ رسالت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ." (رواہ أحمد و أبو داود، مشکوٰۃ/ ص: ۳۰)

تم پر میری اور میرے خلفاءِ راشدین المہدیین کی سنت پر عمل ضروری ہے۔ اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خلفاءِ راشدینؓ اور اصحابِ کرامؓ کی سنت بھی قابل اتباع ہے، یہ در اصل بالواسطہ حضور ﷺ کا ہی اتباع ہے، لہٰذا اس پر عمل کو بدعت نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے صحیح یہ ہے کہ بیس رکعات نمازِ تراویح مسنون ہے، اسی پر عہد صحابہ سے لے کر آج تک ہر زمانے میں عمل رہا، اور حرمین شریفین میں بھی اسی پر عمل ہوتا ہے، ظاہر بات ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، سلفِ صالحین اور اکابرِ امت ایک ایسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے جس کی کوئی اصل نہ ہو۔

جہاں تک آٹھ رکعات کی بات ہے تو اس کا تعلق تہجد سے ہے، پھر بیس رکعات میں بھی آٹھ رکعات تو داخل ہیں ہی، اس اعتبار سے اگر آٹھ رکعات والی روایت کو تہجد نہ مانا جائے تب بھی آٹھ والی روایت پر عمل تو ہو ہی جاتا ہے۔

نمازِ تراویح کی بیس رکعات:

علاوہ ازیں علامہ حلبیؒ نے بیس رکعات تراویح ہونے پر عجیب حکمت بیان فرمائی کہ سنتیں فرائض کو مکمل کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر فرائض کی ادائیگی میں کوئی کسر اور کمی رہ گئی تو اس کی تکمیل سنتوں کے ذریعہ کردی جائے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) اور مقرر کردہ دن رات کی فرض اور واجب نماز کی رکعات کی کل تعداد بیس ہوتی ہے: (فجر: دو۔ ظہر: چار۔ عصر: چار۔ مغرب: تین۔ عشاء: چار اور وتر: تین) اور نمازِ تراویح کی تعداد بھی بیس ہوتی ہے، اس لیے تکمیل کرنے والی اور مکمل ہونے والی نمازیں برابر ہوگئیں۔

(از: ''برکاتِ رمضان'' / ص: ۱۰۸)

پھر اس نکتہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیامت کے دن نمازِ تراویح کے متعلق یا تو بیس کا فیصلہ ہوگا یا آٹھ کا، اگر بالفرض آٹھ رکعات سنت ہونے کا فیصلہ ہوا تب بھی بیس رکعات نمازِ تراویح پڑھنے والوں کو آٹھ رکعات نمازِ تراویح کا ثواب تو مل ہی جائے گا، اور باقی کی بارہ رکعات نفع میں شمار ہوں گی، اب اگر فرائض میں کمی ہوگی تو ان نوافل سے اس کی تکمیل ہوجائے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

اس اعتبار سے بیس رکعات نمازِ تراویح پڑھنے والے تو نفع میں ہی رہیں گے، جب کہ آٹھ رکعات پڑھنے والے نقصان میں رہیں گے، کیوں کہ اگر میدانِ محشر میں بیس رکعات نمازِ تراویح سنت ہونے کا فیصلہ ہوگیا تو آٹھ والے باقی کی بارہ کہاں سے لائیں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ بیس کے مقابلہ میں آٹھ رکعات تراویح اس لیے بھی پسند کی جاتی ہے کہ اس میں سہولت پسندوں کے ذوق کا پورا سامان بھی موجود ہے، جلد فرصت ہوجاتی ہے، بقولِ شاعر:

کس قدر گراں تم پر رات کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

طبع آزاد پہ قید رمضان بھاری ہے
تم ہی کہہ دو! کیا یہی آئین وفاداری ہے؟

بیس رکعات والوں کو بکثرت ثواب دیا جائے گا:

صاحبو! رمضان المبارک جیسے مقدس اور عبادت والے مہینے اور موسم میں رحمت الٰہی کا سمندر پورے جوش میں ہوتا ہے، اس نادر فرصت اور موقع میں زیادہ سے زیادہ اعمال و عبادات کے لیے کوشش کرنی چاہیے، ورنہ یقیناً نقصان اور خسران ہوگا، لہٰذا نمازِ تراویح کے متعلق کم عدد پر اکتفا کر کے اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے استغناء نہ برتیں، کیوں کہ اتباعِ سنت کی نیت سے بیس رکعات نمازِ تراویح پڑھنے والے کو صرف ایک ماہ میں کم از کم بیالیس ہزار (۴۲۰۰۰) رکعات کا ثواب ملے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ (ان شاء اللہ)

اور آٹھ رکعات نمازِ تراویح پڑھنے کا ثواب سولہ ہزار آٹھ سو تک ہے، جب کہ قیامت کے دن ایک ایک نیکی نہایت قیمتی ہوگی، اس اعتبار سے بھی ہمیں زیادہ ثواب والی نماز اختیار کرنی چاہیے، خصوصاً جب کہ اس کا ثبوت بھی موجود ہو، جیسا کہ نمازِ تراویح کے لیے ثابت ہو چکا، اس لیے اسی میں زیادہ احتیاط اور اتباعِ سنت کا لحاظ ہے کہ نمازِ تراویح کی پوری بیس رکعات پڑھی جائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور توفیق عمل نصیب فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۱۲)

فضائلِ اعتکاف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ فِیۡ الۡمُعۡتَکِفِ: "هُوَ يَعۡتَكِفُ الذُّنُوۡبَ، وَيَجۡرِیۡ لَهٗ مِنَ الۡحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الۡحَسَنَاتِ كُلِّهَا." (رواه أبو داود وابن ماجه، مشکوٰۃ/ص: ۱۸۳/ باب الاعتکاف، الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ "وہ (اعتکاف کی وجہ سے) گناہوں سے بچا رہتا ہے، اور اس کے لیے نیکیاں جاری رہتی ہیں، ساری نیکیاں کرنے والے کی طرح (اس کے لیے نیکیاں اتنی لکھی جاتی ہیں جتنی کرنے والے کے لیے)

پریشانیوں کا صحیح حل رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ ہے:

آج کی دنیا اسباب و وسائل کی کثرت کے باوجود بے شمار مسائل میں مبتلا ہے، دنیا کا ہر باشندہ کسی نہ کسی فتنہ اور الجھن میں مبتلا اور مختلف مشکلات و مصائب میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے، پھر یہ حالات صرف افراد تک محدود نہیں، بلکہ افراد سے بڑھ کر سماج اور سوسائٹی، کومینٹی، حتیٰ کہ قومی اور ملکی سطح تک پھیلے ہوئے ہیں، غرض! مجموعی اور عمومی طور پر ہر انسان حیران و پریشان ہے، ان حالات اور حوادثات سے نجات کے لیے کیسے کیسے نسخے اور طریقے آزمائے

گئیے، مگراس کے باوجودان کا خاتمہ نہ ہوا، لیکن اگر دنیا کا مارا اور ستایا ہوا انسان قرآنی ہدایات پر عمل کر لے تو بالیقین ساری مشکلات ومصائب کا حل مل جائے گا، فرمایا: ﴿فَفِرُّوْٓا إِلَى اللّٰهِ﴾ (الذاریات: ۵۰) (لہٰذا دوڑ واللہ کی طرف)

لوگو! تمہاری مصیبتوں اور مشکلوں کا صحیح حل رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ میں موجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف آجاؤ، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف بلالے، اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو، اللہ سے مت بھاگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاؤ گے تو سکون سے دور ہو جاؤ گے، تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ سے کٹ گیا تو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہو جاؤ گے، کٹی ہوئی پتنگ ہوا کے تابع ہو جاتی ہے، تو تم بھی ہوائے نفس کے تابع ہو جاؤ گے، کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے اوباش لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں، اسی طرح تم پر بھی چاروں طرف سے بدمعاش لوگ ٹوٹ پڑیں گے، پھر تم چیخ چیخ کر کہو گے: ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۲۱٤) اللہ کی مدد کب آئے گی۔ تب بھی کوئی تمہاری فریاد سننے والا اور آنسو پوچھنے والا نہ ہوگا، اس کے برخلاف اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ سے تعلق درست کیا، تو ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چناں چہ افلاطون نے ایک مرتبہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے عجیب سوال کیا کہ زمین وآسمان کمان ہو جائیں، اور حوادثِ زمانہ تیر ہو جائیں، پھر اس کمان سے تیر چلانے والی ذات کوئی اور نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہو، تو نجات کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''بس، نجات کا راستہ ایک ہی ہے کہ تیر چلانے والے کی طرف رجوع کیا جائے۔''

(حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات/ص: ۹۸۰)

روایت میں ہے کہ جب قارون زمین میں دھنسنے لگا، اس وقت اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکارا، ان کی طرف رجوع کیا، اور اپنی قرابت کا واسطہ دیا، یہاں تک کہ ستر بار اس نے واسطہ دیا، لیکن شدتِ غضب کی وجہ سے آپ علیہ السلام نے اس کی طرف التفات نہ فرمایا، جب زمین نے اس کو نگل لیا، تو بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ

السلام پر وحی آئی: ''قسم ہے میری عزت اور عظمت کی! کہ وہ ایک بار بھی مجھے پکارتا اور میری طرف رجوع کرتا، تو میں اسے معاف کر دیتا۔'' (گلدستۂ تفاسیر/ص:۳۸۵/۵)

تعلق مع اللہ کے دو آسان طریقے:

اگر قارون جیسا سرکش بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتا تو حق تعالیٰ اسے معاف فرما کر نجات عطا کر دیتے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مصائب زمانہ سے نجات کا حقیقی راستہ اور مشکلات کا صحیح حل یہی ہے کہ رجوع الی اللہ کر کے تعلق مع اللہ پیدا کیا جائے، اس کے لیے یوں تو بہت سے طریقے ہیں، لیکن دو طریقے بہت آسان ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زبان یا دل سے باتیں کرنا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''ہر بات اللہ تعالیٰ سے کہنے کی عادت ڈالو، ان شاء اللہ! اس سے کچھ ہی دنوں میں اللہ تعالیٰ کے قرب کا دل میں احساس پیدا ہوگا اور تعلق مع اللہ نصیب ہوگا۔'' اس کے علاوہ دوسرا آسان طریقہ اور بہترین ذریعہ اعتکاف بھی ہے۔

اعتکاف کی حقیقت:

اعتکاف کی حقیقت اور روح رجوع الی اللہ ہی ہے، ویسے اس کے لغوی معنیٰ رک جانے اور تعظیماً بیٹھ جانے کے ہیں، لیکن شریعت اسلامی میں اعتکاف سے مراد کچھ دنوں کے لیے سب سے ہٹ کٹ کر رب کی طرف رجوع کرنا اور اس سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے اسی کے در پے یعنی مسجد کے کونے میں بیٹھ جانے کا نام اعتکاف ہے، اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ (البقرة: ۱۲۵)

اور ہم نے ابراہیم واسماعیل کو یہ تاکید کی کہ تم دونوں میرے گھر کو ان لوگوں کے لیے پاک کرو جو طواف کریں اور اعتکاف میں بیٹھیں، اور رکوع وسجدہ بجالائیں۔ اس سے

اعتکاف کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ عمل مفت کی عبادت ہے، کسی مخصوص عبادت پر بھی موقوف نہیں، حتیٰ کہ اگر اعتکاف کرنے والا دربارِ الٰہی میں حاضری دے کر سوتا رہتا ہے، تب بھی اس کو عبادت کا ثواب ملے گا، کیونکہ اس کے در پر پڑا رہنا بھی بڑی چیز ہے، جو مردود کو بھی مقبول بنا دیتی ہے، جیسے کسی شریر بچہ سے اس کی ماں ناراض ہوکر کبھی گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیتی ہے، تو وہ بچہ اولاً ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے، لیکن جب اسے کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تو پھر دوبارہ الٹے قدموں ماں کی طرف رجوع کرتا ہے، اور گھر کا دروازہ بند دیکھ کر اس امید پر کہ ماں جب دروازہ کھولے گی تو معافی مانگ کر اسے منالوں گا، وہیں بیٹھ جاتا ہے، اس حالت میں اگر نیند کا غلبہ بھی ہو جائے تو اسی دہلیز پر سر رکھ کر سو جاتا ہے، دوسری طرف ماں کو پتہ چلتا ہے تو اس کا دل موم ہو جاتا ہے، اور وہ فوراً دروازہ کھول کر اپنے بچہ کو آغوشِ محبت میں لے لیتی ہے، بالکل یہی معاملہ ہوتا ہے معتکف کے ساتھ، کہ در در کی ٹھوکریں کھا کر مصیبتوں کا مارا ہوا انسان سب سے مایوس ہوکر رب کی طرف رجوع کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اسی کے در پر آتا ہے، اور اس کو منانے اور اس سے تعلق درست کرنے کی نیت سے اسی کی چوکھٹ پر ڈیرا ڈال دیتا ہے کہ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت، یہی آرزو ہے

تو ربِ کریم جس کا دروازہ کبھی کسی کے لیے بند نہیں ہوتا، اور جو ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے، وہ فوراً اپنے بندہ کو آغوشِ رحمت میں لے لیتا ہے، حدیث قدسی میں اللہ رب العزت کا پاک ارشاد ہے:

”مَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ شِبْراً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعاً، وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعاً، وَمَنْ أَتَانِیْ یَمْشِیْ أَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ ص: ۱۹۶/ حدیث قدسی نمبر: ۳)

ترجمہ: جو شخص میری طرف (میری اطاعت کے ساتھ) ایک بالشت متوجہ ہوتا

ہے تو میں اس کی طرف (اپنی رحمت کے ساتھ) ایک ہاتھ متوجہ ہوتا ہوں، اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں، پھر اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ سبحان اللہ۔

مطلب یہ ہے کہ بندہ جس درجہ اللہ تعالیٰ کی طرف (گناہوں سے توبہ اور پھر اس کے احکام کی ادائیگی کے ذریعہ) رجوع کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ توجہ اور تلطف اللہ جل شانہ کی طرف سے اس بندہ پر ہوتا ہے، اعتکاف کرنے والا بھی سب کو چھوڑ کر رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اس عالم دنیا میں اللہ رب العزت سے جس قدر قرب ممکن ہوتا ہے اتنا قریب ہو جاتا ہے، تو اندازہ لگایئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کتنے قریب ہوں گے؟ یہ لوگ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خٰشِعِينَ﴾ (الأنبياء: ۹۰)

یقیناً یہ سب لوگ بھلے کاموں میں دوڑ کر چلتے تھے اور ہم کو امید و خوف میں بڑے شوق سے دعاؤں میں پکارتے رہتے تھے اور ہماری محبت و خوف میں ان کے دل پگھل اور جھک جاتے تھے۔

اعتکاف میں شانِ عبدیت:

اسی وجہ سے مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

از ہمہ می بُر، بدُو پیوند کن
بر درِ یک یار خود را بند کن

یعنی سب سے کٹ جا، اس (رب) سے جڑ جا، ایک یار (رب) کے در پر اپنے آپ کو پابند بنالے۔ یہی عبدیت ہے، جو اعتکاف کی خصوصی شان ہے، کہ اور لوگ تو کھانے کمانے اور سیر و تفریح میں مشغول ہیں اور معتکف مولیٰ کی یاد میں مشغول اور منہمک ہے،

اوراسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے، جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، یہی وجہ ہے کہ رحمت عالم ﷺ اعتکاف کا بہت کثرت سے اہتمام فرماتے تھے، ہر سال رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا آپ ﷺ اہتمام فرماتے: ”وَكَانَ يَعْتَكِفُ كُلَّ عَامٍ عَشْراً.“ (بخاری، مشکوٰۃ/ص:۱۸۳) بلکہ رحمت عالم ﷺ ہی نے سب سے پہلے غارِ حرا میں اعتکاف فرما کر رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ کی اساس قائم فرمائی، بقولِ محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ”نزولِ قرآن سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مبارکہ میں سب سے یکسو اور الگ ہو کر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر کا مخلصانہ جذبہ پیدا ہوا تھا، جس کے نتیجہ میں مسلسل کئی مہینے غارِ حرا میں خلوت گزینی فرماتے رہے، یہ گویا آپ ﷺ کا پہلا اعتکاف تھا، اور اس اعتکاف ہی میں آپ ﷺ کی روحانیت اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ آپ ﷺ پر قرآن مجید کا نزول شروع ہو جائے۔

چناں چہ حرا کے اس اعتکاف کے آخری ایام ہی میں اللہ رب العزت کے حاملِ وحی فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں لے کر نازل ہوئے، تحقیق یہ ہے کہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ اور اس کا آخری عشرہ تھا اور وہ رات شب قدر کی تھی، اس لیے بھی اعتکاف کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا انتخاب کیا گیا۔“

(معارف الحدیث/ص:۱۱۸/۴)

اعتکاف کا مقصد:

رمضان المبارک کے پہلے دو عشروں میں تو روزے کے ذریعہ انسان کے نفس کو اعتدال پر لا کر اسے شریعت کے تقاضے پورا کرنے کے لائق بنایا تھا، اب جب اس نے اس طریقہ پر بیس دن گذار دیے، اور گویا روحانی دوا کا ایک نصاب (کورس) پورا ہو گیا، تو خدائے پاک نے چاہا کہ میرا بندہ میرے سوا تمام مخلوقات سے غیر ضروری میل جول ترک کر کے میرے ہی در پر آ پڑے اور میرے سوا اس کو کسی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رہے، روزہ میں محبوبہ

بیوی کوصرف دن میں چھڑایا تھا، جب بندہ اس میں پورا اترا، تو اب دن رات اس سے الگ کر کے اس کی تمام تنہائیاں اپنے لیے مخصوص کرلیں، اور فرمادیا کہ کھانا، پینا، لیٹنا اور سونا سب ہمارے ہی در پر کرو، اور ہماری جو (عبادات اور) یاد اب تک دنیا کے کام دھندھوں میں لگ کر کرتے تھے، اب ان سب سے الگ تھلگ ہمارے گھر (مسجد) ہی میں ہوا کرے گی، تا کہ دنیا کے گندے ماحول سے یکسو ہو کر دل و دماغ میں ہماری محبت خوب رچ بس جائے، اور تمہارے دل کی دنیا پر اب حکومت رہے تو صرف ایک اللہ واحد اور قہار کی۔

(رمضان کیا ہے/ص:۱۴۰، مسائل اعتکاف /ص:۹)

صاحبو! اعتکاف کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ بندہ میں رجوع الی اللہ سے اللہ تعالیٰ کی کامل محبت پیدا ہو جائے، اور جب تک بندہ میں عبدیت اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہ ہو اعتکاف آسان نہیں ہوتا، اور جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ ہوتا ہے ان کا حال اس سلسلہ میں بھی قابل رشک ہوتا ہے۔

چناں چہ محمد بن سرینؒ کی بہن سیدہ حفصہ بنت سرینؒ کے متعلق منقول ہے، حضرت پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''انہوں نے گھر میں مسجد بنائی تھی، اور زندگی کے ۳۵ سال اس حال میں گذارے کہ قضاءِ حاجت کے لیے گھر کی مسجد سے باہر نکلتیں اور بقیہ وقت اعتکاف کی نیت سے گھر کی مسجد میں گذار دیتیں۔

(نماز کے اسرار و رموز/ص:۷۷)

ان کی چاہت یہی ہوتی تھی کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے دن رات
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اعتکاف خلوت وجلوت کا حسین امتزاج:

پھر اعتکاف کی روح اور اس کی حقیقت میں اگر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ

اعتکاف ایک ایسی نرالی عبادت ہے جو خلوت وجلوت دونوں پر مشتمل اور دونوں کو جامع ہے، اعتکاف خلوت وجلوت کا ایک عجیب وغریب اور حسین امتزاج ہے، نماز میں پانچ اوقات میں تو جلوت ہے، کہ مسجد میں آنے والے نیک نمازی سے ملاقات ہوتی ہے، باہر جا کر کسی سے ملنے کی تو اجازت نہیں، لیکن مسجد میں جو نیک لوگ آئیں ان سے ملنے اور ضروری بات چیت کرنے کی اجازت ہے، کیوں کہ بیہودہ لوگ تو مسجد میں آئیں گے نہیں، جن کی صحبت مضر ہو، ہمیشہ نمازی اور متقی لوگوں ہی سے سابقہ پڑے گا، ان ہی سے میل جول اور بات چیت ہوگی جن کی صحبت بھی مفید ہے، حدیث ہے کہ "اَلْجَلِیْسُ الصَّالِحُ خَیْرٌ مِنَ الْوَحْدَۃِ" نیک ہم نشین گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔ تو اعتکاف میں نماز کے وقت جلوت اور نیک صحبت میسر ہوتی ہے، اور باقی اوقات میں اغیار سے خلوت ہوتی ہے، اور خلوت مع الحق مفید ہے، جیسا کہ اسی حدیث کے شروع میں فرمایا گیا: "اَلْوَحْدَۃُ خَیْرٌ مِّنْ جَلِیْسِ السُّوْءِ". (مشکوٰۃ/ص:۴۱۴)

"وحدت اور خلوت بری صحبت سے بہتر ہے"۔ پھر اعتکاف میں خلوت کہاں ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کے گھر میں! اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگی، جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، اس خلوت سے تین چیزیں نصیب ہوں گی: (۱) گناہوں سے حفاظت۔ (۲) روحانی قوت (۳) ہر لمحہ کی عبادت۔

اعتکاف کی فضیلت:

حدیث مذکور میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے، فرمایا: "ھُوَ یَعْتَکِفُ الذُّنُوْبَ" معتکف کی اس وقت معاصی سے حفاظت ہوتی ہے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قلعہ میں محفوظ و مامون ہوتا ہے، جہاں تک اس کے ازلی دشمن شیطان کی رسائی نہیں ہوتی، اس لیے بھی گناہوں سے حفاظت ہوتی ہے۔ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے تھے: "جس نے کوئی دن گناہوں کے بغیر گذارا وہ دن اس کے حق میں ایسا ہے جیسے اس نے نبی کی صحبت میں وہ دن گذارا۔" یعنی جتنا مبارک دن وہ ہے جو نبی کی صحبت میں گذارا ہوا تنا ہی وہ دن بھی مبارک

ہے جو گناہوں کے بغیر گذارا ہو، اور پھر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں روحانی قوت خود بخود نصیب ہو جاتی ہے، جس سے عبادت اور اعمالِ صالحہ کا شوق اور پاکیزہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس وجہ سے علماء نے فرمایا کہ اعتکاف سے بھی روزے کی طرح تقویٰ کی تربیت ہوتی ہے، کیوں کہ قرآنِ مجید میں جس طرح روزے کی فرضیت کی آیت: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۸۳) (تا کہ تم متقی بن جاؤ۔) پر ختم ہوتی ہے، اسی طرح اعتکاف کے آداب کی آیت بھی ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۸۷) (تا کہ وہ متقی بن جائیں) پر ہی ختم ہوتی ہے۔

دوسری بات ارشاد فرمائی: "وَيَجْرِىْ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا" جب بندہ اعتکاف کی نیت سے اپنے آپ کو مسجد میں مقید و محبوس کر لیتا ہے اور اعتکاف کے ذریعہ رجوع الی اللہ کرتا ہے، تو اگر چہ وہ بہت سے اعمالِ صالحہ و عباداتِ حسنہ کے راستہ سے تعلق مع اللہ پیدا کر کے اپنی نیکیوں میں اضافہ ہی کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض بڑی بڑی نیکیوں اور عبادتوں کے ادا کرنے کا اسے موقع نہیں ملتا، مثلاً اعتکاف کرنے والا بیماروں کی عیادت اور خدمت نہیں کر سکتا، جو بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے، کسی لاچار مسکین اور بیوہ و یتیم کی براہِ راست مدد و نصرت نہیں کر سکتا، جو بہت عظیم نیکی ہے، کسی میت کو غسل نہیں دے سکتا، جو اگر خلوصِ نیت کے ساتھ ہو تو بہت بڑے اجر کا کام ہے، اسی طرح نمازِ جنازہ کی شرکت کے لیے نہیں نکل سکتا، نیز میت کے ساتھ قبرستان نہیں جا سکتا، جس کے ایک ایک قدم پر ایک گناہ کی معافی اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے، یہ اور اس قسم کی جو نیکیاں معتکف انجام نہیں دے سکتا، اس حدیث شریف میں بشارت ہے کہ اعتکاف کرنے والے کو ان تمام نیکیوں کا ثواب بغیر کیے ہوئے بھی مفت مل جاتا ہے، اس کے صحیفۂ اعمال میں اللہ رب العزت کے حکم سے وہ سب نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جو اعتکاف کی وجہ سے کر نہ سکا، جب کہ وہ ان کا عادی تھا۔ اللہ اکبر کبیرا۔

کیا نصیب ہے معتکف کا! اس اعتکاف کی ایک عبادت پر کئی عبادتوں، بھلائیوں

اور نیکیوں کا ثواب مل رہا ہے، پھر جب یہ ثابت ہو گیا کہ معتکف کا ہر لمحہ عبادت ہے، تو ظاہر ہے کہ عشرۂ اخیرہ میں آنے والی شبِ قدر بھی عبادت کی حالت میں گذرے گی، جس کی فضیلت مستقل قرآن وحدیث میں آئی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اعتکاف کے فضائل ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے:

" اِعْتِکَافُ عَشْرٍ فِیْ رَمَضَانَ کَحَجَّتَیْنِ وَ عُمْرَتَیْنِ." (الترغیب/ص: ۱٤۹/۲)

رمضان کے اخیری عشرہ کا اعتکاف اجر وثواب کے اعتبار سے دو حج اور دو عمروں کے برابر ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت سے اعتکاف کیا جائے تو یہ عظیم الشان عبادت ہے، اس کے بے شمار فوائد اور فضائل ہیں، یہ رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ کا بہترین ذریعہ ہے۔

علاوہ ازیں ماہِ رمضان المبارک کے متبرک ومسعود اوقات کی قدر وعظمت بھی اعتکاف کے بغیر کامل طور پر نہیں ہو سکتی۔ پس ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کریں، اسی کے در پے سر جھکائیں، کہ:

سر جس در پہ نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

حق تعالیٰ ہمیں رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ نصیب فرما کر اپنا بنا لے، اپنے دین کے کاموں میں لگا لے، اور نفس وشیطان کے شر سے بچا لے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلّٰی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَا ھُوَ أَھْلُہٗ.

☆......☆......☆

(۱۳)

شبِ قدر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ عـائِشَةَ ؓ قَـالَـتۡ: قُـلۡتُ: " يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ! أَ رَأَيۡتَ إِنۡ عَلِمۡتُأَيَّ لَيۡلَةٍ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ مَا أَقُوۡلُ فِيۡهَا ؟ قَالَ: " قُوۡلِيۡ: "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الۡعَفۡوَ، فَاعۡفُ عَنِّيۡ."

(رواه أحمد و ابن ماجه و الترمذی، مشكوٰة/ص:١٨٢/ باب ليلة القدر، الفصل الثانی)

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، فرماتی ہیں کہ "میں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! اگر مجھے شبِ قدر کا (علامات کے ذریعہ) پتہ چل جائے تو کیا دعا مانگوں؟ اس پر حضور ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی: "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الۡعَفۡوَ، فَاعۡفُ عَنِّيۡ." جس کا ترجمہ یہ ہے: "اے اللہ! بے شک تو معاف کرنے والا ہے، اور پسند کرتا ہے معاف کرنے کو، پس معاف فرمادے مجھے بھی۔

شبِ قدر انسانیت کے لیے شبِ نجات ہے:

شب قدر کیا ہے؟ یہ دراصل ربِ کریم کی جانب سے انسانیت کے لیے مغفرت و نجات کی ایک عظیم الشان مبارک یادگار اور جلیل القدر رات ہے، کیوں کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب دنیا ضلالت وظلمت اور جہالت ومعصیت کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، سارا انسانی معاشرہ تباہی و بربادی کے قریب پہنچ چکا تھا، تب اللہ رب العزت نے پھر ایک بار

شبِ قدر میں انسانیت پر نظر رحمت فرمائی، پھر دوبارہ اس کی رحمت کی گھٹائیں تمام عالم کے افق پر چھائیں، اس کا ابر کرم ''حرا'' کی سمت اترا، رحمت عالم ﷺ پر سب سے پہلی وحی، پیغامِ الٰہی اور کلامِ ربانی کا نزول ہوا، جس میں تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی،: فرمایا: ﴿اِقْــرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ (العلق : ۱)

اس لیے کہ جب علم کی شمع روشن ہوگی تو خود بخود ضلالت کا فور اور ظلمت دور ہوجائے گی، جہالت ختم ہوگی اور معصیت کے پردے چاک ہوجائیں گے، انسانیت کو امن اور سلامتی، سکونِ زندگی، احترام انسانیت، حقوقِ باہمی اور اخوت، محبت و بھائی چارگی کی گراں قدر نعمت نصیب ہوگی، اور ایسا ہی ہوا، جس کی تصدیق تاریخ اسلام سے ہوتی ہے، الغرض! انسانیت کی نجات وعافیت کا یہ عظیم الشان واقعہ نزولِ قرآن کی شکل میں رمضان کی شب قدر میں پیش آیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

قرآن کا نزول رمضان میں ہوا۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر : ۱)

''ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اس رات میں اتارا گیا، پھر وہاں سے حسب ضرورت قلب اطہر پر تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال میں نازل ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر سب سے پہلے قرآن کا نزول شب قدر میں ہوا۔ اس اعتبار سے شب قدر اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے جس میں انسانیت کو اوہام اور بت پرستی کی ذلت وغلامی نیز ظلم و زیادتی اور جہل وگمراہی سے نجات ملی، اس اعتبار سے شب قدر انسانیت کے لیے شب نجات تھی اور ہے، بشرطیکہ اس کی فضیلت سے شریعت کے دائرہ میں رہ کر فائدہ اٹھایا جائے۔

شب قدر کی قدر و منزلت :

شب قدر نہایت ہی عظیم رات ہے، اس کی عظمت وفضیلت اور قدر و منزلت بڑھانے کے لیے حق تعالیٰ نے اس کے نام کی مستقل ایک سورت قرآن میں نازل فرمائی، جس میں اس کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے اسے ہزاروں مہینوں سے افضل فرمایا، یہی وجہ ہے کہ خود رحمت عالم ﷺ بھی اس شب میں خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے بیدار رہتے، اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے، تاکہ اس کی فضیلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ (مشکوٰۃ/ص:۱۸۲)

مزید شب قدر کی قدر و منزلت کو بیان کرتے ہوئے امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''حق تعالیٰ نے سال بھر کے انوارات رمضان میں جمع کر دیے، اور ان تمام انوارات اور برکات کا جو ہر عشرۂ اخیرہ میں رکھ دیا، پھر اس کا لب لباب، خلاصہ اور عطر شب قدر میں ودیعت کر دیا''۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہماری قدر و منزلت بڑھانے کے لیے شبِ قدر محض اپنی رحمت سے ہمیں عطا فرمائی، ورنہ ہم اس قابل کہاں؟ (گلدستۂ تفاسیر/ص:۶۷۳/ ۷)

میں ہی کم بخت غافل تھا، تو مجھ سے غافل نہ تھا
تو نے مجھ کو وہ سب دیا جس کے میں قابل نہ تھا

اگر ہم قدر کر لیں تو واقعہ یہ ہے کہ اس ایک رات میں عبادتِ خداوندی کے ذریعہ ہم قربِ الٰہی کی اتنی منزلیں اور مسافتیں طے کر سکتے ہیں کہ دوسری ہزاروں راتوں میں بھی طے نہیں ہو سکتیں، جس طرح تیز رفتار سواری (ہوائی جہاز یا راکٹ) کے ذریعہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کی جاتی ہے کہ پرانے زمانے کی دوسری سواریوں سے مہینوں میں بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

اسی لیے ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''شبِ قدر کی جو بھی قدر

کرے گا وہ صاحب قدر ہو جائے گا۔“ غرض شب قدر کی بڑی قدر و منزلت ہے، شاید اس کی عظمت اور قدر و منزلت ہی کی وجہ سے اسے ایک راز بنا کر رکھا ہے، جیسے اسم اعظم کو اس کی عظمت کی وجہ سے ایک راز بنا کر رکھا ہے۔ یا پھر اس لیے تا کہ لوگ ایک ہی رات پر تکیہ و بھروسہ نہ کرلیں، بلکہ اس کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ پھر جتنی راتیں طلب اور جستجو میں خرچ ہوں گی ان کا مستقل ثواب علیحدہ ملے گا، اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

”عَسٰی أَنْ یَّکُوْنَ خَیْراً لَّکُمْ.“ (بخاری، مشکوٰۃ/ص:۱۸۲)

شاید شب قدر کی پوشیدگی تمہارے لیے بہتر ہو۔

۲۷/ رمضان کو شب قدر کی تلاش:

ویسے شب قدر کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ۴۸ اقوال نقل فرمائے ہیں، جن میں قریب قریب یہ بات متفق علیہ ہے کہ شب قدر کی یقینی اور متعین تاریخ کسی کو معلوم نہیں، اس لیے یہ اقوال اندازہ اور تخمین کا درجہ رکھتے ہیں، اکثر اہل علم کا حدیث کے مطابق خیال یہی ہے کہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں شب قدر واقع ہوتی ہے، اور زیادہ رجحان ۲۷ کا ہے، کیوں کہ متعدد روایتیں اس سلسلہ میں موجود ہیں، مثلاً مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے قسم کھائی (ظن غالب کی بنیاد پر) کہ ”بلا شبہ شب قدر ستائیسویں رات میں ہے۔“ (مشکوٰۃ/ص:۱۸۲)

تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک عجیب لطیفہ شب قدر کی تعیین کے متعلق نقل فرمایا ہے کہ سیدنا فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ کبار صحابہؓ سے سوال کیا کہ ”شب قدر رمضان کی کونسی تاریخ میں ہے؟“ سب نے کہا: ”واللہ اعلم“، یعنی کوئی تعیین بیان نہیں کی، مجمع میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے، جو سب میں چھوٹے تھے، ان سے کہا گیا: ”تم کیا کہتے ہو؟“ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: ”امیر المومنین! میں نے شب قدر معلوم کرنے کے لیے سات کے عدد میں غور کیا، تو وہ عدد اس کے لیے زیادہ موزوں نظر آیا، اس

لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سات پیدا کیے، زمینیں سات پیدا کیں، طوافِ خانۂ کعبہ کے چکر سات، سعی میں صفاومروہ کے چکر سات، رمی جمرات بھی سات، قرآن کی قرائتیں سات، منزلیں سات، سجدہ کے اعضاء سات، انسان کی تخلیق کے درجات سات، سب سے پہلے: سُلاَ لَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، گیلی مٹی۔ دوسرا درجہ: نُطْفَةً، تیسرا: عَلَقَةً، چوتھا: مُضْغَةً، پانچواں: عِظَام، چھٹا: لَحْمًا. ساتواں درجہ تکمیل کا ہے۔ (سورۃ المومنون/ص:۱۸)

انسان کی غذا سات چیزیں ہیں: سب سے پہلے: حَبًّا عِنَبًا، قَضْبًا، زَيْتُوْنًا، نَخْلاً، حَدَآئِقَ غُلْبًا، فَاكِهَةً أَبًّا. (اس میں آٹھ چیزیں مذکور ہیں، جن میں پہلی سات چیزیں انسان کی غذا اور آخری یعنی "أَبًّا" یہ جانور کی غذا ہے)۔ (قرطبی)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ''اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر چیزوں کو اللہ رب العزت نے سات کے حساب سے بنایا، اب اگر شب قدر بھی رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہے تو بیانِ مذکور سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ شب قدر ستائیسویں شب کو ہوگی۔''

پھر قرآنِ کریم کی سورۂ قدر میں ﴿سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (القدر: ۵) میں "هِيَ" کا لفظ بھی ستائیس حروف کے بعد آتا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ شب قدر ستائیس رمضان کو ہوتی ہے۔ (معارف القرآن/ص:۳۰۲/۶ ومسائل شب برات وشب قدر/ص:۱۰۶)

بہرحال! احتمال بلکہ غالب گمان تو ستائیس کا ہے، لیکن اس کے علاوہ جن راتوں کا ذکر ہے ان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جو بھی شب قدر کے گمان سے شب بیداری کرے گا تو "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کے تحت ان شاء اللہ شب قدر کا ثواب پائے گا۔'' (احکامِ اعتکاف/ص:۶۲)

شبِ قدر کی دعا:

شب قدر کے متعلق حدیث مذکور میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور ﷺ

سے دریافت کیا: ''یارسول اللہ! اگر مجھے علامات کے ذریعہ شب قدر کا پتہ چل جائے تو کیا دعا مانگوں؟'' غور کیجئے! کتنا پیارا سوال ہے۔

حدیث میں ہے کہ "حُسْنُ السُّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ." (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ/ص: ۴۳۰) حسن سوال آدھا علم ہے، کیوں کہ مطلق سوال کرنا آسان ہے، کوئی بھی کرسکتا ہے، اس کے لیے آدھے علم کی ضرورت نہیں، البتہ بہترین سوال وہی کرسکتا ہے جو مسئلہ کا فی الجملہ علم رکھتا ہو۔

غرض جب ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی: "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الْعَفُوَ، فَاعْفُ عَنِّيْ." یہ نہایت ہی جامع اور مفید دعا ہے، دنیا وعقبیٰ کی ساری بھلائیوں اور مطالب خیر پر حاوی اور مشتمل ہے، اس میں دنیا کے لیے عافیت اور آخرت کے لیے مغفرت طلب کی گئی ہے، کیوں کہ شب قدر دراصل شب عافیت وشب مغفرت ہے، اس لیے دعا بھی ایسی تلقین فرمائی جس میں عافیت اور مغفرت کا سوال ہے، حدیث میں ہے:

"مَا سَأَلَ اللّٰهَ الْعِبادُ شَيْئاً أَفْضَلَ مِنْ أَنْ يَّغْفِرَ لَهُمْ وَيُعَافِيَهُمْ." (رواہ زرین، از: مرقاۃ/ص: ۴/۳۲۱)

بندوں نے اللہ جل شانہ سے عافیت اور مغفرت سے زیادہ افضل وبہتر کوئی سوال نہیں کیا۔ اور دعاءِ شب قدر میں یہی تو سوال کیا جاتا ہے، چناں چہ حضرت حکیم العصر مولانا شاہ حکیم اختر صاحبؒ نے اس کی توضیح اس طرح فرمائی کہ ''اس دعا میں پہلے تو حضور صلی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور ثنا بیان فرمائی، کیوں کہ "ثَنَاءُ الْكَرِيْمِ دُعَاءٌ" کریم کی تعریف کرنا اس سے مانگنا ہے، اور جو چیز کریم سے لینی ہوتی ہے تعریف اسی صفت سے کی جاتی ہے، حضور ﷺ اپنی امت کو معافی دلوانا چاہتے تھے، اس لیے صفت عفو کا واسطہ دیا کہ "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، أَيْ: إِنَّكَ أَنْتَ كَثِيْرُ الْعَفُوِ" یعنی اے رب کریم! آپ تو بہت ہی زیادہ معاف کرنے

والے ہیں، اور بعض روایات میں لفظ "کَرِیْمٌ" کا اضافہ بھی ہے، اور "کَرِیْمٌ" اس لیے فرمایا تاکہ امت کے گنہگار بندے بھی محروم نہ رہیں، اس لیے کہ "کَرِیْمٌ" کے معنیٰ ہیں: "اَلَّذِیُ یُعُطِیُ بِدُوُنِ الْاِسُتِحُقَاقِ وِالُمِنَّةِ" کریم وہ ذات ہے جو نالائق پر بھی کرم فرمائے، اگرچہ وہ مستحق نہ ہو، اور "تُحِبُّ الْعَفُوَ" کے معنیٰ ہیں: "أَنُتَ تُحِبُّ ظُهُوُرَصِفَةِ الْعَفُوِ عَلٰى عِبَادِكَ" رب کریم! اپنے بندوں کو معاف کرنا یہ آپ کا بہت ہی زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل ہے، تو بس اب آپ اپنا محبوب عمل ہم گنہگاروں پر جاری فرما کر ہمیں معاف فرما دیجیے۔"

(از: "مواہب ربانیہ" /ص:۹۰)

مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اے محبّ عفو! از ما عفو کن
اے طبیب رنج ناسورِ کہن!

اے عافیت اور مغفرت کو محبوب رکھنے والے رب کریم! ہماری خطاؤں کو معاف فرما، اور اے پرانے رنج کے ناسور (بہتا ہوا زخم) کے طبیب! ہمارے تمام امراضِ رذیلہ کو معاف فرما کر ہمیں شفا عطا فرما۔ الغرض! دعاءِ شب قدر جامع و نافع دعا ہے، اگر قبولیت کی اس رات میں یہ نبوی دعا قبول ہوگئی، تو پھر بس کام بن گیا! اس لیے کہ اس کریم کی شانِ کریمی بڑی عجیب ہے، وہ ایک مرتبہ معاف کر کے کسی کو محبوب بنا لیتے ہیں تو پھر کبھی مردود نہیں کرتے، بلکہ لوگوں میں بھی اس کو محبوب بنا دیتے ہیں۔

ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ:

روایتوں میں ایک حیرت انگیز واقعہ منقول ہے کہ سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے زمانے میں ایک نہایت سرکش اور بدکار نوجوان تھا، ساری بستی اس سے حیران و پریشان تھی، ایک مرتبہ لوگوں نے تنگ آ کر اسے بستی سے نکال دیا، یہ نوجوان آبادی سے باہر کسی ویران میدان میں جا کر رہنے لگا، جہاں اس کی موت واقع ہوگئی، ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی

آئی کہ ''ہمارے ایک ولی کا جنگل میں فلاں مقام پر انتقال ہوگیا ہے، تم جلدی جاؤ، اسے غسل کراؤ، اس کی نمازِ جنازہ پڑھاؤ، اور اعلان کرو کہ جو اس جنازہ میں شرکت کرے گا مغفرت کا حقدار ہو جائے گا۔''

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا تو بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے، لیکن اس مقام پر پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی کوئی اور نہیں، بلکہ وہی فاسق نوجوان ہے جس سے تنگ آ کر ہم نے بستی سے نکال دیا تھا! سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی بہت تعجب ہوا، بارگاہِ الٰہی میں راز معلوم کرنا چاہا، تو وحی کے ذریعہ بتایا گیا: ''موسیٰ! لوگ سچ کہتے ہیں، یہ فاسق فاجر اور بدکار ہی تھا، لیکن جب لوگوں نے اس کو بستی سے نکال دیا تو یہ بالکل ہی بے سہارا ہو گیا، اس جنگل میں موت سے قبل سچی توبہ کرتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہنے لگا:

''إِلٰهِی! عَبْدٌ مِنْ عِبَادِكَ، غَرِيْبٌ فِيْ بِلَادِكَ، لَوْ عَلِمْتُ أَنَّ عَذَابِیْ يَزِيْدُ فِیْ مُلْكِكَ، وَعَفْوَكَ عَنِّیْ يَنْقُصُ مِنْ مُلْكِكَ، لَمَا سَأَلْتُكَ الْمَغْفِرَةَ، وَلَيْسَ لِیْ مَلْجَأٌ، وَلَا رَجَاءٌ إِلَّا أَنْتَ، وَقَدْ سَمِعْتُ فِیْ مَا أَنْزَلْتَ إِنَّكَ قُلْتَ: ''إِنِّیْ أَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ'' فَلَا تُخَيِّبْ رَجَائِیْ.''

الٰہ العٰلمین! میں تیرے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، تیری سلطنت میں اجنبی ہوں، الٰہی! اگر میں یہ جان لیتا کہ مجھے عذاب دینا تیری سلطنت کو بڑھائے گا اور معاف کرنا گھٹائے گا، تو میں تجھ سے بخشش اور مغفرت ہی طلب نہ کرتا، (لیکن) تیرے سوا میرا کوئی ٹھکانہ اور سہارا بھی کہاں؟ تو نے اپنی کتاب میں جو فرمایا ہے کہ ''میں بڑا غفور و رحیم ہوں'' اسے میں سن چکا، میرے مولیٰ! تو مجھے ناامید نہ فرما۔'' (از: ''سیلابِ مغفرت''/ص:۱۲۱)

حق تعالیٰ نے اس دعا کے بعد صرف اسے معاف ہی نہیں کیا، بلکہ اپنا ولی بھی بنا لیا۔ سبحان اللہ!

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

نیز:

اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی
آثار و نشاں سب باقی ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن
اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

صاحبو! شب قدر میں اللہ تعالیٰ کی راہ صرف کھلتی ہی نہیں، بلکہ بہت مختصر اور آسان بھی ہو جاتی ہے، اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۱۴)

عظیم الشان انعام بصورتِ عیدین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسٍؓ قَالَ: "قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ اَلۡمَدِیۡنَةَ، وَلَھُمۡ یَوۡمَانِ یَلۡعَبُوۡنَ فِیۡھِمَا، فَقَالَ:"مَا ھٰذَانِ الۡیَوۡمَانِ؟" قَالُوۡا:"کُنَّا نَلۡعَبُ فِیۡھِمَا فِیۡ الۡجَاھِلِیَّةِ"، فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ:" قَدۡ أَبۡدَلَکُمُ اللّٰہُ بِھِمَا خَیۡرًا مِنۡھُمَا، یَوۡمَ الۡأَضۡحٰی وَیَوۡمَ الۡفِطۡرِ."

(رواہ أبوداؤد، مشکوٰۃ/ص: ۱۲۶/ باب صلوٰۃ العیدین/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ (مکہ مکرمہ سے جس وقت ہجرت فرما کر) مدینہ طیبہ تشریف لائے (تو آپ ﷺ نے یہاں آکر دیکھا کہ) مدینہ طیبہ والوں کے دو دن ہیں جن میں وہ (تہوار مناتے اور) کھیل کود کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے پوچھا: "یہ دونوں دن کیسے ہیں؟" انہوں نے کہا: "زمانۂ جاہلیت میں ہم ان دنوں میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے" (تو یہ وہی خوشی اور تہوار کے دن ہیں) تب آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کے بدلہ ان سے بہتر دو دن مقرر کیے، ایک عید الاضحیٰ اور دوسرا عید الفطر ہے۔"

قوموں کے تہوار اُن کی تہذیب کے ترجمان ہوتے ہیں:

اللہ رب العزت نے انسانی فطرت وطبیعت کچھ اس طرح بنائی ہے کہ وہ معاشرت

ومعمولات کی یکسانیت سے کبھی کبھی گھبرا اور اکتا جاتی ہے، اس لیے انسان اپنی زندگی میں ذرا تبدیلی اور ایسے شب وروز کا خواہش مند بھی ہوتا ہے جن میں وہ اپنے روزمرہ کے ماحول ومعمولات سے تھوڑا ہٹ کر اپنے دل ودماغ کو فارغ کرے، او کچھ وقت بے فکری وخوشی کے ساتھ ہنس بول کر گذارے، اسی انسانی فطرت وطبیعت کے تحت کچھ دن خوشی ومسرت کے مقرر کیے گئے، چناں چہ آج تک ہر قوم وملت میں سال کے کچھ دن خوشی ومسرت کے منانے کے لیے اجتماعی طور پر مقرر ہیں، جنہیں عرف عام میں تہوار کہا جاتا ہے۔ پھر تہوار منانے کے لیے ہر قوم وملت کا مزاج ومذاق اگرچہ جدا ہے، لیکن ان میں قدرِ مشترک جو بات ہے وہ ہے خوشی منانا، اب جس قوم وملت کی تہذیب وتمدن اور اخلاق کا معیار جتنا اونچا اور اچھا ہوتا ہے اس کے تہوار اور خوشی ومسرت منانے کے طور وطریق بھی اتنے ہی مہذب ومبارک ہوتے ہیں، اس کے برخلاف اگر کسی قوم کا اخلاقی وعملی معیار نیچا اور گرا ہوا ہے تو اس کے منائے جانے والے تہوار بھی اتنے ہی مکروہ اور غیر مہذب ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے تہوار ان کے عقائد وتصورات اور تہذیب وتمدن کے ترجمان وآئینہ دار ہوتے ہیں۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اس کا اخلاقی وعملی معیار سب سے اونچا اور اچھا ہے، اس لیے ایک طرف اس کے تہوار میں مذکورہ تقاضائے فطرت کی رعایت ہے، تو دوسری طرف اس تہوار کے منانے میں اخلاقی وعملی پیغام وہدایت بھی ہے، اس اعتبار سے ”عیدین امت محمدیہ کے لیے ایک عظیم الشان انعام ہے“۔

اسلامی تہوار دو ہی ہیں:

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے سال بھر میں اجتماعی خوشی ومسرت اور تہوار کے لیے دو دن مقرر کیے ہیں، جن میں ایک عید الاضحیٰ تو دوسرا عید الفطر ہے، حدیث مذکور میں اسی کا تذکرہ ہے کہ جب رحمت عالم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، جہاں سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی، تو وہاں آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ

نیروز (یا نوروز) اور مہرجان کے نام سے دوخوشی کے تہوار مناتے ہیں، جو جاہلی تصورات و روایات کے آئینہ دار تھے، جنہیں جاہلیت کے طرز پر منایا جاتا تھا، مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے بھی جاہلیت کی عادت کے مطابق ان میں شرکت کا ارادہ کیا، تو حضور ﷺ نے ان کو اس سے منع فرمایا۔

اس موقع پر حدیث کے ذیل میں محدثین لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے تہوار میں شرکت حرام ہے، اور ان کے تہواروں کے دنوں کی تعظیم بھی حرام ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ نے ان کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے، جو اسلام کے فطری وتوحیدی مزاج اور پاکیزہ اصولِ حیات کے عین مطابق ہیں، ان میں ایک عیدالفطر کا دن ہے اور دوسرا عیدالاضحیٰ کا، اسلام کے مقرر کردہ تہوار یہ دو ہی ہیں، جس طرح فرض نمازیں پانچ سے چھ نہیں ہوسکتیں اسی طرح عیدین بھی دو سے تین نہیں ہوسکتیں، لہٰذا امت مسلمہ کے لیے تہوار کے ان دو دنوں کے علاوہ کسی اور ڈے (Day) کو تہوار کی حیثیت سے منانے کی کوئی گنجائش نہیں، کیوں کہ اہلِ سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام میں یومِ عید یعنی ڈے (Day) کی تعیین توقیفی ہے اور اس میں خاص حکمت پوشیدہ ہے۔

اسلامی عیدین ان موقعوں سے وابستہ ہیں جو حال سے متعلق ہیں:

حالانکہ اسلامی تاریخ میں بقولِ شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ ''ایسے دنوں کی کوئی کمی نہیں تھی جن کی خوشی ہر سال اجتماعی طور پر منائی جاسکے۔ مثلاً:

۱- صرف دنیا ہی کا نہیں، بلکہ اس پوری کائنات کا سعید ترین دن وہ تھا جس میں رحمۃ للعالمین ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔

۲- یا وہ دن تھا جس میں آپ ﷺ کو نبوت و رسالت کا عظیم منصب عطا فرمایا گیا۔

۳- اس دن کی عظمت بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے جس میں آپ

ﷺ نے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔

۴- اسی طرح اس دن کی شان وشوکت کا کیا کہنا جس میں مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور کعبۃ اللہ کی چھت سے پہلی بار اذانِ بلالی گونجی۔‘‘

غرض سیرت النبی اور تاریخ اسلامی میں ایسے جگمگاتے ہوئے دن بے شمار ہیں ،جنہیں مسلمانوں کے لیے خوشی ومسرت کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا،لیکن ان میں سے کسی دن کا انتخاب نہیں کیا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت مسلمانوں کی عید وخوشی کے لیے جو دو دن مقرر کیے وہ ایسے ہیں جن میں امتِ مسلمہ ایک ایسی اجتماعی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتی ہے جو سال بھر میں ایک ہی مرتبہ انجام دی جاتی ہے، چناں چہ یکم شوال کو عید الفطر اس وقت منائی جاتی ہے جب مسلمان رمضان المبارک کے روزوں کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، اور عید الاضحیٰ ۱۰/ ذی الحجہ کو اس وقت منائی جاتی ہے جب مسلمان ایک دوسری سالانہ عبادت یعنی حج کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان میدانِ عرفات میں اپنے پروردگار سے مغفرت کی دعا کر کے اور خوش قسمت لوگ پروانۂ مغفرت پا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکے ہوتے ہیں ،اور جو لوگ براہِ راست حج میں شریک نہیں ہوتے وہ رضائے الٰہی کے خاطر قربانی کی عبادت انجام دیتے ہیں۔

اسلامی تہوار کی خصوصیات:

اس حکمت بھرے نکتہ میں اور اس سلسلہ میں موجود کتاب وسنت کی ہدایات میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلامی تہوار کی چند خصوصیات ہیں:

پہلی خصوصیت: یہ ہے کہ اسلام نے سالانہ عید اُن موقعوں سے وابستہ کی جو مسلمانوں کے حال سے متعلق ہیں ،اور جن کی تجدید ہر سال ہوتی ہے،جس میں یہ سبق دیا کہ تمہیں اصل خوشی منانے کا حق ان کاموں پر پہنچتا ہے جو تم نے خود فی الحال انجام دیے، محض ان کارناموں پر نہیں جو تمہارے آباء واجداد کر گذرے ہیں، ورنہ تمہیں طعنہ سننا پڑے گا کہ

تھے وہ آباء تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

دوسری خصوصیت: فضول خرچی سے بچتے ہوئے اپنے مال کو اپنے غریب بھائیوں کی مدد میں استعمال کرنا۔ چناں چہ عید الفطر کے موقع پر صاحب استطاعت مسلمان کا صدقۂ فطر نیز عموماً رمضان میں صدقۂ نافلہ اور زکوٰۃ ادا کرنا۔ پھر عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی کے گوشت کا ایک حصہ غرباء اور ایک حصہ اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنا، نیز ان جانوروں کی کھال وغیرہ فروخت کر کے اس کی قیمت غرباء پر خرچ کرنا اسی نیک مقصد کے تحت ہوتا ہے کہ ان غریبوں کو بھی خوشیوں میں شریک کیا جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عیدین میں غریب سے غریب گھرانہ بھی خوشی خوشی کھاتا پیتا، پہنتا اوڑھتا اور آسودہ نظر آتا ہے۔ یہ ہے اسلامی تہوار کی اصل حقیقت وخصوصیت ہے کہ اس میں فضول خرچی کی تو کوئی جگہ نہیں، لیکن غریبوں کی اعانت و مدد اور خوشی کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تیسری خصوصیت: اس کا بنیادی وامتیازی وصف نظم وڈسپلن اور تہذیب وشائستگی ہے۔ نہ جلوس، نہ ریلی، نہ پٹاخے، نہ آتش بازی، نہ دلوں کو دہلانے والا شور و ہنگامہ، نہ اشتعال انگیز نعرے؛ بلکہ شریعت کے حکم کے مطابق ہر مسلمان صبح سویرے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے گھر سے عید گاہ کی طرف نکلتا ہے، زبان پر ہلکے ہلکے بول جن میں نہ اپنی بڑائی، نہ کسی کی برائی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور حمد وثنا کرتے ہوئے عید گاہ پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، پھر کیا امیر، کیا غریب، کیا زمین دار، کیا کاشتکار، کیا حاکم، کیا محکوم، سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور محبت کا ایسا چراغ جلایا کہ اس کی روشنی نے سارے عالم اسلام کو روشن کر دیا، کتنی شائستگی ہے ان تہواروں میں۔

کاش! ہمارے برادرانِ وطن ہم سے تہوار منانے کا طریقہ سیکھتے! تو نہ ان کے تہوار فتنہ کا ذریعہ بنتے، نہ تہواروں کے نام پر بے حیائی کے مناظر وجود میں آتے اور نہ دیوالی میں آتش بازی کی صورت میں لوگوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی جل کر خاکستر ہوتی۔

لیکن دوسروں سے شکوہ وگلہ کے ساتھ کیا یہ ایک تلخ حقیقت نہیں ہے کہ خود

مسلمانوں نے اپنے دین اور اس کے شائستہ طور وطریق کو خیر باد کہہ کر غیروں کے غیر مہذب وناشائستہ طریقے اختیار کر لیے ہیں۔ مقام فکر ہے کہ دوسری قومیں اپنے ناشائستہ طور وطریق پر شرمائیں، اور ہم ان ہی طریقوں کو اپنا کر اپنے لیے وجہ افتخار تصور کریں۔

عیدین کا جائزہ:

صاحبو! اس نقطۂ نظر سے اسلامی عیدین ہم مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ اپنے حال واعمال کے پیشِ نظر کیا واقعی ہمیں خوشی منانے کا حق حاصل ہے؟ عید الفطر در حقیقت رمضان المبارک کے تربیتی کورس میں کامیابی کا ایک انعام ہے، اسی لیے حدیث میں اس کی رات کو ”لَیْلَةُ الْجَائِزَةِ“ یعنی انعام کی رات قرار دیا گیا ہے، لہٰذا عید کا یہ دن ہم سے یہ جائزہ لینے کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا ہم نے رمضان المبارک میں اعمال واخلاق کے اس تربیتی کورس میں واقعی کامیابی حاصل کر لی ہے؟

اسی طرح عید الاضحیٰ میں اللہ رب العزت سے تعلق اور اس کے لیے اپنے جذبات اور خواہشات کو قربان کرنے کا درس ہے، لہٰذا عید کا یہ دن بھی ہم سے اس بات کا محاسبہ کرنے کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا واقعی اللہ رب العزت کے ساتھ ہمارے تعلق میں کوئی اضافہ ہوا ہے؟ اور کیا ہم نے اپنے دل میں ضبطِ نفس اور جہد وعمل کے جذبات، نیز حق تعالیٰ کی محبت میں اپنی خواہشات کو قربان کرنے کا جذبہ پیدا کیا ہے؟ اور کیا ہم نے آپس میں ملک وملت کی فلاح وبہبودی کے لیے متحد ہونے کا کوئی ارادہ وعزم کیا ہے؟ جس طرح آج نمازِ عید کے وقت یکجا نظر آتے ہیں؟ کیوں کہ

بغض وکینہ لے کے دل میں جب ملے تو عید کیا؟
عید کے دن بھی نہ دل سے ملے تو عید کیا؟

عیدین کے موقعوں پر اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر انصاف کے ساتھ اپنا جائزہ لینے کے بعد ان سوالات کا، یا کم از کم ان میں سے کچھ سوالات کا جواب اثبات اور ہاں

میں پاتے ہیں تو واقعی ہمیں ''عید مبارک''! یہ عید ہمارے لیے سعید اور اللہ تعالیٰ کی رضا و دید کا سبب ہوگی، پھر ہمیں حق ہوگا عید کی مسرت اور خوشی منانے کا۔

اس لیے کہ یہ عیدین کی شکل میں ہم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، قرآن نے کہا:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ (یونس : ۵۸)

محبوبم! کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ اللہ کے فضل و رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا انہیں اللہ کے فضل اور رحمت سے خوشی منانی چاہیے۔ جب وہ چیز ہمیں نصیب ہوگئی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و رضا اور رحمت کا سبب ہے، تو یہی سب سے بڑی عید اور خوشی کی بات ہے۔

یہ پیغام دیتی ہے آج مسلمانوں کی عید سعید
خدا کی خوشنودی ہی میں ہے حقیقی عید

عیدین میں خوشی تو ہو؛ مگر خدا فراموشی نہ ہو:

لیکن اگر عیدین کا جائزہ لینے کے بعد ان سوالات کا جواب خدا نہ خواستہ نفی اور ''نہیں'' میں ملتا ہے، تو پھر عیدین کی خوشی ان لوگوں کو زیب نہیں دیتی جنھوں نے عید الفطر سے قبل احترامِ رمضان کو پامال کیا، یا عید الاضحیٰ سے پہلے عشرۂ ذی الحجہ کو غفلت و معصیت میں گذارا، درحقیقت ان کے لیے عیدین کے مواقع مسرت کے نہیں، بلکہ عبرت کے ہیں، آج ضرورت ہے کہ ہم عیدین کے موقعوں پر جائزہ لیں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ کسی نے عید کے دن نہایت پریشان حال دیکھا، وجہ پوچھی، تو فرمایا: ''لوگ عید کی مسرت میں مست ہوکر وعید بھول گئے۔'' لوگوں کے اس طرزِ عمل نے مجھے بے چین کر رکھا ہے، حق یہ ہے کہ عیدین میں خوشی تو ہونی چاہیے؛ مگر خدا فراموشی (خدا کو بھول جانا) کبھی نہ ہونا چاہیے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور اپنی رضا و دید نصیب فرمادے آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۱۵)
سیرتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ : "إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُّلَاةً مِّنَ النَّبِيِّيۡنَ، وَ إِنَّ وَ لِيِّيۡ أَبِيۡ وَ خَلِيۡلُ رَبِّيۡ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنَّ أَوۡلَى النَّاسِ بِإِبۡرٰهِيۡمَ﴾......الخ"
(ترمذی، مشکوٰۃ/ص:٥١٤/ باب فضائل سید المرسلین ﷺ/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر نبی کے نبیوں میں سے کچھ ولی (دوست) ہوتے ہیں، اور میرے ولی میرے والد سیدنا ابراہیمؑ ہیں، جو میرے رب کے سچے دوست ہیں، پھر آپ ﷺ نے ﴿إِنَّ أَوۡلَى النَّاسِ سے اَلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (آل عمران:٦٨) تک تلاوت فرمائی۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں، اور اللہ تعالیٰ مومنوں کا کارساز ہے۔''

سیرت ابراہیمی امت محمدیہ کے لیے نمونہ:

مقصد زندگی مولیٰ کی بندگی ہے، جس کا سب سے بڑا صلہ رضائے الٰہی ہے، اور بندگی کا تقاضا ہے مولیٰ کی مرضی اور حکم کے سامنے خودسپردگی اختیار کرنا، مطلب یہ ہے کہ رب

کریم کی طرف سے جو بھی حکم ہو اس کو تسلیم کر لینا، اور اس کے ہر فیصلہ پر راضی ہو جانا، یہ کمالِ عبدیت اور کمالِ ایمان کی علامت ہے، جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کے ہر ہر پہلو میں موجود ہے، سیرت ابراہیمی کی عظمتِ شان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی پینتیس سورتوں میں ۶۳ مقامات پر مختلف اسلوب و انداز میں کہیں اختصار سے تو کہیں تفصیل سے آپ کا تذکرہ آیا ہے، آپ کی سیرت کا خلاصہ اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور الوہیت کا یقین اور اس کے ہر حکم کو تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کرنا۔ شاید اسی لیے ربِ کریم نے سیرت ابراہیمی کو امت محمدیہ کے لیے اسوہ اور نمونہ بنایا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ﴾ (الممتحنة: ٤)

''بالیقین تمہارے لیے سیرتِ ابراہیمؑ میں بہترین نمونہ ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی معرفت، اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت اور اس کے دین کی دعوت کا جو جذبہ ان میں موجود تھا اس کا درس ان کی سیرت سے حاصل ہوتا ہے، ذرا قرآن کے آئینہ میں دیکھو!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے نعمت رشد سے نوازا گیا:

جس وقت دنیا میں انسان فطرت کا طاغی و باغی بنا ہوا تھا، عین اسی وقت رب جلیل نے اپنا خلیل بھیجا، اللہ تعالیٰ کی عادت و سنت ہے کہ وہ ہر انسان کو صحیح الفطرت پیدا کرتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ.'' (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ٢١/ باب الإيمان بالقدر)

اس لیے پیدائشی طور پر تو ہر انسان مسلمان ہے، بعد میں غلط اور گندہ ماحول عموماً اسے فطرت کا طاغی و باغی بنا دیتا ہے، ورنہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطرتِ صحیحہ و طبیعت سلیمہ کا استعمال کرے اور غور و فکر سے کام لے تو ماحول کتنا ہی فاسد کیوں نہ ہو، قدرت کی

طرف سے اس کی پوری پوری رہبری کی جاتی ہے، یہی ہوا سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ساتھ، پھر شروع ہی سے آپ کو رشد و ہدایت سے نوازا گیا، ارشاد ہے:

﴿ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ﴾ (الأنبياء : ٥١)

''ہم نے ابراہیمؑ کو شروع ہی سے رشد عطا کیا۔''فہیم و سلیم بنایا، وہ سمجھ بوجھ عطا کی جوان کے لائق تھی۔

رشد (امورِ دنیا کی آگہی کے ساتھ) اس خوبی و کسوٹی کا نام ہے جو حق و باطل کے فرق کو واضح کردے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پیدائشی طور پر اس نعمت سے نوازا گیا، اس لیے عراق کے معزز مگر مشرک گھرانہ میں پیدائش و پرورش پانے کے باوجود جوں ہی آپ نے ہوش سنبھالا اور اپنے والد اور اپنی قوم کو معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتے دیکھا تو صاف کہہ دیا:

﴿ أَ تَتَّخِذُ أَصۡنَاماً اٰلِهَةً إِنِّيۡ أَرٰاكَ وَ قَوۡمَكَ فِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (الأنعام : ٧٤)

عجیب بات ہے! تم لوگ اپنی مرضی کے مطابق جب اور جیسے چاہتے ہو بت بناتے ہو، اور پھر اسی کی پوجا پاٹ کرتے ہو! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ تمہاری کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

آپ کا معبودانِ باطلہ کی تردید کرنا یہ اسی رشد کا اثر تھا، ورنہ حال یہ تھا کہ جس گھر میں آنکھ کھولی وہاں بت پرستی، جس قوم سے واسطہ پڑا وہ شرک میں مبتلا، جس بادشاہ کی حکومت میں تھے اس میں اللہ تعالیٰ سے بغاوت، خود بادشاہ خدائی کا مدعی تھا، ایسے ماحول میں اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت رشد و ہدایت کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قوم کو مناظرانہ انداز میں دعوت پیش کرنا:

الغرض! سیدنا ابراہیمؑ نے حق اور اپنے رب کو پہچان کر اس کی طرف پہلے حکمت سے، پھر مناظرانہ انداز میں دعوت دی، سب سے پہلے آپ نے معبودانِ باطلہ کی حقیقت کے بارے میں سوال فرمایا کہ:

﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيۡلُ الَّتِيۡ أَنۡتُمۡ لَهَا عٰكِفُوۡنَ﴾ (الأنبياء : ٥٢)

''یہ کیا تماثیل ہیں، جن کے سامنے تم سرنگوں ہوتے ہو؟'' دھرنا دیے بیٹھے ہو؟ یہ کیا مجسمے اور مورتیاں ہیں جن کو تم لیے بیٹھے ہو؟ قوم ان بے حقیقت بتوں کی حقیقت بتلانے سے عاجز آ گئی، کہنے لگے: ''ہمیں تو زیادہ کچھ معلوم نہیں، بس باپ دادا سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے، جس کی تقلید ہم بھی کر رہے ہیں'':

﴿قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۵۳)

''وہ بولے کہ ''ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے''۔

آج تک اہل باطل اور اہل بدعت یہی جواب دیتے رہے، ان کے پاس خرافات، رسومات اور بدعات کی دلیل کوئی نہیں، ان کی دلیل اگر تقلید آبائی ہے تو جواب میں وہی بات کہی جائے گی جو سیدنا ابراہیمؑ نے فرمائی کہ:

﴿قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الأنبياء: ۵۴)

پھر تو دین اور وحی الٰہی کو چھوڑ کر تقلید آبائی اختیار کرنے والے تم اور تمہارے باپ دادا سب صریح گمراہی میں ہو۔ سیدنا ابراہیمؑ کی اس سچی اور پکی بات سے دنیائے کفر لرزہ بر اندام ہوگئی۔ حواس باختہ ہو کر کہنے لگے:

﴿قَالُوْا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۵۵)

کیا تم سنجیدگی سے بات کرتے ہو یا دل لگی کر رہے ہو؟ انہیں چوں کہ توقع نہیں تھی کہ کوئی ان کے بتوں کے بارے میں ایسی بات کہہ سکتا ہے، اس لیے شروع میں انہیں شک ہوا کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام سنجیدگی سے نہیں، بلکہ مذاق کے طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تب آپ نے توحید کا ڈنکا بجاتے ہوئے خدا کی خدائی و کبریائی کی عجیب دلیل پیش فرمائی:

﴿قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۵۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ تمہارا رب بھی وہی ہے جس نے

آسمان وزمین کو پیدا فرمایا۔ یہ توحید ربانی کی اس قدر مضبوط دلیلیں ہیں کہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے، آپ نے فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو جاننے اور ماننے کے ساتھ اس کی گواہی بھی دیتا ہوں۔'' مگر قوم کے کند ذہنوں کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے ہیں: ''حضرت خلیل علیہ السلام نے دعوت وتبلیغ کے سفر میں اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے جب محسوس کیا کہ یہ قوم صنم پرستی کی رسیا ہوگئی اور لاعلاج نظر آتی ہے، تو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے اصنام کے انہدام کا فیصلہ کرلیا اور واضح اعلان کیا:

﴿وَتَاللّٰهِ لَأَكِيدَنَّ أَصۡنَامَكُم بَعۡدَ أَنۡ تُوَلُّوا مُدۡبِرِينَ﴾ (الأنبیاء : ۵۷)

اور اللہ کی قسم! میں تمہارے ہٹ جانے کے بعد ان بتوں کا علاج کروں گا۔

پھر ثابت کروں گا کہ یہ تو خود اپنی حفاظت نہیں کرسکتے، تمہاری حفاظت خاک کریں گے؟

فَلۡيُغَيِّرۡهُ بِيَدِهٖ :

آستانہ پرستوں اور باطل پرستوں نے کہا: ''ہماری موجودگی میں ہمارے خداؤں کو کیا خطرہ؟ ہم ہر وقت ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں!'' دیکھ لیا انسانی سوچ کی پستی کا عالم؟ خداؤں کی حفاظت قوم کر رہی ہے، خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿بَعۡدَ أَنۡ تُوَلُّوا مُدۡبِرِينَ﴾ جب تم میلے پر چلے جاؤ گے، یہ اکیلے رہ جائیں، تب میں ان سے نمٹ لوں گا۔ اس دور میں بھی قومی میلہ ہوتا تھا، جس میں سارے اللے تللے جمع ہوتے تھے، چناں چہ جب قوم اپنے مذہبی میلے میں گئی تب حضرت خلیل علیہ السلام نے ''فَلۡيُغَيِّرۡهُ بِيَدِهٖ'' پر عمل کرتے ہوئے بت شکنی کا مجاہدانہ کام کرلیا، مندر میں جا کر ایک بڑے بت کے علاوہ اپنے نظامِ عمل کی تکمیل کے لیے تمام بتوں کو ڈھکانے لگا دیا۔

مٹا ڈالے بتوں کو توڑ کر اوہام مرسلؐ نے
دیا بندوں کو پھر اللہ کا پیغام مرسلؐ نے

جب قوم میلے سے مندر میں آئی، تو وہاں اپنے خداؤں کے قتلِ عام کا منظر دیکھ کر حیران و پریشان ہوگئی، کسی کا ہاتھ نہیں تو کسی کا پیر غائب، کسی کی آنکھ پھوٹی ہے تو کسی کا سر ہی نہیں، سب کے سب نشانِ عبرت بن چکے تھے۔ لوگ سخت غم اور غصہ میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے:

﴿قَالُوا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ إِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الأنبياء : ٥٩)

وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود کس کے ہاتھوں مارے گئے؟ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ یہ دھما کہ اور معاملہ ہمارے معبودوں کے ساتھ کس ظالم نے کیا؟ کسی نے کہا: ''ہو نہ ہو، یہ کام ابراہیم ہی کا ہے، لہٰذا بلاؤ اسے اور جواب طلب کرو!'' چناں چہ قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلا کر لوگ عدالت میں جواب طلب کیا، آپ نے فرمایا:

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ إِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾ (الأنبياء : ٦٣)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: دیکھتے نہیں ہو! کلہاڑا اور قتل کا آلہ تمہارے بڑے کے پاس ہے، اور الزام مجھ پر لگاتے ہو؟ تمہاری عقل کہاں گئی؟ ساری دنیا قاتل اس کو سمجھتی ہے جس کے پاس آلۂ قتل برآمد ہو جائے، لہٰذا قرائن اور شواہد بتا رہے ہیں کہ یہ سب کارروائی اس بڑے کی ہے، یہ اس بڑے کا کام ہے، یہ تمہارا اور ان کا بڑا ہے نا؟ اب خود ان زخمیوں اور ٹوٹے پھوٹے بتوں ہی کو پوچھ لو؟ اگر یہ بول سکتے ہیں تو بتائیں گے کہ ان کا بیڑا کس نے غرق کیا۔ چوں کہ یہ واضح طور پر ایک طنز تھا، اس لیے اس میں غلط بیانی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

بعض حضرات نے ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ﴾ کی ایک تاویل یہ کی ہے کہ یہاں مراد اللہ تعالیٰ کی پاک ذات ہے، گویا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ان بتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس ذات کی طرف سے ہے جو سب سے بڑا ہے۔'' (مظاہر حق جدید/ص: ٦/٥٦٠)

پیغمبر کے حکیمانہ اندازِ تبلیغ نے آستانہ پرست قوم کو لا جواب کر دیا، قرآن کہتا ہے:
﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دندان شکن جواب سے قوم شرمندہ ہوگئی، سر جھکا لیے، لیکن مدتوں سے جمے ہوئے عقیدوں کو چھوڑنے کی جرأت نہ ہوئی، اسی لیے پھر حیرت وحسرت کے ملے جلے انداز میں کہا:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ (الأنبياء: ٦٥)

تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بت بول نہیں سکتے، ان کی بے زبانی مسلم ہے۔ اب وقت آ گیا تھا بت پرست قوم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حاکمیت کے تصور سے ہمکنار کرانے کا، ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: کچھ تو سوچو! تم نے کسے کھویا اور کسے پایا؟ اللہ جل شانہ کو چھوڑ کر ایسے کمزور اور ناتواں بتوں کو پوجتے ہو جو اپنی ناک کو بچانے کی پوزیشن میں بھی نہیں، پھر ایسوں کی پرستش سے کیا فائدہ جو نہ نفع دے سکیں نہ نقصان، جو نہ تمہاری پکار سن سکتے ہیں نہ سوال کا جواب دے سکتے ہیں:

﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (الأنبياء: ٦٧)

تف ہے! تم پر اور ان پر بھی جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو، کیا تم اتنی صاف ستھری اور کھلی بات بھی نہیں سمجھ سکتے!

قوم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ان باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکی، چاہیے تھا کہ قوم گمراہی چھوڑ کر راہِ راست اختیار کر لے، مگر دلوں کی خباثت، ضلالت اور ضد نے اس جانب آنے نہ دیا، الٹا انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے خلاف عداوت کا نعرہ بلند کیا۔

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے ہیں: ''دلائل کے میدان میں باطل کی شکست فاش ہوئی تو طاقت کے غرور میں حق کے علم بردار کو نشانۂ ستم بنانے کا پروگرام بنا ڈالا۔''

﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ﴾ (الأنبياء: ٦٨)

ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ آگ میں اس کو جلاؤ اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، یہ کام ہے کرنے کا۔

باطل پرستوں کا طریقہ: ''ہر کہ تنگ آمد، بجنگ آمد''

صاحبو! باطل پرستوں کا ہمیشہ یہ طریقہ اور وطیرہ رہا ہے کہ جب وہ اپنے موقف کو دلائل وبراہین سے ثابت نہیں کر سکتے تو پھر تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں، مثل مشہور ہے کہ ''ہر کہ تنگ آمد، بجنگ آمد'' حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے بھی اسی راہ کو اختیار کرتے ہوئے آپ کو سخت سے سخت سزا دینے کا فیصلہ کرلیا، صورتِ حال یہ تھی کہ خود سگا باپ دشمن بنا ہوا تھا، اور بادشاہِ وقت بھی مخالف تھا، پھر (تقریباً) پوری قوم درپئے آزار تھی، اس لیے چاروں طرف سے نفرت وعداوت کے نعرے بلند ہوئے اور خوف ناک سزا کے ارادے کیے گئے، پروگرام کے مطابق ایک زبردست آگ روشن کی گئی، سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بعد انہوں نے پلاننگ کے مطابق حضرت خلیل علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا، آگ کیا تھی؟ ایک دہکتا ہوا سمندر تھا! دشمن خوش تھے کہ آج ابراہیم کی توحید کا پتہ چلے گا، نمرود خوش تھا کہ آج میرا دشمن جل کر خاک ہوجائے گا، شیطان بھی خوش تھا کہ آج خدا کی دوستی کا دعوے دار، توحید ربانی کا علم بردار نیست ونابود ہوجائے گا۔ کلیجہ پر ذرا ہاتھ رکھئے! پھر اس خطرناک منظر کا تصور کیجیے! ہائے ہائے، وہ کیسا وقت تھا؟ آسمان کے فرشتوں میں بھی ایک اضطراب تھا کہ الٰہی! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا آج آپ کا خلیل آتشِ نمرود میں جلایا جائے گا؟ سید الملائکہ عرض کرتے ہیں: رب جلیل! اجازت ہو تو میں حضرت خلیل کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، حکم ہوتا ہے جاؤ جبرئیل! تم بھی اپنا شوق پورا کرلو!

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایمان پیدا:

حضرت جبرئیلؑ بارگاہِ الٰہی سے دربارِ ابراہیمی میں پہنچتے ہیں، اور نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں: حضرت! حاضرِ خدمت ہوں، حکم ہو تو ابھی پر مار کر آگ بجھادوں، فرمایا:

پہلے یہ بتاؤ! تم اپنی ذاتی حیثیت سے آئے ہو یا سرکاری؟ کہا: آیا تو ذاتی حیثیت سے ہوں، مگر اجازت لے کر آیا ہوں، فرمایا: مجھے تمہاری ضرورت نہیں، میرا مالک مجھے کافی ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت کا پورا یقین تھا، اور جب بندہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہتا ہے تو اس کی ضرور مدد کی جاتی ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوا، ظالموں نے جب آپ کو دہکتے ہوئے انگاروں اور لپکتے ہوئے شعلوں کی نذر کیا تو ''دشمن اگر قوی یست، نگہبان قوی تر است'' عین اسی وقت اللہ تعالیٰ کی مدد آئی، براہِ راست نارِ نمرود کو حکم ملا:

﴿ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْداً وَّ سَلٰماً عَلٰىٓ إِبْرٰهِيْمَ﴾ (الأنبياء : ٦٩)

ہم نے کہا: ''اے آگ! ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا، اپنے دامن کو اتنا پُر کیف بنا لے کہ موسم بہار کو بھی رشک آئے۔

صاحبو! یہاں حکم ربانی میں لفظ ''بَـرْدًا'' کے ساتھ '' سَلاَمًـا'' کا اضافہ بہت ہی معنیٰ خیز ہے، کیوں کہ کسی چیز کا اعتدال سے بڑھنا بھی مضر اور مہلک ثابت ہوتا ہے، مثلاً اگر گرمی حد اعتدال سے بڑھ جائے تو ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، اسی طرح ٹھنڈی بھی اگر اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ ٹھنڈک رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے، اس وجہ سے اس موقع پر حق تعالیٰ ''بَـرْدًا'' کے ساتھ ''سَلاَمًـا'' ارشاد نہ فرماتے تو ممکن تھا کہ آگ اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ وبالِ جان بن جاتی، لہٰذا ''بَرْدًا'' کے ساتھ ''سَلاَمًـا'' فرما کر آگ کو پابند بنا دیا کہ دراصل میرے خلیل کی سلامتی مقصود ہے، اس لیے ٹھنڈی ہو کر سلامتی کا ذریعہ بھی بن جا۔

آج اگر سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لیے کیا مانع ہے جو نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو سلامت نہ رکھے؟ اور اس طرح نار کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یار نے گلزار بنا دیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ آگ خود جلی؛ مگر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کو نہ جلا سکی، پھر جو تسلیم ورضا کا پیکر نار میں صبر کرتا ہوا داخل ہوا تھا

سات دن کے بعد وہ شکر کرتا ہوا اس سے صحیح سالم باہر نکل آیا، ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو یہ نصرتِ الٰہی والا معاملہ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ملت ابراہیمی کے ہر فرد کو قرآن دعوت دے رہا ہے کہ اٹھو اور کفر و شرک، ظلم و جہالت کے اندھیروں سے ٹکرا کر حق و صداقت کے اجالوں کا پھریرا لہرا دو، اس کے لیے زیادہ تعداد نہیں چاہیے، صرف ایک فرد بھی بہت ہے مگر ابراہیم کا سا، ۳۱۳ بھی بہت ہیں مگر اصحابِ بدرؓ جیسے۔ وہی عزم، وہی جذبۂ جہاد۔

عصر حاضر کو سر بہ جیب حکیموں کی نہیں، سر بہ کف کلیموں کی ضرورت ہے، اسلام کو مجاور نہیں، مجاہد چاہیے، پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت کے انداز وہی ہوں گے جو اس کا وعدہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل:

پھر تو حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہونے کا یقین، اللہ تعالیٰ کی اس نصرت اور قدرت کے مشاہدہ کے بعد بہت ہی زیادہ مضبوط ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو حکم ہوا کہ بیوی اور بیٹے کو لے کر یہاں سے ہجرت کرو، اور انہیں مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں ہمارے بھروسہ چھوڑ آؤ، تو آپ فوراً تیار ہو گئے۔

جانتے بھی ہو اس وقت مکہ کا کیا حال تھا؟ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ، سوسو کلومیٹر دور کسی انسان کی بستی اور آبادی نہ تھی، حتیٰ کہ کعبۃ اللہ کے آثار بھی طوفانِ نوح علیہ السلام کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے، آج جہاں کعبۃ اللہ ہے وہاں ایک اونچے ٹیلہ کی شکل تھی، اس کے قریب ایک بڑا درخت تھا، حضرت خلیل علیہ السلام اسی درخت کے نیچے اپنی بیوی سیدہ ہاجر اور بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑ کر واپس ہونے لگے، ذرا چشم تصور میں وہ منظر لائیے گا! اس لق و دق بیابان میں جہاں دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا، تنِ تنہا ایک عورت اپنے

دودھ پیتے بچے کے ساتھ کیوں کر رہ سکتی تھی؟ مگر مرضیٔ مولیٰ یہی تھی؛ اس لیے جب بی بی ہاجرؑ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ ”اِس بے کسی و بے بسی کے عالم میں کس کے حکم پر چھوڑ کر جاتے ہو؟ یہ خلیل علیہ السلام کی مرضی ہے یا ربِ جلیل کی؟“ فرمایا: ”میرے رب کا یہی حکم ہے“ تب سیدہ ہاجرؓ نے عرض کیا: ”اگر یہ میرے مولیٰ کی مرضی ہے تو وہی ہمیں کافی ہے، اب آپ کی ضرورت نہیں، آپ جائیے، ان شاء اللہ میں صبر واستقامت کا ایسا مظاہرہ کروں گی کہ قیامت تک اس کی یاد تازہ رہے گی“ یہ اطمینان بخش جواب سن کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام واپس لوٹے، دور جا کر جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل وعیال بھی نظر سے اوجھل ہو گئے، تب آپ نے اس طرف رخ کیا جہاں آج کعبۃ اللہ ہے، اور رقتِ قلبی اور درد میں ڈوبی آواز میں یہ دعا مانگی:

﴿ رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴾ (إبراهيم : ٣٧)

الٰہ العالمین! اپنا سرمایۂ قلب وجگر اس مقام پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جہاں زندگی کے آثار بھی مفقود ہیں، تاکہ وہ تیرے نام کو بلند کریں، اقامتِ صلوٰۃ سے تیری یاد کے دیپ روشن کریں، تو اے میرے رب! تو اپنے بندوں کے دلوں میں میری اولاد کی محبت ڈال کر انہیں ادھر متوجہ فرما دے، میں تو انہیں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں؛ مگر تو ان کو تنہا نہ چھوڑنا۔ جس کی ترجمانی حضرت حفیظ جالندھری نے یوں کی ہے:

اے مالک! عمل کو تابع ارشاد کرتا ہوں
میں بیوی اور بچے کو یہاں آباد کرتا ہوں
اسی سنسان وادی میں انہیں روزی کا سامان دے
اسی بے برگ و سامانی کو شانِ صد بہاراں دے
الٰہی! نسل اسماعیل بڑھ کر قوم ہو جائے

یہ قوم اک روز پابندِ صلوٰۃ وصوم ہو جائے
بشارت تیری سچی ہے، تیرا وعدہ بھی سچا ہے
بس اب تو ہی محافظ ہے، یہ بیوی ہے، یہ بچہ ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد سیدہ ہاجرؓ چند روز تک مشکیزہ سے پانی پیتی اور تھیلی سے کھجوریں کھاتی اور اسماعیلؑ کو دودھ پلاتی رہیں، لیکن جب نہ پانی رہا، نہ کھجوریں، تو پریشان ہو گئیں، کیونکہ خود بھوکی پیاسی تھیں، اس لیے دودھ بھی نہ آتا تھا، جس سے بچہ بھی بھوک سے بلبلانے لگا، تب ماں ہاجرؓ مسبب الاسباب کی مدد تلاش کرنے کی غرض سے اسباب کی تلاش میں نکلیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھ گئیں، مگر کچھ نظر نہ آیا، اور ساتھ ہی بچہ کا خیال آیا تو فوراً دوڑ کر وادی میں آ گئیں، اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، جب وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا تو تیزی سے بچہ کا دھیان آنے پر لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آ گئیں، اس طرح سات مرتبہ کیا، آج جو حج وعمرہ کرنے والے ”السعي بين الصفا و المروة“ کے سات چکر لگاتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے، جس کو رب العالمین نے باقی رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے! ماں ہاجرؓ جب بچہ کے قریب آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ ننھے اسماعیل کی ایڑی کے پاس سے پانی کا چشمہ ابل رہا ہے، جلدی سے پانی کو جمع اور محصور کرنے کی غرض سے ریت اور کنکریوں کی پال باندھنے لگیں، اس وقت بے ساختہ آپ کی زبان سے عبرانی زبان کا یہ لفظ نکلا: ”زم زم“ یعنی رک جا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”ماں ہاجرؓ ”زم زم“ نہ فرماتیں تو پوری روئے زمین میں وہ پانی پھیل جاتا۔“ عجیب بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اس میں بھوک اور پیاس دونوں مٹانے کی تاثیر بھی رکھ دی، پھر اس کا نہ رنگ بدلتا ہے، نہ بو، نہ ذائقہ۔

جہاں پر ایڑیاں بچے نے رگڑی تھیں بہ ناچاری
ہوا تھا چشمہ آبِ سرد و شیریں کا وہاں جاری

آج بھی اس وادیٔ فاران سے نکلنے والا یہ حیات آفریں پانی اسی روانی، جولانی اور فراوانی سے جاری ہے، ہمارا تو ایمان ہے کہ ماءِ زمزم اگر نلوں کے ذریعہ دنیا کے کونے کونے میں روئے زمین پر بسنے والے انسانوں تک پہنچایا جائے اور وہ اسے استعمال کریں تب بھی ختم نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بیت اللہ کی تعمیر کرنا:

ادھر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے دل پر اس واقعہ کی اطلاع کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے مشاہدہ نے ایسا اثر ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے ان کے دل سے "ہر نقش ماسوا" کو مٹا دیا۔

صاحبو! جب دل میں حبِ الٰہی کا چراغ جلتا ہے تو پھر حکمِ الٰہی کی تکمیل کے لیے کسی ظاہری روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام تو حبِ الٰہی کے اس مقامِ بلند کو پہنچ گئے تھے جس کا اظہار حضرت مجذوبؒ نے یوں کیا ہے کہ

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی ☆ اب تو آجا، اب تو خلوت ہوگئی
اک تم سے کیا محبت ہوگئی ☆ ساری دنیا ہی سے نفرت ہوگئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہوگئی ☆ آرزو جو کی وہ حسرت ہوگئی
دل میں داغوں کی کثرت ہوگئی ☆ رونما اک شانِ وحدت ہوگئی
عشق میں ذلت بھی عزت ہوگئی ☆ لی فقیری، بادشاہت ہوگئی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دل میں حبِ الٰہی کے غلبہ سے ہر وقت یہی طلب اور تمنا ہونے لگی کہ میرا خالق و مالک مجھ سے کیسے خوش ہو جائے؟ اس کی توحید کا کلمہ سارے عالم میں کیسے بلند ہو جائے؟ یہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ آپ نے بحکمِ الٰہی توحید کے عالمی مرکز بیت اللہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، وہ بھی ایسی جگہ جہاں (اُس وقت) پورا علاقہ ویران، نہ پانی کا نام و نشان، سبزہ کی جگہ ہر طرف ریگستان، نیچے تپتی زمین تو اوپر دہکتا ہوا آسمان، حکم ہوا:

ابراہیم! یہیں بناؤ ایک مکان، پر اپنے لیے نہیں، ہماری عبادت کے لیے، چناں چہ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً مہیا کیا اس کا سامان، صاحبِ طرز ادیب علامہ عبد الماجد صاحب دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں اسے یوں بیان فرمایا:

''کچھ یاد ہے؟ کہ آدم علیہ السلام کے زمانے کے بعد اس (بیت اللہ) کی تعمیری تجدید اولادِ آدمؑ میں کس نے کی ہے؟ اپنے ہاتھوں میں پتھر اور گارا لے کر کس نے اس کی دیواریں بلند کیں؟ اللہ کے اس گھر کے معمار کون تھے؟ بادشاہوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں تو بڑے بڑے کاری گر اور مہندس بلائے جاتے ہیں، گورمنٹ ہاؤس جب تیار ہونے لگتے ہیں تو نامور انجینئروں کی قسمت جاگ جاتی ہے، پر اللہ کے گھر کی تیاری کے لیے بھاری پتھر کس نے لادے؟ اپنے ہاتھ چونے اور مٹی کے گارے میں کس نے سانے؟ عرب کی چلچلاتی دوپہر میں ریگستانوں کی لو کی لپٹوں میں بغیر روپۓ پیسوں کے مزدوری کی لالچ میں کس مزدور نے اپنے گوشت و پوست کو جلایا؟ تپایا؟ جھلسایا؟ کون بندہ کا جواب دے؟ (جواب میں) بندوں کا خالق، اس گھر کا مالک خود اپنی زبان سے اپنے گھر کے مزدور اور اس کے نورِ نظر کا نام بڑے چاؤ اور پیار سے لیتا ہے:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوٰعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ﴾ (البقرة : ۱۲۷)

جب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام رشد و ہدایت کے عالمی مرکز کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام بھی! (ان کے ساتھ شریک تھے)

دیکھا ہوگا! مزدور جب کام کرتے ہیں تو اکثر گنگناتے ہیں، اللہ کے مزدور بھی جس وقت کام کر رہے تھے تو انھوں نے اپنی زبانوں پر مہریں نہیں لگائی تھیں، بلکہ جس کا گھر بنا رہے تھے اسی سے کچھ مانگ بھی رہے تھے، ہاتھ اگر تعمیر بیت میں مشغول تھے تو دل یادِ رب البیت میں، ''دست بکار، دل بیار'' عاجزی اور بندگی کے ساتھ، پتھر پر پتھر جوڑتے جاتے اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ کہتے جا رہے تھے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلُ مِنَّاَ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيُعُ الُعَلِيُمُ﴾ (البقرة : ۱۲۷)

اے ہمارے رب! ہماری یہ خدمت قبول فرما، بے شک! تو ہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے، تجھ پر تو ہماری زبان کا قال بھی روشن اور دل کا حال بھی عیاں ہے۔

العظمۃ لِلّٰہ! اللہ پر قربان ہونے والوں اور اللہ کے خلیل کہلانے والوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ خود کو مٹا چکے ہیں، پھر بھی ڈر اور دھڑ کا یہی لگا ہوا ہے کہ خود کو مٹانا بھی قبول ہوتا ہے یا نہیں؟ (از: ''ادبی شہ پارے'':۱/۱۸۶)

اس تعمیر سے پہلے دنیا کا حال یہ تھا کہ کائنات کے گوشے گوشے میں بتوں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے، لیکن خدائے واحد کی عبادت کے لیے دنیا کے بت کدوں میں وہ پہلا گھر جو خدا کا گھر کہلایا وہ یہی بیت اللہ ہے، جس کے معمار حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور مزدور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام۔

حضرت مولانا الطاف حسین حالیؒ نے کہا ہے:

خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا ☆ وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
ازل سے مشیت نے تھا جس کو تاکا ☆ کہ اِس گھر سے ابلے گا چشمہ ہدیٰ کا

نداءِ خلیل اللہ علیہ السلام:

بنائے بیت اللہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام جب فارغ ہو گئے تو حکم ہوا:

﴿ وَأَذِّنُ فِيُ النَّاسِ بِالُحَجِّ﴾ (الحج : ۲۷)

ربِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو! تو تسلیم و رضا کے پیکر نے حب الٰہی میں حکم الٰہی کی تکمیل کے لیے صفا پہاڑی سے متصل جبل ابوقبیس کی بلندی سے اعلان کیا:

''يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ كَتَبَ عَلَيُكُمُ الُحَجَّ، فَأَجِيُبُوا رَبَّكُمُ.''(روح المعانی)

لوگو! تمہارے رب نے تم پر حج فرض کیا، لہٰذا اس کو قبول کرو، یہ اعلان وادیٔ غیر ذی زرع میں اس وقت کیا تھا جب نہ تار تھا نہ ٹیلی فون، نہ وائرلیس نہ لاؤڈ اسپیکر، نہ لوگ نشریات کے قانون سے واقف تھے، لیکن اس کے باوجود خدا معلوم سیدنا خلیل علیہ السلام کی آواز کس لاہوتی میٹر پر اور کس ملکوتی لہر (wave length) سے نشر ہوئی کہ آج تک اس کی تھرتھراہٹ اور گنگناہٹ فضائے کائنات میں برابر سنی جاتی ہے، یہ حج کا تلبیہ دراصل اعلانِ ابراہیمی کا جواب ہی تو ہے، حدیث میں ہے کہ جس کی قسمت میں تا قیامت حج لکھا گیا، اعلانِ ابراہیمی کے وقت خواہ وہ ماں کے پیٹ میں تھا، یا آباء واجداد کی پشتوں میں، اس نے جواب میں لبیک پکارا، آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تمام کائنات اور کرۂ ارض پر بسنے والے خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، شمال کے یا جنوب کے، ہر ملک، ہر شہر اور ہر رنگ ونسل کے کلمہ گو مسلمان سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آواز پر برابر لبیک کہتے ہوئے بیت اللہ حاضر ہوتے ہیں، یہ وہاں کی رونق اور کشش آپ کے خلوص کا اثر ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود
ایں ز اخلاصاتِ ابراہیم بود

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حج بیت اللہ:

یہ حج کیا ہے؟ بعض حضرات اجتماعِ حج کے فلسفے بیان کرتے ہیں، اور حج کو بین الاقوامی کانفرس کا نام دیتے ہیں، اور پھر اس پر طرح طرح کے حاشیے بھی چڑھاتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ سب انسانی تعبیرات ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امورِ حج اور اس کے احکام وافعال کو گہرائی سے دیکھا اور سوچا جائے تو یہ نکتہ عیاں ہوگا کہ حج دراصل سیرتِ ابراہیمی کی چند اداؤں اور چند وفاؤں کا نام ہے، حُجاج اسی یاد کو تازہ کرتے ہیں، تلبیہ ہو یا طواف، حجر اسود کا بوسہ ہو یا مقامِ ابراہیم پر نماز، صفا مروہ کی سعی ہو یا آبِ زمزم سے سیرابی، منیٰ کی روانگی ہو یا عرفات کا

قیام وعاجزی، جمرات کی رمی ہو یا قربانی......غرض ان تمام اعمال کا سرا سیرتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ہی تو ملتا ہے، اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت، محبت، کمالِ عبدیت اورحق وصداقت کا ہدایت بھرا درس بھی آپ کی سیرت سے ملتا ہے، بلکہ شریعت محمدی سیرتِ ابراہیمی سے بہت ملتی جلتی ہے، حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ ترجمان السنہ میں فرماتے ہیں کہ ’’کم از کم چالیس احکام ہماری شریعت میں ایسے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھے۔‘‘

شاید اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ہمارے لیے اسے اسوہ اور نمونہ بنا کر اس کے اتباع کا حکم فرمایا:

﴿ ثُمَّ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ أَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِيمَ حَنِيفًا﴾ (النحل :۱۲۳)

جس کا مطلب یہ ہے کہ پھر (اے میرے محبوب !) ہم نے آپ پر بھی وحی کے ذریعہ یہ حکم نازل کیا ہے کہ آپ ابراہیم کے دین کی پیروی کریں، جنھوں نے اپنا رخ اللہ ہی کی طرف کیا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فرمادیا:

﴿إِنَّ أَوۡلَى النَّاسِ بِإِبۡرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الۡمُؤۡمِنِينَ﴾ (آل عمران : ٦٨)

یعنی سب لوگوں سے زیادہ ابراہیم سے نزدیک تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ نبی اور جو لوگ ایمان لائے اور مومنوں کا ولی اللہ ہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چوں کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین و مومنین سب کے لیے متفق علیہ ہیں، اس لیے ہر طالب صادق وداعئ حق کے لیے اسوۂ ابراہیمی روشنی کا مینار ہے۔

رب کریم ہم سب کو اسوۂ ابراہیمی ومحمدی کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰه عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهۡلُهٗ.

(۱۶)

حج کا منظر کتاب وسنت کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ سَعِیۡدِ نِ الۡخُدۡرِيِّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: ”خَرَجۡنَا مَعَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ﷺ نَصۡرُخُ بَالۡحَجِّ صُرَاخًا“. (مسلم، مشکوٰۃ/ص:۲۲۳/ باب الإحرام والتلبیة/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ”ہم رحمتِ عالم ﷺ کے ساتھ (سفرِ حج میں) اس طرح روانہ ہوئے کہ ہم حج کے لیے (دیوانہ وار) چلاتے تھے۔ (یعنی حج کے لیے بلند آواز سے تلبیہ پڑھتے تھے)

حج ’اللہ سے محبت کی تکمیل اور عبدیت کی تصویر ہے:

”عبدیت“ انسانیت کا نہایت افضل واعلیٰ مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے منتخب اور مخصوص بندوں کا وصفِ خاص ہے، اسی وجہ سے شبِ معراج میں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو اسی وصف سے یاد فرمایا ﴿أَسۡرىٰ بِعَبۡدِہٖ﴾ کلمۂ شہادت میں بھی رسالت سے قبل عبدیت کا ذکر ہے، جس سے مقامِ عبدیت کی عظمت واضح ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عبدیت کی حقیقت کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ عبدیت تسلیم ورضا یعنی حکمِ خدا اور مرضئ مولیٰ کے سامنے فنائیت اختیار کرنے کا نام ہے۔ بقولِ شاعر:

مرضی تیری ہر وقت جسے پیشِ نظر ہے
بس اس کی زباں پر نہ اگر ہے، نہ مگر ہے

ایک بندے کا سب سے بڑا وصف اور وظیفہ عبدیت ہی ہے، جس میں عبدیت نہیں وہ عبد کامل نہیں، اس کا رب اس سے راضی نہیں، اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں، عبادتوں، ریاضتوں اور مجاہدوں کا مطلوب ومقصود یہی ہے کہ بندوں میں عبدیت اور فنائیت کا جذبہ پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کے آگے سراپا تسلیم ورضا بن جائیں، اور جب جو حکم ہو اسے بے چون و چرا مان لیں، پھر عجیب بات یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام، اعمال اور عبادات میں یہ شان موجود ہے کہ اس کی صحیح ادائیگی سے ایک بندے میں عبدیت پیدا ہو جاتی ہے، بالخصوص حج، جو اسلام کے پانچ ارکان میں آخری اور تکمیلی رکن ہے، اس میں اللہ تعالیٰ سے محبت اور عظمت کی تکمیل اور عبدیت وفنائیت کی تصویر ہے، اگر حج وحاجی کے حالات، ارکان، اعمال، افعال اور عبادات میں غور کیا جائے، بلکہ ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی تکمیل اور عبدیت کی وہ تصویر نظر آتی ہے کہ اس کے لیے کسی تفصیل وتشریح کی بھی حاجت وضرورت نہیں۔

حج کا سفر عبدیت اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت ہے:

چناں چہ دیکھئے! جو شخص حجِ بیت اللہ کا ارادہ اور عزم کر کے گھر سے نکلتا ہے تو سفرِ حج کی ابتداء ہی میں وہ گھر بار، کاروبار اور جمیع احباب ورشتہ داروں کو خیر باد کہتا ہے، اور رب کے لیے سب کو چھوڑتا ہے، تو عازمِ سفرِ حج کے سر میں جو سودا سمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی تو ہے، جس کے حصول کے لیے وہ سفر کی مشقت بخوشی برداشت کرتا ہے، اور سفر بھی وہ جس میں جسم وجان، دل وایمان اور بحر وبر (خشکی وتری) کے خطرات موجود ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑے بڑے حلیم وبردبار بھی صبر وضبط کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں، اسی لیے تو سفر کو سقر کہا گیا، کہ سفر بھی ایک اعتبار سے عذابِ الٰہی کا ایک حصہ ہے، پھر سفرِ حج کا حال یہ ہے کہ اگر

کامیابی کے ساتھ ادا ہوگیا، یعنی حج قبول ہوگیا تو اس سے بڑی کامیابی اور سعادت نہیں:

"رَجَعَ کَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ". (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۲۲۱/ کتاب المناسك/ الفصل الأول)

حدیث میں ہے کہ کامیابی کے ساتھ اس سفر سے لوٹنے والا اپنے گناہوں سے ایسا پاک صاف ہوجاتا ہے کہ دھویا دھلایا اور گویا ماں کے پیٹ سے آج ہی دنیا میں آیا۔ اور اگر خدانہ خواستہ سفر کامیاب نہ ہوا، حج صحیح طریقہ سے سنت کے مطابق ادا نہ کیا، تو اس کے برابر کوئی ناکامی و بدبختی بھی نہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے گھر جائے اور وہاں سے اپنی بداعمالی و محرومی کی وجہ سے یوں ہی بے مراد واپس آجائے، بلکہ گناہوں اور شقاوتوں کی گٹھری جوں کی توں اپنی پیٹھ پر لاد کر آئے، بقولِ شاعر:

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
کس لیے آئے تھے، اور کیا کر چلے

ظاہر ہے کہ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہے؟ لیکن بندہ جب اس سفرِ پرخطر کا ارادہ محض اپنے مولیٰ کی رضا پانے اور اس کے حکم کے سامنے فنا اختیار کرنے کے لیے کرتا ہے تو وہ کریم کبھی محروم نہیں کرتا، اور عموماً حج کے اس سفرِ سعادت پر جو داعیہ اور جذبہ بندہ کو آمادہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور تسلیم و رضا ہے، اس لیے کہنا چاہیے کہ حج کا سفر سعادت، عبدیت اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت ہے، اور جس میں عبدیت اور اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں وہ حج سے محروم رہ جاتا ہے، اسے حدیث میں وارد وعید شدید سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں حج سے محرومی آخری وقت میں ایمان سے محرومی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ، آمین) اس سفر سے قصداً محروم رہنے والے بدنصیب ہیں، اور آگے بڑھنے والے خوش نصیب ہیں۔

حج کی میقات پر عبدیت کا منظر:

پھر سعادت مند لوگ حج میں منزلِ مقصود سے پہلے اس مرحلہ پر پہنچتے ہیں جہاں سے احرام کے بغیر گذرنا جائز نہیں، یہاں پہنچ کر عبدیت کا منظر نظر آتا ہے کہ حج کا یہ مسافر

اپنی ساری ظاہری زینت چھوڑ دیتا ہے،خوشبو استعمال نہیں کرتا، وہ مانوس اور سلا ہوا کپڑا نہیں پہنتا، نہ سر پر ٹوپی اور پگڑی، نہ جسم پر کوٹی وشیروانی، شاہ وگدا، رئیس ورعایا، حکام وعوام، نامی و عامی، امیر وفقیر دیکھتے ہی دیکھتے سب کے ہی پوشاک ولباس اور سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں، کیوں کہ حج کی اس میقات سے اب سب سے بڑے مہاراجہ اور شہنشاہِ مطلق کی راجدھانی کے حدود شروع ہوگئے ہیں، اب کوئی راجہ ہے نہ رعایا، بلکہ سب کے سب اسی کی رعایا ہیں، اور سارے کے سارے اس مالک الملک، احکم الحاکمین کے غلام ہیں، یہ ان کی غلامی کا منظر ہے:

ایک ہی لباس میں ہو گئے اب سب کے سب
اور حاضر ہو رہے ہیں اس طرح در بارِ رب
بندہ و صاحب، محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

سب کے بدن پر ایک ہی قسم کا کپڑا اور زبان پر ایک ہی قسم کا ترانہ:

”لَبَّیْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ، لَبَّیْكَ لاَ شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَكَ وَ الْمُلْكَ، لاَ شَرِیْكَ لَكَ“. (متفق علیه، مشکوٰة/ص:۲۲۳/باب الإحرام و التلبیة)

زبانوں پر یہ صدائیں ہیں، تو مردوں کے جسم پر دو سادہ چادریں ہیں، (مردوں کے لیے) گویا دربارِ الٰہی کی حاضری کی یہی انوکھی اور نرالی وردی ہے، جو کفن، قبر اور حشر کی یاد دلاتی ہے، اس حالت میں اس لیے بلایا گیا ہے کہ یہاں طلب ہے تو کفن پوشوں کی یا ان کی جو انہیں کی وضع قطع اختیار کر چکے ہیں، ان کی جو جیتے جی مُردوں کا لباس پہن چکے ہیں، آج اس میقاتِ حج سے حجاج کا صرف لباس ہی مردوں کا لباس نہیں بنا، بلکہ کہنا چاہیے کہ نفس بھی مُردہ بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ حج کا منظر جو قرآن نے پیش کیا وہ یہ ہے کہ:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ (البقرة : ۱۹۷)

یعنی حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا۔

لڑنا جھگڑنا، شہوتوں اور خواہشاتِ نفسانیہ میں مبتلا ہونا زندوں کا کام ہے، مردوں کو بھی کبھی کسی نے ایسا کرتے دیکھا ہے؟ احرام کا یہ لباس اور اس کی ساری پابندیاں بندوں کی بندگی، بے حیثیتی اور عیش دنیوی سے بے رغبتی کا حقیقی منظر ہے۔

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر:

اس کے بعد سفرِ سعادت کی اگلی بنیادی منزل اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا گھر ہے، یہاں پہنچ کر حجاجِ بیت اللہ فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں، انہیں عبدیت کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا، اور کعبۃ اللہ پر نظر پڑتے ہی بس مست ہو جاتے ہیں، پھر انہیں کچھ یاد نہیں رہتا، بالکل وہی منظر جو کسی نے یوں بیان کیا:

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر ☆ کیا چیز ہے دنیا؟ بھول گیا
یوں ہوش وخرد مفلوج ہوئے ☆ دل ذوقِ تماشا بھول گیا
پھر روح کو اذنِ رقص ملا ☆ خوابیدہ جنون بیدار ہوا
جلوؤں کا تقاضا یاد رہا ☆ نظروں کا تقاضا بھول گیا
احساس کے پردے لہرائے ☆ ایمان کی حرارت تیز ہوئی
سجدوں کی تڑپ اللہ اللہ ☆ سر اپنا سجدہ بھول گیا
جس وقت دعا کو ہاتھ اٹھے ☆ یاد آ نہ سکا جو سوچا تھا
اظہارِ عقیدت کی دُھن میں ☆ اظہارِ تمنا بھول گیا
پہنچا جو حرم کی چوکھٹ تک ☆ اک ابر کرم نے گھیر لیا
باقی نہ رہا یہ ہوش مجھے ☆ کیا مانگ لیا؟ کیا بھول گیا؟
ہر وقت برستی ہے رحمت ☆ کعبہ میں جمیلؔ اللہ اللہ
خاطی ہوں میں کتنا؟ بھول گیا ☆ عاصی ہوں میں کتنا؟ بھول گیا

یوں تو زندگی میں بڑی بڑی حسین وجمیل عمارتیں اورفنِ تعمیر کے خوبصورت ترین نمونے ہم لوگ دیکھتے ہیں،لیکن کعبۃ اللہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسی رعنائی ودل کشی رکھی ہے کہ وہ منظرآنکھوں میں کھپااوردل میں سما جاتا ہے،وہاں کے حقیقی انوار کاادراک تو اہلِ قلب ونظر کرتے ہیں،لیکن وہاں کے جلال و جمال کا منظر تو ہم جیسے کم ظرفوں کوبھی نظرآجاتا ہے، روایتوں میں آتا ہے کہ کعبۃ اللہ پرنظرکرنا عبادت ہے،اس عاجز کا خیال ہے کہ اجروعبادت سے قطع نظرکرکے ذوق وشوق، ولولہ اوروالہانہ جذبہ سے کون سا دل خالی ہوگا؟ بس نظر پڑتے ہی دل بے تاب ہوجاتا ہے! جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہیں،اس کے دیکھنے سے ایک طرف آنکھوں کا نور، دل کا سرور بڑھتا ہے،اوردل کی بے چینی کافوراورجسم کی تکان دورہوجاتی ہے ،تو دوسری طرف یہ وہ نعمت ہے کہ اس کی قیمت میں اگر صدہا سفر اور ہر سفر کی صدہا کلفتیں ،زحمتیں اورتکلیفیں برداشت کرنی پڑے تورب ِکعبہ کی قسم! سودا پھربھی بہت ہی سستا ہے۔

اَللّٰھُمَّ زِدْھٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَ تَعْظِیْمًا وَتَکْرِیْمًا وَمَھَابَۃً، وَزِد مَنْ شَرَّفَہٗ وَکَرَّمَہٗ مِمَّنْ حَجَّہٗ أَوِاعْتَمَرَہٗ تَشْرِیْفًا وَتَکْرِیْمًا وَتَعْظِیْمًا وَ بِرًّا، اَللّٰھُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ، فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ“.

مطاف کا منظر:

صاحبو! اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کی طرف منسوب مقدس چیزوں سے بھی محبت بلکہ والہانہ کا تعلق رکھے،اسی بنیاد پرحجاج بیت اللہ بھی خانۂ کعبہ اوراس کے مقدس مقامات سے عقیدت وعظمت کا معاملہ کرتے ہیں،خانۂ خدا کا دیوانہ وار چکرلگاتے ہیں،مطاف کا حال یہ ہے کہ ایامِ حج ہی میں نہیں، بلکہ فتحِ مکہ مکرمہ سے آج تک فرض نمازوں کے علاوہ دن رات کے کسی گھنٹہ یا گھڑی میں خالی نہیں رہتا، ہرآن اور ہرلمحہ مطاف میں طواف کا چکر مسلسل جاری رہتا ہے،صبح وشام کے ٹھنڈے وقتوں کی بات نہیں، رات کے ایک دو بجے جاکر دیکھئے،ٹھیک دوپہر کی تیز گرمی میں جاکر دیکھئے،ہروقت مشتاقانِ

بیت اللہ طواف میں مشغول ہیں، اور ایک دو نہیں، سیکڑوں کی تعداد میں شمع پر پروانوں کی طرح برابر بیت اللہ کا طواف کرتے نظر آئیں گے، سبحان اللہ، مگر یہ عجیب پروانے ہیں کہ آگ میں جلنے کے بجائے ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں جلنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، بعض اہلِ ہمت تو بیس بیس تیس تیس طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ فضائلِ حج میں احیاء کے حوالے سے منقول ہے کہ کُرز بن وبرہؒ کا معمول یہ رہا کہ وہ ستر طواف دن میں اور ستر طواف رات میں کرتے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق ابن ابی روادؒ کا بیان ہے کہ ''حج کے دوران میں نے ان کو نہ رات میں سوتے دیکھا، نہ دن میں، بس ہر وقت طواف، نماز یا تعلیم و تعلّم میں مصروف دیکھا۔'' خارجہؒ کہتے ہیں کہ ''کعبۃ اللہ میں چار شخصوں نے ایک رات میں قرآن مکمل کیا، ان میں ایک امام ابوحنیفہؒ بھی ہیں۔'' یہ بھی منقول ہے کہ امام صاحبؒ نے اپنے آخری حج میں کعبۃ اللہ کے اندر ایک پیر پر کھڑے ہو کر نصف قرآن اور دوسرے پیر پر کھڑے ہو کر دوسرا نصف قرآن پڑھا، اس کے بعد دعا کی کہ الٰہی! میں نے اپنی بساط کے مطابق تجھ کو پہچان لیا، لیکن تیری عبادت کا حق ادا نہ کر سکا، لہٰذا کمالِ معرفت کے عوض نقصانِ خدمت سے درگذر فرما، کہتے ہیں کہ بیت اللہ کے ایک گوشہ سے آواز آئی کہ تم نے اچھی طرح پہچانا اور خالص خدمت کی، جس کے عوض ہم نے تمہاری اور تمہارے سچے متبعین کی مغفرت کر دی۔

(اعیان الحجاج: ۱/ص: ۱۱۰، اصلاحی مضامین/ ج: ۲/ص: ۲۳۴)

آج بھی اللہ تعالیٰ کے گھر کے گرد طواف کرنے والوں میں نہ معلوم کتنے فرزانے ایسے ہوتے ہیں کہ طواف سے نہ ان کے پیر تھکتے ہیں نہ دل بھرتا ہے۔

بہر کیف! جس کعبہ کو ربِ کعبہ نے خود ہی ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ (البقرة : ۱۲۵) (لوگوں کے بار بار لوٹ کر آنے کی جگہ) بنایا ہو وہ عشاق سے کیسے خالی رہ سکتا ہے؟

منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کا منظر:

طوافِ بیت اللہ کے علاوہ حج کے دیگر ارکان واعمال کی ادائیگی کے لیے حجاج بحکمِ

خدا کعبہ کو خیر باد کہتے ہوئے (۸/ ذی الحجہ کو) منیٰ ،(۹/ ذی الحجہ کو) عرفات جہاں اپنے سارے گناہوں کا کیا جاتا ہے اعتراف، پھر (رات میں) مزدلفہ (اور ۱۰/ ذی الحجہ کو) پھر منیٰ) کا رُخ کرتے ہیں، تو وہاں کا منظر بھی نہایت پر کیف کہ بظاہر تو جنگل ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہے، جس کی وجہ سے جنگل میں منگل نظر آتا ہے، لاکھوں کی تعداد میں حجاج وعشاق موجود! اور جسے دیکھئے وہی (مرد) دو سادہ سفید چادروں میں ملبوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق فرشتوں نے آج منیٰ، عرفات ومزدلفہ کی یہ زمین بسائی ہے، نورانی صورتیں، ہر وقت ذکر الٰہی سے تر زبانیں اور زبان پر لبیک لبیک کی صدائیں ! آج سے ہزار سال پہلے کا جو منظر حدیث میں بیان ہوا: ”نَصْرُخُ بِالْحَجِّ صُرَاخًا“ آج صدیوں کے بعد بھی بحمد اللہ! حج کا وہی پر کیف منظر بیت اللہ، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں نظر آتا ہے، افعالِ حج کے یہ مناظر اور حجاج کی یہ ساری ادائیں بتلاتی ہیں کہ عشق ومحبت کی صحیح اور حقیقی حقدار صرف اور صرف وہی ذاتِ پاک ہے جس نے ہمیں اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو پیدا کیا، اگر چاہنا ہو تو اسی کو چاہو، پکارنا ہو تو اسی کو پکارو، مانگنا ہو تو اسی سے مانگو، ماننا ہو تو اسی کو مانو، کسی کی یاد میں سرگرداں پھرنا ہو تو اسی کی یاد میں سرگرداں پھرو! سب کچھ وہی ہے، اور ہم سب اسی کے بندے ہیں، بندگی ہمارا مقصد زندگی ہے، ایک بندہ کا سب سے بڑا کمال عبدیت پیدا کرنا ہے، جس کا ذریعہ عبادت ہے، بالخصوص حج! جیسا کہ واضح ہو گیا۔

حق تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت بار بار نصیب فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۱۷)

یومِ عرفہ کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَـنۡ أَبِـیۡ قَتَـادَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰہ ﷺ: ''صِیَامُ یَوۡمِ عَرَفَۃَ إِنِّـیۡ اَحۡتَسِـبُ عَـلٰـی الـلّٰـہِ أَنۡ یُّـکَـفِّـرَ السَّنَۃَ الَّتِـیۡ قَبۡلَـہٗ، والسَّنَۃَ الَّتِیۡ بَعۡدَہٗ''.

(الترمذی/ص:۹۲/أبواب الصوم/ باب فضل صوم، مشکوٰۃ/ ص:۱۷۹ بحواله مسلم/ باب صیام التطوع/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشادفرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ صومِ عرفہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ (کے صغیرہ گناہوں) کا کفارہ ہوجائے گا''۔

یومِ عرفہ سال کا سب سے افضل دن:

انسان اللہ جل شانہ کی بہت ہی پیاری مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص اس کے نفع کے لیے یہ دنیا اور اس کی رنگینیاں پیدا فرمائیں:

﴿هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّافِی الۡأَرۡضِ جَمِیۡعًا﴾ (البقرۃ: ۲۹)

وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے پیدا کیا۔

پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ روئے زمین پر اس کو اپنی نیابت دی، اور ساتھ ساتھ اس کو

ہدایت کے اسباب و ذرائع اور مواقع بھی عنایت فرمائے، ہم سوچ سکتے ہیں کہ انسان کے ساتھ اللہ رب العالمین سے بڑھ کر پیار و محبت کا کیا کوئی معاملہ کرسکتا ہے؟ اب یہ ایک انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کی محبتوں، عنایتوں اور بخششوں کے موقعوں سے فائدہ اٹھائے، جن میں سے ایک بہترین موقع یومِ عرفہ ہے، جس کو ایک بہت ہی زبردست فضیلت اور خصوصیت یہ حاصل ہے کہ دینِ اسلام کی تکمیل اسی دن ہوئی۔

علماء محققین نے فرمایا کہ جس طرح مہینوں میں حق تعالیٰ نے چار مہینوں کو محترم بنایا

﴿مِنْهَآ أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ (التوبة: ٣٦)

یعنی محرم، رجب، ذوالقعدۃ، اور ذوالحجہ، یہ اشہر حرم کہلاتے ہیں، اسی طرح دنوں میں چار دنوں کو محترم بنایا، وہ ہیں: یومِ جمعہ، یوم الفطر، یوم الاضحیٰ اور یوم عرفہ، پھر ان چار دنوں میں بھی سب سے زیادہ حرمت و فضیلت والا دن یومِ عرفہ ہے، چناں چہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا إِذَا قِيلَ: ”أَفْضَلُ أَيَّامِ السَّنَةِ فَهُوَ عَرَفَةُ، وَأَفْضَلُ أَيَّامِ الْأُسْبُوعِ فَهُوَ الْجُمُعَةُ“. (مرقاة شرحِ مشکوٰة/ ص: ٣/٢٣٢)

مطلب یہ ہے کے سال کے دنوں میں سب سے افضل دن ”یومِ عرفہ“ ہے، البتہ ہفتہ کے دنوں میں سب سے افضل دن یومِ جمعہ ہے۔

یومِ عرفہ جمعہ کو ہو تو فضیلت بڑھ جاتی ہے:

پھر اگر ”یومِ عرفہ“ جمعہ کو واقع ہو جائے تب تو اس کی فضیلت میں چار چاند لگ جاتے ہیں، کیوں کہ حدیث پاک میں اس کی نہایت عظیم الشان فضیلت وارد ہوئی ہے، فرمایا:

”أَفْضَلُ الْأَيَّامِ يَوْمُ عَرَفَةَ وَافَقَ يَوْمَ جُمُعَةٍ، وَهُوَ أَفْضَلُ مِنْ سَبْعِينَ حَجَّةً فِيْ غَيْرِ يَوْمِ جُمُعَةٍ“. (جامع الأصول فی أحادیث الرسول/ الباب السابع فی فضل ما ورد ذکره من الأزمنة/ یوم عرفة)

(لیکن اس روایت کی صحت میں علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے کلام کیا ہے) یعنی یوم عرفہ (جو حج کا اصل دن ہے وہ) جب جمعہ کے دن واقع ہوتو اس سال کا حج غیر جمعہ کے حج پر ستّر (۷۰) درجہ فضیلت رکھتا ہے۔لیکن اس موقع پر ایک غلط فہمی دور کر لیجئے کہ جمعہ کے حج کا ''اکبری حج'' سے عوام میں مشہور ہونا بے اصل ہے،اور جہاں تک قرآنِ کریم میں ''حجِ اکبر'' کی بات ہے تو خوب سمجھ لو! وہ حجِ اصغر یعنی عمرہ کے مقابلہ میں ہے۔

البتہ عارفین نے اس کی ایک فضیلت یہ بھی بیان فرمائی کہ یوم عرفہ میں تو حجاجِ کرام کی مغفرت ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے ہی،خواہ بلا واسطہ مغفرت کی جائے یا بالواسطہ،مگر یومِ عرفہ جمعہ کو ہوتو حق تعالیٰ حاجی وغیر حاجی سب کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔بہر کیف! یومِ عرفہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور معرفت حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہے،اسی لیے روایت میں ہے کہ شیطان ایک تو اس وقت سب سے زیادہ ذلیل ہوا جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی،اس کے بعد اب ہر سال یومِ عرفہ میں نہایت ذلیل ہوتا ہے کہ وہ مغفرت کا موقع اور دن ہے۔

ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ابن جارودؒ ایک مرتبہ اپنے کسی ساتھی کے ساتھ یوم عرفہ کی شام کو سفر میں نکلے،تو قومِ لوط کے شہروں سے ان کا گذر ہوا،انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ'' آؤ اس عذابِ الٰہی سے ہلاک شدہ شہروں کو دیکھ چلیں،تاکہ عبرت ونصیحت حاصل ہو'' کہتے ہیں کہ ابھی تو اس بستی میں داخل ہورہے تھے کہ ایک کوسج (بے داڑھی والا) گردآلود چہرہ لیے ہوئے ہمیں ملا،ہم نے پوچھا کہ کون ہو؟ تو وہ غافل سا ہوگیا،ہمیں شک ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ شیطان ہی ہے،تحقیق کرنے پر اس نے اقرار کیا کہ میں ہی بدنامِ زمانہ شیطان ہوں،ہم نے کہا کہ اس وقت کہاں سے گڑبڑ گھوٹالا کرکے آیا؟ کہنے لگا کہ ''سچی بات یہ ہے کہ آج یومِ عرفہ میں میدانِ عرفات سے مایوسی کے ساتھ میں کچھ

تسلی حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں، کیوں کہ میں نے دیکھا کہ جو لوگ سالہا سال سے گناہوں میں مبتلا تھے آج یومِ عرفہ میں رحمتِ الٰہی کی بارش نے ان کی مغفرت کردی اور میری ساری محنت برباد ہوگئی، اس لیے اب اپنے سر پر خاک ڈالتا ہوا قومِ لوط کی بستی میں ان معذبین کو دیکھنے آیا ہوں، تاکہ میرا غم وغصہ ذرا ٹھنڈا ہو۔'' (از: نزہۃ المجالس مترجم/ص: ۱/۳۳۸)

یومِ عرفہ اور عشرۂ ذی الحجہ کے روزوں کی فضیلت:

الغرض! یومِ عرفہ اللہ تعالیٰ کی معافی اور معرفت ومغفرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، پھر اگر کسی خوش نصیب بندے کو اس دن روزہ رکھنے کی توفیق مل جائے تو اس کی مغفرت یقینی ہوجاتی ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا: ''اس دن روزہ رکھنے والے کے لیے مجھے اللہ پاک کی ذاتِ عالی سے قوی امید ہے کہ اس کے اگلے اور پچھلے سال کے گناہ معاف ہوجائیں گے۔''

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یومِ عرفہ کے روزے کی فضیلت جو بیان ہوئی اس میں اس بات کی ضمانت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یومِ عرفہ کا روزہ رکھنے والا اگلے ایک سال تک زندہ رہے گا، تبھی تو فرمایا:

''أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهٗ، وَالسَّنَةَ الَّتِيْ بَعْدَهٗ''.

اگر یہ اگلے سال زندہ ہی نہیں رہے گا تو گناہ کرنے اور معاف کرنے کا سوال ہی کیا ہے؟ گویا یومِ عرفہ کے روزے سے روزہ دار نے اپنی ایک سالہ زندگی کی ضمانت بھی لے لی اور انشورنش بھی کرالیا۔

تاہم عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اگر آئندہ سال انتقال ہوگیا تو مغفرت کے ساتھ مرے گا، اور جی گیا تو مغفرت کے ساتھ جیئے گا۔ واللہ اعلم۔

ایک روایت میں یومِ عرفہ کے روزے کی فضیلت ہزار روزوں کے برابر بیان

فرمائی گئی ہے، (ترغیب) جیسے سال بھر میں سب سے افضل رات شبِ قدر ہے، جس میں عبادت کا ثواب ہزار مہینوں کے برابر ہے، ایسے ہی سال بھر کے دنوں میں سب سے افضل دن یومِ عرفہ ہے، جس میں روزہ رکھنے کا ثواب ہزار روزوں کے برابر ہے، حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایسا کوئی دن نہیں ہے جس میں عبادت کرنا عشرۂ ذی الحجہ سے زیادہ افضل ہو، اس میں سے ہر دن کے روزے کو ایک ایک سال کے روزوں کے برابر قرار دیا جاتا ہے اور اس میں سے ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر قرار دی جاتی ہے۔''

(ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۲۸/باب فی الأضحیة /الفصل الثانی)

اکابر کا صومِ عرفہ کا اہتمام:

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ ''بعض لوگ ایسی حدیثوں میں شک کرنے لگتے ہیں جن میں کسی عمل کا ثواب اور ثمرہ ان کے خیال کے لحاظ سے بہت زیادہ اور غیر معمولی بیان کیا گیا ہو، جس طرح کہ حدیث میں عرفہ کے روزے کے بارے میں فرمایا گیا ہے، تو اس شک کی بنیاد ارحم الراحمین کی رحمت و کرم کی وسعت سے ناآشنائی ہے، اللہ تعالیٰ انتہائی کریم اور مختارِ مطلق ہے، جس دن کے جس عمل کی اپنے کرم سے جتنی بڑی چاہے قیمت مقرر فرمائے، لہٰذا اگر حدیث صحیح ہو تو ہمیں اس میں وسوسہ اور شک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

پھر صومِ عرفہ کے بارے میں ہمارے اکابر کا خصوصی عمل بھی رہا ہے، ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا احمد لولات صاحبؒ خلیفۂ اجل حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنے رسالہ میں تحریر فرمایا کہ ''حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ بچپن ہی سے یوم عرفہ کا روزہ رکھا کرتے تھے، اور اس میں افطار کے بعد ایک پیالی چائے کے علاوہ رات میں کچھ نہیں کھاتے تھے، فرمایا کرتے کہ ''اللہ تعالیٰ کے یہاں کل کو دعوت ہے''۔ (فضائل عشرہ ذی الحجہ و مسائلِ قربانی

/ص:۴۸)

ایک بزرگ نے مکہ مکرمہ میں دیکھا کہ ایک شخص اس طرح دعا مانگ رہا ہے:
''یا اللہ! یومِ عرفہ میں روزہ رکھنے والوں کے حق سے مانگتا ہوں، تو مجھے عرفہ کے ثواب سے محروم نہ فرما۔'' بزرگ نے اُس سے اس دعا کے بارے میں دریافت کیا تو اس کی وجہ یہ بتلائی کہ میرے والد صاحبؒ ہمیشہ یہ دعا مانگتے تھے، جب ان کا انتقال ہوگیا تو میں نے خواب میں ان کو دیکھا کہ بہت ہی خوش وخرم ہیں، فرمانے لگے: ''جب میں قبر میں رکھا گیا تو میرے پاس ایک نور نمودار ہوا، اور مجھ سے کہا گیا کہ یہ عرفہ کا ثواب ہے، آج اس کی وجہ سے تجھ پر کرم کیا ہے''۔ (از: نزہۃ المجالس مترجم/ص:۳۳۹/۱)

یومِ عرفہ کی مزید فضیلت:

اس کے علاوہ بعض تاریخی روایتوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یومِ عرفہ پہلے ہی سے فضیلت والا ہے، اس لیے کہ چار اولوالعزم پیغمبروں پر خاص انعام یوم عرفہ میں نازل کیا گیا، (۱) سیدنا آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ (۲) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی کا شرف عطا ہوا۔ (۳) سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر ذبیح کا فدیہ اتارا گیا۔ (۴) سیدنا محمد ﷺ پر حج کے ارکان اور دینِ اسلام کو مکمل کیا گیا۔ تکمیلِ نعمت کی یہ آیت: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدة : ۳) یومِ عرفہ کو میدانِ عرفات ہی میں نازل ہوئی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ورحمت والے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں اپنی نجات کا سامان مہیا کرنا چاہیے۔

حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور اپنی کامل محبت ومعرفت نصیب فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۱۸)

قربانی کی حقیقت وفضیلت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ زَيۡدِ بۡنِ أَرۡقَمَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ أَصۡحَابُ رَسُوۡلِ اللّٰهِ ﷺ: ”يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! مَا هٰذِهِ الۡأَضَاحِيُ؟“ قَالَ: ”سُنَّةُ أَبِيۡكُمۡ إِبۡرَاهِيۡمَ عَلَيۡهِ السَّلَامُ!“ قَالُوۡا: ”فَمَا لَنَا فِيۡهَا يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ!“ قَالَ: بِكُلِّ شَعۡرَةٍ حَسَنَةٌ“، قَالُوۡا:” فَالصُّوۡفُ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ!“ قَالَ: ”بِكُلِّ شَعۡرَةٍ مِّنَ الصُّوۡفِ حَسَنَةٌ“. (روه أحمد وابن ماجة، مشكوٰة /ص:۱۲۹/ باب فی الأضحية/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمتِ عالم ﷺ سے صحابہؓ نے دریافت کیا کہ ”یا رسول اللہ! یہ قربانی (اس کی حقیقت) کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت (اوران کا جاری کردہ طریقہ) ہے“ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”اس میں ہمارے لیے کیا (فضیلت) ہے؟ اے اللہ کے رسول!“ تو فرمایا: (قربانی کے جانور کے بدن پر جتنے بال ہیں) ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ہے“ صحابہؓ نے پوچھا: ”حضور! اون“ (والے جانور میں کیا حکم ہے؟ کیوں کہ اس کے بدن پر بال بہت کثرت سے ہوتے ہیں، یا اون پر چوں کہ بال کا اطلاق نہیں ہوتا، تو کیا اس میں بھی یہی فضیلت ہے؟) فرمایا: ”اس میں بھی ہر بال کے عوض ایک نیکی ملے گی۔“

کامیابی قربانی سے ملے گی:

یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اپنے مشن اور مقصد میں قربانی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، خواہ ایک کامیاب تاجر بننا ہو یا مقبول لیڈر، مقتدائے قوم بننے کی تمنا ہو یا سربراہِ مملکت، بہر حال کامیابی کے لیے چھوٹی بڑی علمی، عملی اور مالی و وقتی قربانی پیش کرنی پڑتی ہے، حتیٰ کہ ایک وقت کا کھانا بھی ہمیں اس وقت تک میسر نہیں ہوسکتا جب تک ہم آٹا، چاول اور سبزی ترکاری وغیرہ پر نقدی اور اس کو پکانے میں علمی و عملی اور وقت کی قربانی پیش نہ کریں، جب معمولی ضرورت بغیر قربانی کے پوری نہیں ہوسکتی تو زندگی اور اس کے ہر عمل کا حقیقی مقصد یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا بغیر قربانی کے کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ حضراتِ انبیاء، صحابہؓ اور صلحاء نے اس کے لیے عظیم ترین قربانیاں پیش کیں، تبھی انہیں رضائے الٰہی کا پروانہ ملا، اوران پر عظمتوں کے چار چاند لگے، اسی لیے فرمایا کہ

عظمتِ انسان وابستہ ہے قربانی کے ساتھ
قوتِ ایمان وابستہ ہے قربانی کے ساتھ

حاصل یہ کہ عقل ونقل اس بات پر شاہد ہیں کہ کسی بھی شعبہ میں حقیقی کامیابی چالاکی سے نہیں، قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔

قربانی کی حقیقت:

اور قربانی کی حقیقت یہی نہیں کہ ایامِ نحر یعنی قربانی کے دنوں میں جانوروں کو ذبح کر کے خوب پیٹ بھر کر ان کا گوشت کھالو اور بس، بلکہ اس چھ حرفی لفظ ''قربانی'' میں بھی کافی وسعت ہے۔ علماء نے فرمایا کہ ''قربانی'' قرب سے مشتق ہے، جس کا مفہوم ہے قریب ہونا، قربانی اپنے حقیقی معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے وہ عمل اور شئی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کا قرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے قربان کیا جائے، جس کی ابتداء عبدیت سے ہوتی

ہے، پھر خواہشات، جذبات، احساسات اور اموال و اوقات کو وصول کرتی ہوئی فنائیت پر اس کی انتہاء ہوتی ہے، سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت میں ہر قسم کی قربانی اپنے حقیقی معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے پائی جاتی تھی، شاید اسی لیے قربانی کی حقیقت دریافت کرنے پر حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: ''سُنَّةُ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ'' در حقیقت یہ تمہارے والد روحانی سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک عظیم الشان یادگار ہے، کیوں کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو قربانی پیش کی تھی وہ دل، روح، اور ماسوا اللہ اور غیر اللہ کی قربانی تھی، جذبات، احساسات، امیدوں اور آرزوؤں کی قربانی تھی۔

قربانی کا واقعہ:

رہی بات جانور کی قربانی کی، تو اس قربانی کا بحیثیت عبادت مشروع ہونا اگر چہ سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانے سے ثابت ہے، لیکن اس کی ایک خاص شان حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی، اور اسی کی یادگار کی حیثیت سے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربانی کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

اس واقعہ کی روداد کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بذریعۂ خواب حکم ملا کہ ''ہماری راہ میں اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز کی قربانی دو'' پیغمبر کا خواب الہام اور وحیِ الٰہی ہوتا ہے، پھر ''اَلْعَاقِلُ تَكْفِيهِ الْإِشَارَةُ'' لہٰذا سمجھ گئے کہ پیارے اسماعیل کی قربانی مطلوب ہے، کیوں کہ اس وقت روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نورِ نظر، لختِ جگر بیٹے اسماعیل سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں تھی۔

مگر چوں کہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا، بلکہ اس امتحان و آزمائش کا دوسرا جزو وہ بیٹا اسماعیل تھا، جس کی قربانی کا حکم ہوا، اس لیے بیٹے کو اپنا خواب اور اللہ تعالیٰ کا حکم سنا دیا، وہ بھی ایسے بول اُٹھے جیسے کوئی اہم بات نہ ہو، ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمائیں:

﴿يٰبُنَيَّ إِنِّىٓ أَرٰى فِى الْمَنَامِ أَنِّىٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (الصافات: ۱۰۲)

میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں خود تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ بیٹا! اس سلسلہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اللہ اکبر!

اندازہ لگائیں مشورہ کس بات کا؟ خود اسی کے ذبح کے بارے میں اسی سے کیا جارہا تھا، ہائے! کیا دنیا کی تاریخ میں کسی شفیق، خلیق اور خلیل باپ نے اپنے گوشۂ جگر کے سامنے اس طرح کی تجویز پیش کی ہے؟ ہر صاحبِ اولاد دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچے! مگر یہاں حکم الٰہی یہی تھا، اور حبِ الٰہی کے بعد حکمِ الٰہی کی تکمیل آسان ہوتی ہے نا!۔

پھر یہ بھی تو دیکھئے! یہ بیٹا کس کا تھا؟ مجد الانبیاء اور پیکر تسلیم و رضا کا، اس کی رگوں میں خون اسی کا دوڑتا تھا جو اللہ تعالیٰ کا حکم بے چون و چرا مانتا تھا، یہ پھل بھی اسی درخت کا تھا! اسی لیے سرِ تسلیم خم کرنے میں ذرّہ برابر توقف سے کام نہ لیا، نہ کسی منطقی جواب کا سہارا لیا، کہ ابا جی! چھوڑئے یہ سب باتیں، یہ تو خواب ہے، بھلا اس کا حقیقی زندگی سے کیا واسطہ؟ نہیں، بلکہ فوراً تیار ہوگئے، کہنے لگے:

﴿ يَٰٓأَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِيٓ إِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ (الصافات: ۱۰۲)

ابا جان کر گذرئے اس کام کو جس کا آپ کو حکم ملا ہے، میری قربانی آپ کے خواب کی تعبیر و تفسیر ہے، اگر میرے رب کی یہی مرضی ہے تو میں تیار ہوں! ان شاء اللہ اس راہ میں آنے والی تکلیف پر آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔

مرضی تری ہر وقت جس کے پیش نظر ہے
پھر اس کی زبان پر نہ "اگر" ہے، نہ "مگر" ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ہم چوں اسماعیل پیش سر بنہ
شاد و خندہ پیش تیغش جان بدہ

یعنی حکم الٰہی کے سامنے فداکاری کا جذبہ تو سیدنا اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام سے

سیکھو! اور ہنسی خوشی اس (حکم الٰہی) کی تلوار سے قتل ہو جاؤ! حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی میں غور کرو! اللہ اللہ! کیا منظر ہے! رضائے الٰہی کو پانے کے لیے حکم الٰہی کی تکمیل میں باپ قربانی کرنے کو تیار ہے، تو بیٹا قربان ہونے کو!

﴿فَلَمَّآ أَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ﴾ (الصافات: ۱۰۳)

پھر جب حکم الٰہی کی تعمیل اور تکمیل کے لیے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کو پیشانی کے بل لٹایا، تو وہ ایسا دردناک منظر تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو کما حقہٗ بیان نہیں کر سکتے، آیتِ کریمہ سے اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

المختصر! سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام نے سیدنا ذبیح اللہ علیہ السلام کی گردن پر جوں ہی چھری چلائی معاً قدرتِ حق سے بیٹے کی جگہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے لائے ہوئے جنتی مینڈھے نے لے لی، اور اس فقید المثال قربانی کے نتیجہ میں کامیابی کا سرٹیفکٹ اور ﴿وَفَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ﴾ (الصافات: ۱۰۷) کا پروانۂ بشارت پا کر زندۂ جاوید ہو گئے، یہ قربانی بارگاہِ الٰہی میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطورِ یادگار ہمیشہ کے لیے ملتِ ابراہیمی وامتِ محمدیہ کا شعار قرار پائی، اسی کو فرمایا: "سُنَّةُ أَبِیۡكُمۡ إِبۡرَاهِیۡمَ".

جب معلوم ہو گیا کہ جانوروں کی قربانی ابراہیمی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جانور کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کرنا اس فریضہ سے سبک دوش نہیں کر سکتا، جیسے نماز کی جگہ روزہ اور زکوٰۃ کی جگہ حج کافی نہیں، اسی طرح قربانی کی جگہ صدقہ کافی نہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اور واجب قربانی ادا نہ ہوگی۔

قربانی کا حکم ہر زمانے اور ملت میں رہا ہے:

میرے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد صدیق صاحب جامعی بڑودوی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ "حدیث پاک کے اس جملہ: "سُنَّةُ أَبِیۡكُمۡ إِبۡرَاهِیۡمَ" سے دو باتیں قربانی کی حقیقت وفضیلت سے متعلق ثابت ہوئیں:

(۱) اسلام اپنے آباء واجداد کے طریقوں کی مطلق اور اصلاً مخالفت نہیں کرتا، بلکہ ان کا احترام کرتا ہے، جس کی مثال یہی واقعۂ قربانی ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے "سُنَۃُ أَبِیْکُمْ إِبْرَاھِیْمَ" حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے نبی کے جدامجد اور ہمارے روحانی آباء واجداد میں سے ہیں، جن کا پاکیزہ طریقہ قربانی کی شکل میں اسلام نے باقی رکھا، البتہ اسلام باپ دادا کے اس طریقہ کی مخالفت کرتا ہے جو شریعت کے بجائے جہالت وضلالت پر مبنی ہو، ورنہ نہیں، چناں چہ حدیث مذکور میں تو "سُنَۃُ أَبِیْکُمْ إِبْرَاھِیْمَ" فرما کر گویا باپ دادا کے طریقہ کو یاد دلا کر اس کی ترغیب دلائی، بلکہ فضیلت بتلائی۔

(۲) دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ قربانی کوئی نیا طریقہ نہیں ہے، جس کا حکم دین اسلام نے ہی دیا ہو، بلکہ یہ تو پرانے زمانے کی عبادت ہے، اس کا حکم بھی ہر امت کو دیا گیا ہے، جیسا کہ آیت قرآنی سے ثابت ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَلِکُلِّ أُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا﴾ (الحج : ۳٤)

قربانی ہر امت کے لیے ہم نے ضروری قرار دی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "لفظ "مَنْسَکُ" اور "نُسُکُ" عربی زبان میں کئی معنیٰ کے لیے بولے جاتے ہیں، مثلاً ایک معنیٰ میں افعالِ حج کے لیے بولے جاتے ہیں، دوسرے معنیٰ میں مطلق عبادت کے لیے بولے گئے ہیں، تیسرے معنیٰ میں قربانی کے لیے بھی استعمال ہوے ہیں، قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر یہ لفظ ان تینوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، اس لیے یہاں تینوں معانی مراد ہوسکتے ہیں۔

(معارف القرآن/ص:۲٦٦/٦)

بہر کیف! قربانی پرانی عبادت ہے، اسی لیے دنیا میں گوشت خوری کا دستور بھی انتہائی قدیم ہے، لیکن اسلام سے پہلے لوگ کبھی مردار کا تو کبھی زندہ جانور کے کچھ اعضاء کا گوشت ضرورت کے مطابق کاٹ کر کھا لیتے، اسلام نے سب سے پہلے تو مردار کے گوشت کو

حرام قرار دیا، جو جسمانی و روحانی اعتبار سے نقصان کا سبب ہے، پھر جن جانوروں کو حلال کیا ان کا گوشت کھانے میں بھی ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے ناپاک خون زیادہ سے زیادہ نکل جائے اور جانور کو بھی کم سے کم تکلیف ہو، چناں چہ حدیث قدسی میں حکم ہے:

"وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ"

(رواه مسلم، مشكوٰة/ص:۳۵۷/كتاب الصيد والذبائح/الفصل الأول، حديث قدسى نمبر:٤)

کہ جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو خوبی اور نرمی کے ساتھ ذبح کرو، اس کے لیے ضروری ہے کہ ذبح سے پہلے اپنی چھری کو اچھی طرح تیز کرلو، تاکہ جانور جلدی کٹ جائے اور اسے تکلیف کم ہو، نیز ذبح کیے جانے والے جانور کو آرام دو، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ذبح کے بعد جانور کو اچھی طرح ٹھنڈا ہونے دو، اس کے بعد کھال کھینچنا شروع کرو۔

بہر حال! قربانی کا رواج پرانا ہے حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ قربانی کیا کرتے تھے، مگر بتوں کے نام کی، اسی لیے حضور ﷺ کو اس کا حکم ہوا کہ:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (الكوثر : ۲)

پیارے! جیسے نماز اللہ ہی کے لیے پڑھی جاتی ہے، ویسے ہی قربانی بھی اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے، تب یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہوگی۔

قربانی کی فضیلت:

صاحبو! اگر جانِ جگر کی قربانی کے بجائے ہمیں جانور کی قربانی پر قربِ خداوندی اور رضائے الٰہی نصیب ہو جائے تو کتنا سستا سودا ہے؟ اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے؟ شاید اسی لیے قربانی کے غیر معمولی اجر کو اس طرح بیان فرمایا کہ جانور کے جسم پر بال بے شمار ہوتے ہیں تو اس کا اجر بھی بے شمار ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قربانی کے جانور کو جب ذبح کیا جاتا ہے تو خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے قربانی کرنے والے کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے خون اور گوشت وغیرہ

کے ساتھ لا کر میزانِ عمل میں ستر درجہ وزنی بنا کر رکھا جائے گا۔ ایک متکلم فیہ روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ قربانی کے جانور کو قیامت میں پل صراط کی سواری بنا دیا جائے گا۔
(مظاہرِ حق جدید/ص: ۲/۳۵۳)

درسِ قربانی:

البتہ شرط یہ ہے کہ قربانی کا یہ عمل حکم الٰہی کی تعمیل میں خوش دلی اور خلوصِ نیت سے ادا کیا جائے، اللہ رب العزت کے یہاں یہی چیز مطلوب اور مقصود ہے، ارشاد ہے:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج: ۳۷)

اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے، نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں جو جانور قربانی میں پیش کیا جاتا ہے اس کی مالیت اور جسامت نہیں، بلکہ قربانی کرنے والے کی دلی کیفیت و حالت دیکھی جاتی ہے کہ خلوصِ نیت ہے یا نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کرنی چاہیے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی راہ میں کچھ قربانی کرنے کا جذبہ اور موقع دے تو فی الحقیقت یہ اسی کی عنایت ہے، اس لیے کہ ہمارے اور کائنات کی ساری مخلوق کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تو سب کا سب اسی خالق اور مالک کا عطیہ اور دیا ہوا ہے، موت و حیات، صحت و عافیت، اہل و عیال اور مال و منال سب کچھ اسی نے دیا ہے، اور کیا کچھ نہیں دیا؟ اب اس کے دیے ہوئے میں سے اسی کی راہ میں قربان کیا جائے تو اس پر احسان کیا ہوا؟ حق یہ ہے کہ ہمیں سب کچھ اس کے نام پر قربان کر کے بھی کہنا چاہیے اور زبانِ حال سے نہیں، بلکہ زبانِ قال سے کہ ”مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ“ ربِ کریم! ہم سے تیری بندگی کا حق ادا نہ ہو سکا۔ نیز کہنا چاہیے:

خدائے دو جہاں! منظور کر سب کی قربانی
عطا ہو ہم کو وہ ہمت وہ دل وہ روحِ ایمانی

جب رب کریم انسان کو ایک معمولی دانہ کی قربانی پر کئی دانے دیتا ہے تو بڑی قربانی پر کیا کچھ نہ دے گا۔ درسِ قربانی یہی ہے کہ ہم قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت یہ جذبہ اور سبق لیں کہ ابھی جانور کی قربانی کرتے ہیں، لیکن اس قربانی کے ساتھ ہم نفسانی خواہشات کو ربانی خواہشات پر ہمیشہ کے لیے قربان کردیں گے، اور بوقتِ ضرورت اپنی جان و مال سب کچھ رب کی رضا اور راہِ عشق و وفا میں قربان کردیں گے، یہی سنتِ ابراہیمی کی عظیم یادگار قربانی کا درس ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو یہ درس لینے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم میں قربانی کا سچا جذبہ پیدا فرمائے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۱۹)

محرم الحرام کی حرمت و عظمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : "أَفۡضَلُ الصِّيَامِ بَعۡدَ رَمَضَانَ شَهۡرُاللّٰہِ الۡمُحَرَّمُ". (رواہ مسلم، از: مشکوٰۃ/ص:۱۷۸/ باب صیام التطوع/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بہترین روزہ رمضان کے فرض روزوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے مہینے محرم کے روزے ہیں"۔

محترم مہینہ:

چاند کی سالانہ گردش پھر ایک بار اپنا دورہ تمام کر چکی، اور اسلامی سال کا آخری مہینہ ذی الحجہ ختم ہوکر اسلامی سال کا پہلا مہینہ محرم الحرام شروع ہو گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ میں جد رسول اللہ ﷺ کی قربانی کا واقعہ پیش آیا، تو محرم کی دسویں تاریخ میں سبط رسول اللہ ﷺ کی قربانی کا واقعہ پیش آیا، گویا اسلامی سال کا آخری مہینہ بھی قربانی والا ہے اور پہلا مہینہ بھی قربانی والا ہے، فرق اتنا ہے کہ پچھلا مہینہ ہم سے قربانی طلب کرتا ہے تو اگلا مہینہ ہم کو طلب کرتا ہے۔ غرض دونوں مہینے فضیلت، عظمت اور حرمت والے ہیں، لیکن محرم کی حرمت تو اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ محرم کے لغوی معنیٰ معظم اور محترم کے ہیں، قرآن کریم میں بیت اللہ شریف کی نسبت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ

السلام کی ایک دعا میں یہ الفاظ ہیں:

﴿رَبَّنَآ إِنِّیٓ أَسۡکَنتُ مِن ذُرِّيَّتِی بِوَادٍ غَیۡرِ ذِی زَرۡعٍ عِندَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ﴾ (إبراهيم: ۳۷)

جیسے کعبۃ اللہ فضیلت اور حرمت والا ہے، جس کی وجہ سے اسے محرم کہا گیا، ایسے ہی محرم بھی حرمت اور فضیلت والا ہے، جس کی وجہ سے اسے بھی محرم کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡراً فِی كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ مِنۡهَآ أَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ (التوبة: ۳٦)

یہ حقیقت ہے کہ مہینوں کی تعداد تو اللہ کے نزدیک بارہ ہی ہے، اس دن سے جب سے اس نے زمین وآسمان بنائے، اور ان میں سے چار مہینے خصوصاً حرمت والے ہیں، یعنی محرم، رجب، ذی القعدہ اور ذی الحجہ۔

اللہ تعالیٰ کا مہینہ:

پھر ان میں سب سے زیادہ حرمت وفضیلت محرم الحرام کو حاصل ہے، اسی لیے رحمتِ عالم ﷺ نے حدیث بالا میں اسے شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) فرمایا، حالاں کہ مہینے تو سارے اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، لیکن یہ مہینہ بہت محترم اور مبارک ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے "شَهۡرُ اللّٰهِ" فرمایا، جیسے مساجد تو سب اللہ تعالیٰ ہی کے گھر ہیں، مگر مسجد حرام کو 'بیت اللہ' اس کی عظمت وحرمت کی وجہ سے کہا جاتا ہے، اسی طرح اونٹنیاں تو ساری اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، مگر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو "نَاقَةُ اللّٰهِ" اس کی عظمت وحرمت کی وجہ سے کہا جاتا ہے، اسی طرح انبیاءِ کرام تو تمام کے تمام اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول ہیں، مگر ہمارے آقا ﷺ کو ان کی عظمت وحرمت کی وجہ سے "مُحَمَّدٌ رَسُوۡلُ اللّٰهِ" فرمایا گیا، اسی طرح مہینے تو سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، مگر محرم الحرام کو اس کی حرمت وفضیلت کی وجہ سے "شَهۡرُ اللّٰهِ" فرمایا، محرم کی حرمت کے

لیے یہی کافی ہے۔

مزید فرمایا کہ یہ ایسا محترم مہینہ ہے کہ نفلی روزوں میں رمضان کے بعد اسی ماہ میں روزہ رکھنا سب سے زیادہ فضیلت کا باعث ہے "أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ" فرمایا، یعنی جیسے فرائض کے بعد نوافل میں قیام اللیل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے، اسی طرح فرض روزوں کے بعد نفل روزوں میں محرم کے روزے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہیں، ایک حدیث میں ہے: "مَنْ صَامَ يَوْماً مِنَ الْمُحَرَّمِ، فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ ثَلَا ثُوْنَ يَوْمًا".

(از: رحمت کے خزانے/ص:۳۰۲، رواہ الطبرانی بإسناد لاباس به)

یعنی ایام محرم میں سے ایک دن کا روزہ رکھنا دوسرے مہینوں کے تیس دن روزہ رکھنے کے برابر فضیلت رکھتا ہے۔

علامہ نوویؒ (حدیث مسلسل کے تحت) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صراحت کرتی ہے کہ نفلی روزے رکھنے کے لیے افضل ترین مہینہ محرم ہے، اس میں عاشوراء اور اس کے علاوہ محرم کے دوسرے ایام کے روزے بھی داخل ہیں، یہ فضیلت ماہِ محرم کے تمام روزوں کو شامل ہے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ توفیق دیں تو اس پورے مہینے کے روزے رکھیں، یا اس کے ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھیں، ورنہ نو، دس اور گیارہ کا، اور کم از کم نو دس یا دس گیارہ کو، مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضور ﷺ زیادہ تر شعبان میں روزے کیوں رکھتے تھے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ (۱) محرم کی افضلیت کا علم آپ ﷺ کو اخیری عرصۂ حیات میں دیا گیا۔ (۲) اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اسفار و اعذار کی وجہ سے آپ ﷺ کو محرم میں بکثرت روزہ رکھنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ واللہ اعلم۔ (مظاہر حق جدید/ص:۷۵۵/۲)

بہر حال! ان روایات سے محرم الحرام کی حرمت، عظمت اور فضیلت واضح ہوتی ہے۔

ہجرت کا مہینہ:

پھر یہ مہینہ عظیم الشان تاریخی واقعات کا حامل بھی ہے، اس میں اہم اہم امور اور مہتم

بالشان واقعات رونما ہوئے، منجملہ ان میں سے رحمت عالم ﷺ کی ہجرتِ مدینہ طیبہ کا واقعہ بھی اسی محترم مہینہ کی یادگار ہے، جس کا بنیادی مقصد اللہ جل جلالہٗ کے پیغام واحکام کی حفاظت ودعوت تھا، اور جو باطل پر حق کی کامیابی کا سب سے بڑا پیش خیمہ تھا، جس کے بعد اسلام اور اہل اسلام کو صحیح طور پر عقیدہ وعمل کی پوری پوری آزادی ملی، روایات میں آتا ہے کہ نبوت کے تیرہویں سال محرم الحرام میں رحمتِ عالم ﷺ نے بحکم الٰہی ہجرتِ مدینہ کی نیت فرمائی، پھر کچھ دنوں کے بعد یعنی ۲۶/ صفر کو روانہ ہوگئے، اسی وجہ سے سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت کے چوتھے یا پانچویں سال ۱۷ھ میں حضراتِ صحابہؓ کے اجماع سے یہ فیصلہ فرمایا کہ حضور ﷺ چوں کہ اسلامی سال کے پہلے مہینہ ہی میں ہجرت کی نیت کر چکے تھے، لہٰذا سن ہجری کی ابتداء بھی اسی مہینہ سے کی جائے، اس طرح سن ہجری کی ابتداء محرم الحرام سے ہوئی، جو ایک یادگار ہی نہیں، بلکہ اسلامی تشخص (امتیاز) اور مسلمانوں کا شعار ہے۔

(مستفاد از: سیرتِ مصطفیٰ/ص:۴۰۰)

افسوس ہے آج اکثر لوگ اس سے غافل ہیں، ہم مانتے ہیں کہ حالات وزمانہ کے لحاظ سے شمسی (انگریزی) تاریخوں کو جاننا اور انہیں استعمال میں لانا بھی ضروری ہے، مگر شمسی تاریخوں کے ساتھ قمری تاریخوں کا بھی اہتمام کرلیا جائے تو کیا نقصان ہے؟ کاش! محرم الحرام سے ہمارے فکر وخیال میں تبدیلی آئے اور ہم اسلامی تاریخ کے جاننے اور استعمال کرنے کا شعور وجذبہ پیدا کریں کہ یہ بھی محرم کا پیغام ہے۔

شہادت کا مہینہ:

علاوہ ازیں اس مہینہ کی عظیم یادگاروں میں سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کا واقعہ بھی ہے، جو یکم محرم الحرام کو پیش آیا، بدقسمتی سے شیعہ ذہنیت نے محرم الحرام کو شہادتِ سیدنا حسینؓ کے ساتھ خاص کر دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گلشن اسلام کو جن شہداء نے اپنا قیمتی خون دے کر سدا بہار کیا ہے ان میں امام العادلین، ناصر دین مبین امیر المومنین

خلیفۃ المسلمین سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے، آپؓ آسمانِ عدالت وشجاعت پر آفتاب بن کر چمکے اور اسلام کو ماہتابِ عالم تاب بنا دیا، آپؓ کو ہمیشہ شہادت کی آرزو رہا کرتی تھی، دعا میں فرمایا کرتے تھے:

”اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ“.

(معارف الحدیث/ ص:۲۸۷/ ج:٤)

الٰہ العالمین! میں تیرے راستے میں شہادت کا سوال کرتا ہوں، اور تیرے رسول ﷺ کے شہر میں موت چاہتا ہوں، دعا دل سے مانگی تھی، اس لیے بارگاہِ الٰہی میں منظور ہوگئی، جس کا ظہور اس طرح ہوا کہ ابولؤلؤ فیروز نامی ایک ایرانی مجوسی (پارسی) جو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا غلام تھا اور چکیاں بنانے کا ماہر تھا، وہ ہر وقت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی فتوحات کی خبروں سے دلی حسد کی وجہ سے اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا، خصوصاً ایرانی فتوحات کی خبر سے تو اس کا دل جل کر خاک ہوگیا، اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف اس کے دل میں جوشِ انتقام بڑھ گیا، وہ اسی فکر وانتظار میں رہتا تھا کہ اپنے ہم مذہب، ہم مسلک اور ہم وطنوں کا کسی نہ کسی طرح فاروقِ اعظمؓ سے بدلہ لیا جائے، چناں چہ ایک روز آپؓ حسبِ معمول مسجد نبوی میں مصلائے رسول ﷺ پر نمازِ فجر پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے، تو یہ مجوسی غلام بھی نمازی کی شکل اختیار کر کے پہلی صف میں آپؓ کے برابر آپؓ کے پیچھے کھڑا ہوگیا، فاروقِ اعظمؓ نے جوں ہی نمازِ فجر شروع فرمائی اس کمینہ نے پیچھے سے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے پے در پے وار کر کے آپؓ کو زخمی کر دیا، اور زخموں سے چور فاروقِ اعظمؓ نے گرتے وقت فوراً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بازو پکڑ کر مصلیٰ پر امامت کے لیے کھڑا کر دیا، اور اشارہ سے نماز مکمل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مستدرک/ص:۱۹، از: سیرۃ الصحابہ/ص:۱۲۸)

اس نے آپؓ کے ساتھ اور لوگوں کو بھی زخمی کر دیا، لیکن بالآخر پکڑ لیا گیا، تو (وہی خنجر اپنے سینہ میں اتار دیا، اپنے سینہ میں اپنا خنجر؟ دیکھا آپ نے! فاروقِ اعظمؓ کے دشمن کی پرانی نشانی) اس نے خودکشی کر لی۔ (الفاروق/ص:۲۸۲/ ج:۱)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نماز ختم کی، صحابہؓ کو معلوم ہوا تو آپؓ کے گرد محراب کے قریب جمع ہو گئے، ایک اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی، علاج کے لیے مدینہ کے مشہور طبیب کو بلایا گیا، لیکن اس کی پلائی ہوئی دوا زخموں کے راستے سے باہر نکل گئی، آپؓ کو یقین ہو گیا کہ ان شاء اللہ میری آرزوئے شہادت پوری ہوگی، اس وقت آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب مجھے دوا کی ضرورت نہیں کہ دوا کا وقت ختم ہوا اور دعا کا وقت شروع ہوا، لٰہذا مجھ کو میرے مولیٰ کے سپرد کرو، اور یہ بتاؤ کہ میرا قاتل کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: مجوسی غلام ہے، تو سن کر آپؓ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے خون سے کسی مسلمان کے ہاتھ رنگین نہیں ہوئے۔

پھر اپنے بیٹے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کو فرمایا: میرا سر اپنی گود سے ہٹا کر زمین پر رکھ دو، شاید اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آجائے، نیز فرمایا کہ ''ام المومنین والمومنات، عفیفۂ کائنات سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں جا کر میرا سلام عرض کر کے درخواست کرنا کہ عمر پہلوئے رسول ﷺ میں دفن ہونے کے لیے وہ جگہ چاہتا ہے جو آپ نے اپنے لیے رکھی ہے، جب بیٹے نے اپنی روحانی ماں سے درخواست رکھی تو منظور کر لی گئی، ماں عائشہ صدیقہؓ فرمانے لگیں: کوئی اور ہوتا تو میں انکار کر دیتی، لیکن عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابیٔ رسول کو میں انکار نہیں کر سکتی، ام المومنین رضی اللہ عنہا نے پہلوئے مصطفیٰ میں دفن ہونے کی اجازت دے کر شہید منبر و محراب سیدنا عمر بن خطابؓ کو ہمیشہ کے لیے جنت میں سلا دیا۔

''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''

زخمی ہونے کے تین دن کے بعد (بعمر ۶۳ سال ۲۴ھ) یکم محرم کو سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ (الفاروق/ص: ۱/۲۸۸)

آپؓ کتنے خوش نصیب تھے کہ زندگی میں تو ہر وقت حبیب خدا ﷺ کے قریب رہے ہی، شہادت کے بعد بھی آپ ﷺ سے جدائی گوارہ نہ ہوئی، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

کے مقدر کا کیا کہنا، سچ ہے کہ

کملی والے سے جو قریب ہوتا ہے
وہ خدا سے قریب ہوتا ہے
عشق نبی میں جان دینے والا
بولو! کتنا خوش نصیب ہوتا ہے
ان کی چوکھٹ کا مانگنے والا
کون کہتا غریب ہوتا ہے؟

عبادت وعبرت کا مہینہ ہے:

صاحبو! آج ضرورت ہے اس بات کی کہ محرم الحرام کی آمد پر ہم اس کی عظمت و فضیلت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت اور حضور ﷺ کی سچی اطاعت میں اپنا وقت گذاریں، اور اس میں رونما ہونے والے عظیم الشان واقعات سے نصیحت وعبرت حاصل کریں کہ اسلامی سال کا یہ پہلا مہینہ محرم الحرام عبادت وعبرت کا ہے، اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ خصوصاً اس میں ہر قسم کے محرمات ومنکرات، خرافات و رسومات، بدعات اور معاصی سے مکمل اجتناب کریں، تاکہ اس کا اثر پورا سال بلکہ زندگی بھر باقی رہے، غفلت میں ہرگز نہ گذاریں۔

یاد رکھو! جس طرح دین کی حفاظت ودعوت کے لیے بوقتِ ضرورت اپنا پیارا ملک چھوڑنا ضروری ہے، جسے ہجرت کہتے ہیں، اور وہ محرم کی ایک یادگار بھی ہے، اسی طرح دین کی حفاظت کے لیے ہر وقت معاصی سے اجتناب کرنا بھی نہایت ضروری ہے، کہ مہاجر صرف وہی نہیں جو دین کی حفاظت واشاعت کے خاطر بوقت ضرورت اپنا ملک چھوڑ دے، بلکہ مہاجر وہ بھی ہے جو ہر وقت اپنے دین کی حفاظت کے لیے جملہ معاصی چھوڑ دے، حدیث میں یہی بات بیان کی گئی فرمایا: ”وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ“. (بخاری،

مشکوٰۃ /ص:۱۲/ کتاب الإیمان/ الفصل الأول)

افسوس صد افسوس! آج محرم جیسا شَہرُاللّٰہِ المُحتَرم قسم قسم کی جہالت وضلالت کی نذر ہو گیا، آج اس ماہ میں وہ خرافات اور بدعات کی جاتی ہیں کہ اللہ کی پناہ...... بقولِ شاعر:

ڈھول تاشے سے محرم کو منانے والے — غم سے شہدا کی بڑی دھوم مچانے والے
تعزیہ اور سواری کے اُٹھانے والے — باگھ اور شیر کو دلدل کو نچانے والے

کسی نے کہا ہے:

چاند جب ماہِ محرم کا نظر آتا ہے
کیا تیرے جسم میں شیطان اتر آتا ہے
خوب ہے ابن علیؓ سے محبت یہ تیری
ساری دنیا سے نرالی ہے عقیدت یہ تیری
تعزیہ اور سواری کی ہے عادت یہ تیری
عشق بازی کی محرم میں ہے عادت یہ تیری
غم جنہیں ہوتا ہے وہ ڈھول بجاتے ہیں کہیں
اور غیروں کی طرح تہوار مناتے ہیں کہیں؟
وہ خرافات کا بازار لگاتے ہیں کہیں؟
ڈھول تاشوں سے بھی میت کو اٹھاتے ہیں کہیں؟
تعزیہ داری کو تیمور نے ایجاد کیا
لایا ایران سے اور ہند میں آباد کیا
غم منانے کا عجب ڈھنگ یہ ارشاد کیا
روحِ اسلام کو تیمور نے برباد کیا
فعل تیمور ہے، قولِ پیمبر تو نہیں!
غم کا یہ رنگ شریعت کے برابر تو نہیں

غم تجھے ہے تو پھر اتنا ہی ذرا کر کے دکھا
ڈھول تاشوں سے تیرے باپ کی میت کو اٹھا !

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم صاحبؒ فرماتے تھے: ''اس عظیم مگر مظلوم مہینہ (محرم) کو بھی پہچانئے ! بعض عجمی فنکاروں نے اس محترم مہینے کی جبین پر سیاہی ملنے کی ٹھان لی ہے کہ ہلالِ محرم کے طلوع ہوتے ہی ان کے یہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے، اور اس مقدس مہینہ کے شب و روز کو خرافات و بدعات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ مہینہ نہ تو جشن کا ہے، نہ غم اور ماتم کا، بلکہ ہدایت وعبرت کا مہینہ ہے۔''

عقلمند لوگ سال کے ختم پر پورے سال کا جائزہ اور حساب کرتے ہیں کہ ہم نے دنیوی اور اخروی اعتبار سے سال بھر میں کیا کھویا اور کیا پایا، اور اب آئندہ کیا کرنا ہے، اس کا عملی (شرعی) پروگرام اور نظام بناتے ہیں، پچھلی زندگی کی غفلتوں اور گناہوں پر توبہ اور آئندہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف توجہ اور کوشش کرتے ہیں، یہی وہ ہدایت ہے جو ہمیں نئے اسلامی سال سے ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر قسم کے خرافات، رسومات، بدعات اور جملہ معاصی سے ہر وقت ہمیں محفوظ فرمائے۔آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۰)

یومِ عاشوراء کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ جَابِرِ بۡنِ سَمُرَۃَؓ قَالَ: "کَانَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ یَأۡمُرُ بِصِیَامِ یَوۡمِ عَاشُوۡرَاءَ، وَیَحُثُّنَا عَلَیۡہِ، وَیَتَعَاھَدُنَا عِنۡدَہٗ، فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ لَمۡ یَاۡمُرۡنَا وَلَمۡ یَنۡھَنَا عَنۡہُ، وَلَمۡ یَتَعَاھَدُنَا عِنۡدَہٗ". (مسلم / مشکوٰۃ /ص: ۱۸۰، باب صیام التطوع/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ یومِ عاشوراء میں ہم کو روزہ کا حکم فرماتے تھے، اور ہمیں اس کی ترغیب دیا کرتے تھے، اور اس طرف متوجہ کرتے تھے، لیکن جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو رحمت عالم ﷺ ہم کو نہ صومِ عاشوراء کا حکم فرماتے اور نہ اس سے منع فرماتے، اور نہ ہی اس دن کے لیے ہماری خبر گیری کرتے۔

"عاشوراء" کی وجہ تسمیہ:

خالق و مالک کی بنائی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات کی مثال ایک چکر کی سی ہے، جو بحکم الٰہی جاری ہے، اس میں وقتوں کا گذرنا، دنوں اور راتوں کا آنا جانا، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا تبدل و تغیر بھی اس چکر کی گردش (گھومنے) کا نتیجہ ہے، پھر ان حالات، تغیرات اور واقعات میں اولوا الالباب (عقل مندوں) کے لیے خصوصاً بہت سے عبرت ناک پہلو موجود ہیں، ان میں بھی بعض حالات اور واقعات تو ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ دنیا کی

تاریخ نہ صرف انہیں محفوظ رکھتی ہے، بلکہ عام دنیا والے بھی اس دن کو ایک یادگار بنا لیتے ہیں۔ ''عاشوراءِ محرم'' ان میں سے ایک عظیم الشان یادگار دن ہے، یہ اسلامی سال کے پہلے مہینہ محرم الحرام کی دسویں تاریخ ہے، ''عاشوراء'' (بالمد) دراصل عشر سے بنا ہے ''فاعولاء'' کے وزن پر اسے ''عاشورہ'' پڑھنا اور لکھنا جو مروج ہے درست نہیں۔ (قاموس الفقہ/ ج:۴/ص:۳٦۵) جس کے لغوی معنٰی ہیں ''دس''، اصطلاحی طور پر اس سے محرم الحرام کی دسویں تاریخ مراد لی جاتی ہے، فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ ''عاشوراء'' کی وجہ تسمیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس دن دس نبیوں کو منجانب اللہ خصوصی انعامات سے نوازا گیا۔

(۱) ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کو توبہ قبول کر کے (اس موقع پر یہ یاد رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی اجتہادی خطا بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہوا کرتی ہے)

(۲) سیدنا ادریس علیہ السلام کو مقامِ اعلیٰ پر رفع نصیب فرما کر۔

(۳) سیدنا نوح علیہ السلام کو طوفان سے نجات عطا فرما کر۔

(۴) سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو نارِ نمرود سے نجات دلا کر۔

(۵) سیدنا داؤد علیہ السلام کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ فرما کر۔

(٦) سیدنا سلیمان علیہ السلام کو سلطنت و حکومت عطا فرما کر۔

(۷) سیدنا یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے رہائی عطا فرما کر۔

(۸) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات عطا فرما کر۔

(۹) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر بلندی عطا فرما کر۔

(۱۰) سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو (ایک روایت کے مطابق) ولادت عطا فرما کر۔

(تنبیہ الغافلین مترجم/ص:۳٦۲)

اور ایک روایت کے مطابق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح: ۲) کا پروانہ عطا فرما کر۔

لیکن یاد رکھئے! ان باتوں کا ثبوت عموماً تاریخی روایتوں سے ہوتا ہے، اور تاریخ کی

مستند روایتیں بھی تاریخ ہی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو مستند اور معتبر احادیث کا ہے کہ ان پر تو احکام وعقائد اور حلال وحرام کی بنیاد ہوتی ہے، نہ کہ ان تاریخی روایات پر۔ (فافہم)

یومِ عاشوراء پہلے ہی سے محترم ہے:

اتنی بات ضرور ہے کہ عاشوراء کی حرمت وفضیلت پہلے ہی سے مسلَّم ہے، حتٰی کہ بعض علماء نے فرمایا کہ محرم الحرام کی فضیلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مہینہ میں یومِ عاشوراء ہے۔ (مظاہرِ حق جدید/ص:۵۵۷/۲)

اور احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش مکہ بھی عاشوراء کا بہت ہی اہتمام کرتے تھے، اس دن روزہ رکھتے، اس دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالتے، پھر زمانۂ اسلام میں خود رحمتِ عالم ﷺ بھی اس دن کے روزہ کا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ہے۔

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قیاس یہ ہے کہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی کچھ روایات اس دن کے بارے میں ان تک پہنچی ہوں گی اور رحمتِ عالم ﷺ کا دستور تھا کہ قریش ملت ابراہیمی کی نسبت سے جو اچھے کام کرتے تھے ان میں آپ ﷺ ان سے اتفاق اور اشتراک فرماتے تھے، اسی بنا پر حج میں بھی شرکت فرماتے تھے، پس اپنے اس اصول کی بنا پر آپ ﷺ قریش کے ساتھ عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔ (معارف الحدیث/ص:۱۶۸/۴)

بہرکیف! یومِ عاشوراء پہلے ہی سے محترم ہے، منجانب اللہ اہم ترین اور نہایت عظیم الشان واقعات اس دن رونما ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے محبوب نواسے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے لیے بھی یہ بات باعث سعادت ہے کہ ان کی شہادت بھی اس عظیم الشان یادگار دن میں ہوئی، حالاں کہ اسلام میں اور بھی اس سے بدرجہا زیادہ مظلومیت

کے بے شمار واقعات ہیں۔مثلاً اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ سیدہ سمیہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا واقعہ،اسی طرح سید الشہداء حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کا واقعہ، نیز خادم القرآن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کا واقعہ انتہائی المناک ہے۔اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی ،لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کو عام لوگوں میں زیادہ اہمیت اس لیے ہوگئی کہ وہ اس فضیلت والے دن میں واقع ہوئی۔

شہادتِ حسین کا اجمالی واقعہ :

جس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ اہل عراق کی مسلسل درخواستوں پر حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ اپنے عزیزوں،فرزندوں اور مخلص جانثاروں کے ساتھ یکم شعبان سن ہجری ۶۰ میں مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے ،کچھ قیام فرما کر پھر وہاں سے آٹھ ذی الحجہ سن ہجری ۶۰ میں کوفہ کا سفر کیا،افرادِ قافلہ مرد، مستورات ،چھوٹے بڑے سب ملا کر کل بہتّر (۷۲) تھے،دورانِ سفر قافلہ حسینی کو مقامِ نینویٰ کے میدانِ ’’کربلا‘‘ میں حکمرانِ وقت کے لشکر نے روک لیا،کہ جب تک یزید کی اطاعت قبول نہ کروگے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں،نواسۂ رسول ﷺ جگر گوشۂ بتولؓ نے فرمایا:’’جنگ وجدال تو ہمارا مقصد نہیں،اور کیا کوئی جنگجو حریف بھی اس طرح بے سروسامانی کے عالم میں گھر سے مع اہل وعیال نکلتا ہے؟ میں تو صرف ملوکیت اور حاکمیت وآمریت کی بدعت ختم کر کے جمہوریت اور اسلام کے عادلانہ نظامِ شریعت کو ازسرِ نو قائم کرنا چاہتا ہوں،ایسی صورت میں یزید کے غیر معتدل نظامِ حکومت کی اطاعت میں ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا،البتہ تین صورتیں ممکن ہیں:

(۱) یا تو اپنے حاکم کے پاس مجھے لے چلیں کہ میں خود اس سے بات چیت کر کے اپنا معاملہ طے کرلوں گا۔

(۲) یہ منظور نہیں تو پھر مجھے ارضِ حجاز جانے دیا جائے،تاکہ اس سیاست سے علاحدہ ہوکر یادِ الٰہی اور دیگر دینی مشاغل میں مصروف ہوجاؤں۔

(۳) اگر یہ بھی گوارہ نہیں تو پھر مجھے مملکتِ اسلام کی کسی سرحد پر جانے دیا جائے، تا کہ منکروں سے مقابلہ اور جہاد فی سبیل اللہ کرتا رہوں۔''

جواباً ابن زیاد نے شمر ذی الجوشن کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے عمر بن سعد کے ساتھ یہ پیغام بھیجا کہ ''ہماری اطاعت کے سوا کچھ منظور نہیں، اگر قبول نہیں تو مقابلہ کی تیاری کرلو۔'' اس جاہلانہ وجابرانہ پیغام کو قبول کرنے کا مطلب تو یہ تھا کہ باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، کیوں کہ آپ رضی اللہ عنہ سر کٹانا تو جانتے تھے، باطل کے سامنے جھکانا جانتے ہی نہ تھے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

بالآخر باطل سے حضرت حسینؓ کو مقابلہ کرنا پڑا، جس کے نتیجہ میں دس محرم الحرام یومِ عاشوراء سن ہجری ۶۱ مطابق: ستمبر ۶۸۱ء بروز جمعہ سیدنا حسینؓ اور آپؓ کے اہلِ بیت عظام واصحابِ کرام کی راہِ حق میں قربانی دینے کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا، اور اس طرح عاشوراء کی یادگاروں میں اور ایک اضافہ ہوا۔

کٹا کر گردنیں دکھلا گئے ہیں کربلا والے
کبھی بندے کے سامنے جھک نہیں سکتے اللہ والے

صاحبو! ظاہر کی آنکھوں نے تو یہی دیکھا کہ میدانِ کربلا میں قافلۂ حسینی شہید ہوگیا، لیکن صفحۂ ہستی سے کون مٹا؟ نام ونشان کس کا فنا ہوا؟ اس کو سر کی آنکھوں سے نہیں، عقل وفہم کی آنکھوں ہی سے دیکھا جائے، کیوں کہ

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ﴾ (البقرة : ١٥٤)

اور مت کہو ان لوگوں کو جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں مردہ۔

شہید کربلا حسین بن علی رضی اللہ عنہما زندہ ہیں، ماتم تو مردوں کا جب روا نہیں، تو زندوں کا ماتم کیا معنٰی رکھتا ہے؟

نہ عشق حسینؓ، نہ ذوقِ شہادت
غافل سمجھ بیٹھا ہے ماتم کو عبادت

ان کی صدائے حق آج بھی بدستور گونج رہی ہے، اور آج کی طاغوتی حکومتوں کے مقابلہ میں اعلانِ حق کے لیے ہم کو طلب کرتی ہے، لہٰذا اے حب حسینی کے دعوے دارو! حسینؓ کو حلوے کھچڑے، ملیدے، ڈھول، تاشے، تماشے، ناچنے، گانے اور تعزیے کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں ہے، ضرورت ہے تو جذبۂ ایمانی، حق پرستی، ثابت قدمی اور بلند ہمتی کی، آؤ! صدائے حسینی کو گوشِ ہوش سے سنو! پرچم حسینی کو اٹھاؤ! اور ظلم و جور اور جہالت و بدعت کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار ہو جاؤ! یہی پیغامِ حسینی اور خاکِ کربلا کا اصل درس ہے کہ جذبۂ حق پرستی و قربانی احیاءِ اسلام کا ذریعہ ہے۔

عاشوراء عبرت وعبادت کا دن ہے:

عاشوراء عبرت وعبادت کا دن ہے، اس دن میں جتنے عظیم الشان اہم ترین واقعات پیش آئے ان میں سے ہر ایک میں عبرت وموعظت کے بے شمار پہلو موجود ہیں، خصوصاً واقعۂ کربلا میں، پھر آج کی دنیا عاشوراء کو واقعۂ کربلا کے حوالے سے ہی اکثر یاد کرتی ہے، حالاں کہ شہداءِ کربلا کا سانحہ یومِ عاشوراء کو پیش آنا ایک اتفاقی واقعہ ہے، لیکن چوں کہ عبرت کے دن میں یہ عبرت ناک واقعہ پیش آیا ہے، اس لیے بھی اس سے درسِ عبرت لینے کی ضرورت ہے، اور خرافات و بدعات سے اجتناب کرتے ہوئے عبادات بالخصوص روزہ کا

اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، پھر جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ مہینہ اور دن نہایت محترم ہے، عبادت کا مہینہ ہے، تو اس میں زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں، نکاح بھی نیک کام ہے، صرف سماجی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ایک اعتبار سے عبادت ہے، لہٰذا اس مہینہ اور اس دن میں موقع آجائے تو اسے بھی ضرور بالضرور کرنا ہی چاہیے، البتہ اس دن کی خاص عبادت روزہ ہے، جیسا کہ حدیث مذکور سے واضح ہوتا ہے۔

صومِ عاشوراء کا حکم:

حضور ﷺ اور حضراتِ صحابۂ کرامؓ رمضان کی فرضیت سے پہلے بھی صومِ عاشوراء رکھتے تھے، احناف کے نزدیک صومِ رمضان سے قبل صومِ عاشوراء فرض تھا، صومِ رمضان کی فرضیت کے بعد صومِ عاشوراء کی فرضیت منسوخ ہوگئی، اور استحباب باقی رہا، پھر اس استحباب کے بھی تین درجے ہیں:

(۱) یومِ عاشوراء کے ساتھ ایک دن قبل اور ایک دن بعد بھی روزہ رکھے، یعنی محرم کی نو، دس اور گیارہ تاریخ کو روزہ رکھا جائے۔

(۲) دوسرا درجہ یہ ہے کہ عاشوراء کے ساتھ یا تو نو کو یا گیارہ کو روزہ رکھا جائے۔

(۳) اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ فقط عاشوراء ہی کو روزہ رکھا جائے، لیکن چوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے، اور حضورِ اکرم ﷺ نے ان کی مخالفت کا حکم فرمایا، اس لیے تنہا یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا مکروہِ تنزیہی ہے: "وَتَنْزِيهًا كَعَاشُورَاءَ وَحْدَهُ".
(مظاہر حق جدید/ص:۱۷۷/۲)

صومِ عاشوراء کی فضیلت:

حدیثِ پاک میں صومِ عاشوراء کی فضیلت بھی وارد ہے کہ:

"صِيَامُ يَوْمِ عَاشُورَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ". (مسلم،

مشکوۃ/ص:۱۷۹)

یعنی صومِ عاشوراء کی برکت سے امید ہے کہ حق تعالیٰ گذشتہ ایک سال کے گناہ (صغیرہ) معاف فرمادیں گے، انسان خطاء ونسیان کا پتلا ہے، روزانہ نہ جانے کتنے گناہ کرتا ہے، اور پورے ہفتے، مہینے اور سال بھر میں تو نہ جانے کتنے گناہوں کے انبار لگاتا ہے، اب اگر کوئی خوش قسمت صومِ عاشوراء وغیرہ کا اہتمام کرے تو ایک سال قبل کے تمام صغائر اور سچی پکی توبہ سے تمام کبائر بھی ان شاءاللہ معاف ہوجائیں گے، پھر یہ عاشوراء ہمارے باپ سیدنا آدم اور سیدنا داوٗد علیہما السلام کی معافی کا دن ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی اس دن روزہ کے ساتھ توبہ اور استغفار کا اہتمام کریں۔

ایک حدیث میں ہے کہ چار چیزوں کا حضور ﷺ نے ہمیشہ اہتمام فرمایا:

(۱) صِيَامُ عَاشُوْرَاءَ. (۲) وَ الْعَشْرِ. (۳) وَثَلٰثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ. (٤)وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ. (مشکوٰۃ/ص: ۱۸۰، رواہ النسائی)

صومِ عاشوراء، عشرۂ ذی الحجہ کے نو روزے، ہر ماہ کے تین روزے اور نمازِ فجر سے پہلے کی دو رکعات سنتیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میرے علم کے مطابق رحمت عالم ﷺ ماہِ محرم اور یومِ عاشوراء کے علاوہ کسی ماہ اور دن میں روزہ رکھنا رمضان کے سوا افضل نہیں جانتے تھے۔" (مشکوٰۃ/ص:۱۷۸، متفق علیہ)

لیکن علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے طرزِ عمل سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی سمجھا کہ صومِ عاشوراء کی فضیلت دیگر تمام نفل روزوں سے بڑھ کر ہے، حالاں کہ یومِ عرفہ کو یومِ عاشوراء پر نیز صومِ عرفہ کو صومِ عاشوراء پر فضیلت حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔

بہرکیف! اس تحقیق سے بھی یومِ عاشوراء کی فضیلت ضرور ثابت ہوئی، نیز حضور اکرم ﷺ کے اہتمام سے بھی اس کی فضیلت ثابت ہوئی، اس لیے اس کے روزہ کا اہتمام کرنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو کم از کم اس میں روزہ رکھنے والے ہی کا احترام کرلے، ان

شاء اللہ! یہ عمل بھی ضائع نہیں ہوگا۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

منقول ہے کہ ایک شخص تنگ دست فقیر تھا، اس نے اور اس کے گھر والوں نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا، افطاری کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس لیے مجبوراً قرض لینے کی غرض سے ایک مسلمان (چوکسی) کے پاس گیا، جو نہایت خوش حال تھا، فقیر نے جا کر سلام عرض کر کے کہا: ''بھائی! میں سخت ضرورت مند ہوں، آپ مجھے ایک درہم بطورِ قرض دے دیجیے، تاکہ میں اس سے افطار کا سامان خرید سکوں'' سنار نے بات سنی اَن سنی کر دی اور اس کی ضرورت پوری نہ کی، تو فقیر شکستہ دل ہو کر وہاں سے لوٹا، قریب میں ایک یہودی تھا، اس نے صورتِ حال دریافت کی، تو فقیر نے اپنا دکھڑا سنا دیا کہ ''آج عاشوراء کا دن ہے، میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ روزہ سے ہوں، گھر میں افطار کے لیے کچھ موجود نہیں، اس لیے اس کے پاس ایک درہم قرض لینے آیا تھا، مگر اس نے انکار کر دیا۔''

اس یہودی نے رحم کھا کر دس درہم ہدیۃً دیے اور دعا کی درخواست کی، فقیر نے خوشی خوشی ضرورت پوری کی اور اپنے گھر والوں پر خرچ کر دیے، رات ہوئی تو سنار نے عجیب خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہوگئی، پیاس اور گرمی بہت بڑھنے لگی، اچانک دیکھا کہ ایک سفید موتیوں کا محل ہے، سرخ یاقوت دروازے میں جڑے ہوئے ہیں، پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر اس نے پانی طلب کیا، تو محل سے آواز آئی کہ: ''کل تک تو یہ محل تمہارا تھا، مگر آج عاشوراء کے دن فقیر کو شکستہ دل لوٹانے کی وجہ سے تمہارا نام مٹا کر اس یہودی کا نام لکھ دیا گیا ہے''۔

صبح ہوئی تو سنار بہت نادم اور شرمندہ ہوا، فوراً یہودی کے پاس گیا اور کہنے لگا: ''کل جو دس درہم تم نے فقیر کو دیے تھے اس کا ثواب مجھے سو درہم میں بیچ دو'' یہودی نے کہا: ''ایک ہزار میں بھی نہیں بیچوں گا، خواب دیکھ کر آئے ہونا!'' سنار کو سن کر بڑا تعجب ہوا، کہا: ''تمہیں اس خواب کا کس طرح پتہ چلا؟ کس نے بتایا؟'' کہنے لگا: ''مالکِ کن فیکون کی طرف سے معلوم

ہوا'' پھر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ (المحمود/ص:۸/ دسمبر)

عاشوراء کے دِن اہل وعیال پر حدیث وسعت کی حقیقت:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جب دوسروں کے ساتھ یومِ عاشوراء میں وسعت کرنے سے یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے، تو خود اہل وعیال کے ساتھ وسعت کرنے پر تو بدرجہ اولیٰ یہ فضیلت حاصل ہوگی، چناں چہ ایک حدیث ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ''مَنْ وَسَّعَ عَلٰی عِيَالِهٖ فِي النَّفَقَةِ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ سَائِرَ سَنَةٍ كُلِّهَا''. (رواه رزين، و ابن الأثير في جامع الأصول/ الباب العاشر في فضل النفقة، والبيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ۱۷۰/ باب فضل الصدقة، الفصل الثالث،)

جو شخص عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال کے ساتھ وسعت کا معاملہ کرے گا، دل کھول کر خرچ کرے گا، تو حق تعالیٰ اس کے ساتھ پورے سال وسعت اور فراخی کا معاملہ فرمائیں گے، مشکوٰۃ میں ہے کہ حضرت سفیانِ ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے، اور ہم نے اس کو اسی طرح پایا ہے۔'' اس روایت کے متعلق فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے، طبرانیؒ اور بیہقیؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، لیکن محدث بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث جتنی سندوں سے منقول ہے، سبھی ضعیف ہیں، بلکہ علامہ ابن جوزیؒ نے تو اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے، البتہ حافظ ابن عبد البرؒ اور محدث دار قطنیؒ نے حضرت عمرؓ سے اس طرح کا خود ان کا قول نقل کیا ہے، اور اس کی سند بھی قابل قبول ہے''۔

(کتاب الفتاویٰ/ص:۴۸۵/۱)

اس لیے ثواب کی نیت سے تو نہیں، لیکن حصولِ وسعت رزق کی نیت سے اس پر عمل کیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھا جائے کہ وسعتِ رزق کے اور بھی کئی نافع ترین نسخے ہیں، جن میں سب سے بڑا کامیاب ترین نسخہ ترکِ گناہ (تقویٰ) ہے۔

یوم الزینہ سے یومِ عاشوراء مراد ہے:

الغرض! یہ دن بڑا محترم دن ہے، عبرت، عبادت اور اہل وعیال پر وسعت کا دن ہے، یہ دن امم سابقہ کے نزدیک بھی فضیلت والا سمجھا جاتا تھا، چناں چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جب فرعونِ مصر نے ملک کے کونے کونے سے بڑے بڑے جادوگروں کو اکٹھا کرنے کا ارادہ کیا تو اس سلسلہ میں دن اور وقت کی تعیین کے سلسلہ میں سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى﴾ (طٰهٰ:۵۹)

''تم سے وہ دن طے ہے، جس میں جشن منایا جاتا ہے، اور یہ بھی طے ہے کہ دن چڑھے ہی لوگوں کو جمع کرلیا جائے۔''

تمہارے وعدے اور مقابلہ کا دن وہ ''یوم الزینہ'' ہے، یعنی تمہارے جشن کا دن، اس میں سب لوگ دن چڑھے جمع ہوجاتے ہیں، اس وقت مقابلہ ہوگا، حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ سے منقول ہے کہ یہ ان کے جشن کا دن جو مقابلہ کے لیے طے ہوا تھا دسویں محرم یومِ عاشوراء تھا۔ (گلدستۂ تفاسیر/ ج:۴/ص:۴۹۷)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دن جشن منانا یہودیوں اور خوارج کا طریقہ ہے، جیسے ماتم منانا شیعوں کا طریقہ ہے، جب کہ ہمارا کام عبرت، عبادت اور اہل وعیال پر وسعت کرنا ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھ کر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "حُسَيْنٌ مِنِّيْ، وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، أَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ أَحَبَّ حُسَيْناً، حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْأَسْبَاطِ". (رواه الترمذی/ مشکوٰۃ/ص: ۵۷۱، باب مناقب أهل البيت، الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ”حسین مجھ سے ہے، اور میں حسین سے ہوں، اور جس شخص نے حسینؓ سے محبت رکھی اس سے اللہ محبت رکھے گا، حسین سبط من الاسباط ہے۔“ (میری بیٹی کا بیٹا ہے)

حضرت حسینؓ ایک امت کے قائم مقام:

بلا شبہ امت محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ میں بعض افراد و اشخاص ایسے گذرے ہیں جو اپنے خدا داد فضائل و محاسن، اعلیٰ اخلاق، عمدہ صفات اور کمالات و خصوصیات کی وجہ سے تنہا ایک امت کے قائم مقام ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ جل شانہ کی عبادت و اطاعت، دینی غیرت و ملی حمیت، حیاء و عفت، عظمت و فضیلت، سعادت و شرافت، اور سخاوت و شجاعت کے اعتبار سے ایک امت و ملت کے برابر ہوتے ہیں۔ ان کی جامع زندگی اور مکمل سیرت میں امت کے ہر ہر فرد کے لیے عبرت و موعظت کا بہترین سامان موجود ہے، ان کی ہر ہر صفت

لائقِ تقلید اور ہر شان ہدایت کی پہچان ہوتی ہے۔ سبط پیغمبر، فاطمہؓ کے لخت جگر اور علیؓ کے نورِ نظر، بالیقین امت کے انہیں خوش نصیب افراد واشخاص میں سے ایک ہیں، آپ تنہا ایک امت کے قائم مقام ہیں، چناں چہ حدیث پاک میں آپ کے متعلق جو فرمایا: "سِبۡطٌ مِنَ الأَسْبَاطِ" اس کے معنیٰ بعض حضرات نے یہی بیان کیے کہ "حسینؓ امتوں میں سے ایک امت ہیں"، یعنی شرف وسعادت کے اعتبار سے ایک پوری امت کے برابر ہیں۔

(مظاہر حق جدید: ص/۴۰۹/ ج:۷)

سیدنا حسین گلشن نبوت کی بہار، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دل کا قرار، دوشِ نبوت کے شہ سوار، آلِ محمد ﷺ کے تاجدار، جسم نبوت کی یادگار، عثمانؓ وعلیؓ کے پہرہ دار، عزم وہمت کی تلوار اور جنت میں جوانوں کے سردار ہیں۔ (رضی اللّٰہ عنه و أرضاه)

تین باتیں آپ کی سیرتِ طیبہ کا خلاصہ ہیں:

(۱) اعمالِ صالحہ۔ (۲) اخلاقِ حسنہ۔ (۳) حق کا جذبہ۔

نہایت اعلیٰ نسب نامہ:

آپ کا نسب نہایت اعلیٰ اور قریش کا خلاصہ ہے، آپ کے حقیقی بھائی بہنوں کے علاوہ اس امت میں کسی کو اتنا اعلیٰ نسب نصیب نہیں ہوا، حضور اکرم ﷺ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ماں کی جانب سے نانا ہیں، تو باپ کی جانب سے گویا دادا، اس لیے کہ حضرت علیؓ نسبی اعتبار سے ہمارے نبی کے چچا زاد بھائی ہیں، مگر انہوں نے پرورش آپ ہی کی گود میں پائی ہے، اس لحاظ سے حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کے لیے بمنزلہ بیٹا ہوئے، اور حسین بمنزلہ پوتا ہوئے۔

چناں چہ منقول ہے کہ حجاج بن یوسف ایک مرتبہ نواسۂ رسول ﷺ، جگر گوشۂ بتولؓ، سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے حسب نسب پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا: "حسین نبی کی ذریت میں ہیں ہی نہیں" (کیوں کہ صاحب زادیٔ نبی کی اولاد میں سے ہیں، اور اولاد

کا نسب دادا کی طرف منسوب ہوتا ہے، نانا کی طرف نہیں) یہ سن کر حضرت یحیٰ بن معمرؒ نے فرمایا: ''حجاج! تو جھوٹ کہتا ہے، بلا شبہ حضرت حسینؓ آلِ رسول میں سے ہیں، تیرا فلسفہ اپنی جگہ، مگر حضرت حسینؓ کا آلِ رسول سے ہونا یقیناً ثابت ہے'' حجاج کہنے لگا: ''اگر یہی بات ہے تو ثابت کرنا ہوگا، اور وہ بھی قرآن سے کہ ''نانا کی طرف بھی نسب عائد کیا گیا ہے'' حضرت یحیٰ نے فوراً بطورِ دلیل قرآنِ کریم کی ایک آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰ وَعِيْسٰى﴾ (الأنعام: ۸۴-۸۵)

فرمانے لگے: ''دیکھئے! اس آیت میں اللہ رب العزت نے مذکورہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اولادِ آدم میں شمار فرمایا، جب کہ حضرت آدم علیہ السلام تو ان کے نانا ہی ہو سکتے ہیں، کیوں کہ ان کا نسب نامہ تو والدہ ہی سے چلا ہے'' حجاج کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔ (ابن عساکر/ص:۶۵/ ج:۴، از کشکول مفتی محمد شفیع صاحبؒ /ص:۳۴)

اور حدیث پاک میں آپ ﷺ کو ''سبط'' فرمایا، تو یہ لفظ ''ولد'' کے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہے، اس وجہ سے مذکورہ حدیث کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''حسینؓ میری اولاد ہے'' اسی طرح ایک حدیث میں حضراتِ حسنینؓ کے بارے میں فرمایا:

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: '' إِنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ هُمَا رَيْحَانَايَ مِنَ الدُّنْيَا''. (مشکوٰۃ/ص: ۵۷۰، الفصل الثانی)

کہ حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) تو میرے دنیا کے دو پھول ہیں، لغت میں 'ریحان' کے مختلف معنیٰ آتے ہیں، مثلاً رحمت، راحت، روزی، چین اور آسائش وغیرہ، اور اسی مناسبت سے بیٹے (اولاد) کو بھی ریحان کہتے ہیں کہ اس سے دل کو راحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ (مظاہر حق جدید/ص:۳۹۵/ ۷)

تو حسینؓ نبی ﷺ کے قرۃ العین اور دل کا چین ہیں، اس لیے انہیں ریحان،

یا "سِبُطٌ مِنَ الْأَسُبَاطِ" اور "حُسَيُنٌ مِّنِّیُ وَأَنَا مِنُ حُسَيُنٍ" فرمایا گیا، مطلب یہ ہے کہ نبوت کی حیثیت کو چھوڑ کر جہاں تک حضور اکرم ﷺ کی بشری حیثیت کا تعلق ہے تو حسینؓ و حسنؓ کی ذات گویا ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جزو تھی۔

ولادتِ باسعادت:

آپؓ کی ولادت سے قبل ایک واقعہ پیش آیا، جس وقت آپ شکمِ مادر میں تھے تب سیدہ ام فضلؓ جو سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی بیوی، حضور اکرم ﷺ کی چچی اور حسینؓ کی رشتہ میں گویا دادی ہیں، انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ کسی نے آپ ﷺ کے جسمِ اطہر سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا، انہوں نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا: حضور! اس بھیانک خواب سے میں نہایت خوف زدہ ہوں" فَقَالَ رَسُوُلُ اللّٰہِ ﷺ: "رَأَيُتِ خَيُراً" چچی جان! گھبرائیں نہیں، آپ نے کوئی بھیانک نہیں، بلکہ نہایت مبارک خواب دیکھا ہے، جس کی تعبیر یہ ہے کہ "تَلِدُ فَاطِمَةُ إِنُ شَاءَ اللّٰهُ غُلَاماً يَكُوُنُ فِيُ حِجُرِكِ". (رواه البيهقي في دلائل النبوة، مشكوٰة/ص:٥٧٢، الفصل الثالث)

میرے جگر کے ٹکڑے فاطمہ کو لڑکا ہوگا اور تم اسے گود میں لوگی۔ اس نبوی خوش خبری کے مطابق کچھ ہی دنوں کے بعد ۵/ شعبان سن ہجری ۴ میں اس خواب کی تعبیر ملی کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی تو فوراً تشریف لائے، اور چمکتے دمکتے مہکتے معصوم پھول سے بچے کو گود میں لیا، منہ میں گھٹی دی اور کانوں میں اذان واقامت کہی۔ اور اس طرح گویا توحیدِ الٰہی کی روح پھونک دی، سبحان اللہ! کیا مقدر ہے حسین کے کان کا، کہ زبان حضور ﷺ کی، اور نام اللہ کا، ولادت کے ساتویں دن سر کے بال اتروا کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کی، اور ختنہ وعقیقہ کر کے حسین نام رکھا۔ (جمع الفوائد، از: تاریخ حسین/ص:٦٨)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حسین حلیہ:

چوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہایت ہی حسین تھے، ان کا حسین حلیہ نبی اکرم ﷺ کے حلیہ سے بہت زیادہ ملتا تھا، حدیث میں ہے:

"اَلْحُسَینُ أَشْبَهَ النَّبِيَّ ﷺ مَا كَانَ أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ".

(ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵۷۱، الفصل الثانی)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے نصف اسفل میں یعنی ران، پنڈلی قدم وغیرہ کے اعتبار سے حضور ﷺ کے بہت زیادہ مشابہ تھے، نبی اکرم ﷺ کا حسن حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں نظر آتا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَأَنَا مِنْ حُسَیْنٍ" حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے، گویا میں اور حسین یک قلب و دو قالب کے مانند ہیں۔

صاحبو! حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں حُسن تھا، تو حضرت حُسین رضی اللہ عنہ حسین تھے۔ پھر حضور اکرم ﷺ سے حسین رضی اللہ عنہ کی مماثلت ومشابہت محض صورت ہی کے اعتبار سے نہ تھی، بلکہ صورت کے ساتھ سیرت بھی ایسی ہی تھی، جس کو شروع ہی سے ہمارے آقا ﷺ نے محسوس فرمالیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کی محبت:

اسی لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہل بیت عظام میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے غیر معمولی محبت تھی، تقریباً روزانہ دونوں کو دیکھنے کے لیے بیٹی فاطمہ کے گھر تشریف لے جاتے اور بچوں سے شفقت و پیار بھرا معاملہ فرماتے، ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "اَیُّ اَھْلِ بَیْتِكَ اَحَبُّ اِلَیْكَ؟" آپ کو اہل بیت میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟" قَالَ: اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵۷۱، الفصل الثانی)

فرمایا: "حسن وحسین سے"۔ گویا حضور ﷺ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے محبت کر کے

امت کو اپنے بچوں سے محبت کرنا سکھایا۔ اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے حق میں دعا کریں، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قَیْنُقَاع کے بازار سے لوٹا، آپ ﷺ بیٹی فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا: ''بچے کہاں ہیں؟'' اتنے میں دونوں دوڑے ہوئے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چمٹ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''الٰہی! میں ان سے محبت رکھتا ہوں، اس لیے تو بھی ان سے محبت فرما، اور ان سے محبت رکھنے والوں سے بھی محبت فرما۔'' (مسلم: فضائل الحسنؓ والحسینؓ)

سبحان اللہ! ساری امت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتی ہے، اور حضور ﷺ حضرات حسنینؓ سے محبت کرتے ہیں، ایک مرتبہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کہ حسنین کریمین سرخ لباس میں ملبوس آتے نظر آئے، کمسنی کے سبب دونوں کبھی گرتے کبھی اٹھ کھڑے ہوتے، نبی اکرم، شاہِ بنی آدم علیہ السلام نے اپنے دونوں نواسوں کو اس طرح گرتے پڑتے آتے دیکھا تو خطبہ روک دیا، اور منبر سے اتر کر ان کو اپنی گود میں لیا، پھر اپنے سامنے بٹھا لیا، اور صحابہؓ سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَ أَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (التغابن: ۱۵)

(بلاشبہ تمہارے مال اور اولاد آزمائش کی چیز ہے) ان دونوں بچوں کو دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکا اور خطبہ روک کر ان کو لے لیا۔ (ترمذی، مشکوۃ/ص: ۵۷۱، الفصل الثانی)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ان شہزادوں کو اٹھانا اس وجہ سے تھا تاکہ عند اللہ اور عند الناس ان کا رتبہ و مقام بلند ہو، اس کے بعد حضور ﷺ نے دوبارہ خطبہ شروع فرمایا۔

حتیٰ کہ بعض اوقات حسنین شریفین نماز پڑھتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طفلانہ شوخیاں کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ کبھی ان پر خفا نہ ہوتے، بلکہ ان کی طفلا

نہ اداؤں کو پورا کرنے میں مدد فرماتے، سجدہ کی حالت میں جب بچے پشت مبارک پر بیٹھ جاتے تو آپ ﷺ سجدہ سے سر نہ اٹھاتے جب تک دونوں خود سے نہ اتر جاتے۔ (اصابہ /ص:۲)

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل سے امت کو سبق دیا کہ اپنے بچوں کی آخرت کی دائمی تو کجا، دنیا کی عارضی تکلیف بھی برداشت نہ کی جائے، انہیں ہر تکلیف وہلاکت سے بچایا جائے:

﴿قُوٓا أَنفُسَكُمۡ وَأَهۡلِيكُمۡ نَارًا﴾ (التحریم :٦)

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تھے کہ ام ایمنؓ نے آکر حسینؓ کے گم ہونے کی خبر دی، حضور ﷺ نے فوراً صحابہ کو تلاش کا حکم دیا اور خود بھی نکل پڑے، حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھا، ہم تلاش کرتے ہوئے ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے، تو وہاں دیکھا کہ حضرات حسنینؓ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے کھڑے ہیں، اور پاس ہی ایک کالا ناگ اپنی دم پر کھڑا ہے، جس کے منھ سے آگ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں، حضور ﷺ جلدی سے آگے بڑھے، ناگ نے حضور ﷺ کی طرف مڑ کر دیکھا، پھر چل پڑا اور ایک سوراخ میں داخل ہو گیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے دونوں کو گود میں لیا اور فرمایا: ''تم دونوں پر میرے ماں باپ قربان ہوں! تم دونوں اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل احترام ہو۔'' حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ''شہزادوں کو خوش خبری ہو! کہ تمہاری سواری بہت ہی عمدہ ہے'' (یعنی حضور ﷺ کی گود) جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر سواری عمدہ ہے تو سوار بھی نہایت عمدہ ہیں''۔

(حیاۃ الصحابہ/ص:۲/۸۶۹، از: ''بکھرے موتی'' /ص:۳۰۳)

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی والدہ سے اجازت لے کر حضور ﷺ کے ساتھ مغرب وعشاء کی نماز پڑھی، عشاء کے بعد حضور ﷺ تشریف لے جانے لگے تو میں بھی پیچھے ہولیا، میری آواز (وآہٹ) کو سن کر حضور ﷺ نے پوچھا: ''

کون؟ حذیفہ!'' میں نے عرض کیا: ''جی'' فرمایا: ''اللہ جل شانہٗ تمہاری اور تمہاری والدہ کی مغفرت فرمائے، کیا کوئی ضرورت ہے؟ پھر فرمایا، دیکھو! ابھی ابھی ایک فرشتہ نازل ہوا، جو آج سے پہلے کبھی نہ آیا تھا، پروردگارِ عالم سے اجازت لے کر وہ فرشتہ اس لیے آیا کہ مجھے سلام کرے اور مجھے خوشخبری سنائے کہ:

بِأَنَّ فَاطِمَةَ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَ أَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵۷۱، الفصل الثانی)

کہ فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی اور حسنینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

حضرت حسینؓ حضور ﷺ کی تربیت میں:

الغرض! حضور ﷺ حضرات حسنینؓ سے غیر معمولی محبت فرماتے تھے، اور گویا اس طرح آپ ﷺ اپنی امت کو اولاد سے محبت کرنا سکھا گئے کہ اولاد سے سچی محبت ہی ان کی صحیح تربیت کا سبب ہے، چناں چہ یہ اسی کا اثر تھا کہ ان کی تربیت کا معمولی باتوں میں بھی پورا پورا خیال رکھتے، ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ سے پوچھا گیا کہ ''حضور ﷺ کی (تربیت کے سلسلہ میں) کوئی بات آپ کو یاد ہے؟'' فرمایا: ''بالکل!'' پھر فرمایا کہ ''ایک بار میں ایک کھڑکی پر چڑھا جس میں کھجوریں رکھی تھیں، میں نے ایک کھجور اس میں سے منہ میں رکھ دی، حضور ﷺ نے دیکھ لیا تو فوراً اس کو منہ سے نکلوا دیا، کہ یہ صدقہ کی کھجور ہے، اور صدقہ ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔'' (مشکوٰۃ/ص:۱۶۱) (از: فضائلِ اعمال/ص: ۱۶۲، حکایاتِ صحابہ/گیارہواں باب: ''بچوں کا دینی جذبہ'')

کہ وہ غریبوں کا حق ہے، ہم غریبوں کا کھانے والے نہیں، بلکہ ان کو کھلانے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بچوں سے ایسی محبت مناسب نہیں جو ان کی صحیح تربیت اور احکامِ شریعت سے غفلت کا سبب ہو، اس کا خیال ہر وقت ضروری ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے رکھا، اگر چہ حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ نے حضور ﷺ کی تربیت وصحبت کا زمانہ بہت تھوڑا پایا، کیوں کہ

رحمت عالم ﷺ کا سایۂ شفقت ان کے سر سے اٹھا تب ان کی عمر مبارک چھ سال اور سات ماہ تھی، لیکن اس قلیل عرصہ میں بھی انہوں نے حضور ﷺ سے براہِ راست فیوض و برکات حاصل کیے، حضراتِ محدثین نے ان کا شمار اس مقدس جماعت میں کیا جن سے حضور ﷺ کی براہِ راست آٹھ حدیثیں منقول ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بلا واسطہ حضور ﷺ سے جو حدیثیں منقول ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے:

(۱) ''جس کسی کو کوئی مصیبت پہنچی ہو، پھر وہ عرصہ کے بعد یاد آنے پر بھی ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھے، تو اس کو اس وقت بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا مصیبت کے وقت ملا تھا۔'' (ابن ماجہ/ص:۱۱٦، مشکوٰۃ/ص:۱۵۳)

(۲) حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ ''آدمی کے اسلام کے کمال اور خوبیمیں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ بے کار کاموں میں مشغول نہ ہو۔'' (مشکوٰۃ/ص:۴۱۳)

(۳) آپؓ نے اپنے نانا جان کا ایک ارشاد یہ نقل فرمایا کہ میری امت جب دریا پر سوار ہو اور اس وقت یہ دعا پڑھے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا إِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (ھود: ٤١) تو ڈوبنے سے امن نصیب ہوگا۔ (فضائلِ اعمال/ص:۱٦۲)

اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں جو حضرت حسینؓ نے بلا واسطہ حضور ﷺ سے نقل کی ہیں، جن کی تعداد آٹھ ہے، اور جو حدیثیں بالواسطہ مروی ہیں وہ تو بکثرت ہیں، اتنی کم عمری میں حضور ﷺ سے حدیثیں نقل کرنا آپؓ کا کمال اور حضور ﷺ کی کمالِ تربیت اور جمالِ صحبت کا اثر تھا، پھر حضرت علیؓ جیسے عظیم باپ اور حضرت فاطمہؓ جیسی عظیم والدہ کی تعلیم و تربیت نے مزید محاسن وفضائل کا آپؓ کو حامل بنا دیا۔

سیدنا حسینؓ کے اعمالِ صالحہ واخلاقِ حسنہ:

ارباب سیر سیرتِ سبط پیغمبر کے تحت لکھتے ہیں کہ:

”كَثِيْرُ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالصَّدَقَةِ وَأَفْعَالِ الْخَيْرِ“.

(سیر صحابہ/ ص: ۲۳۰/ ج: ٤)

حضرت حسینؓ نماز، روزہ، حج، صدقہ وغیرہ اعمالِ صالحہ بہت کثرت سے کیا کرتے تھے، حضرت زین العابدینؒ کا بیان ہے کہ حضرت حسینؓ عموماً دن رات میں ایک ہزار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا حسینؓ نے زندگی میں پچیس حج پیدل کیے، اور روزے بھی بکثرت رکھتے، صدقہ وخیرات سے متعلق ابن عساکرؒ فرماتے ہیں کہ کوئی سائل آپؓ کے دروازے سے واپس نہ جاتا، کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاتا، ایک مرتبہ نماز کی نیت باندھی کہ سائل نے آواز لگائی، آپؓ نے خلافِ معمول جلدی سے نماز ختم فرمائی، باہر آئے تو سائل پر فقر وفاقہ کے آثار نظر آئے، فوراً خادم کو بلا کر پوچھا: ہمارے اخراجات میں سے کچھ باقی ہے؟ اس نے کہا: حضرت! صرف دوسو درہم ہیں جو آپ نے اہل بیت کے لیے رکھے ہیں، حکم ہوا کہ جلدی سے لا کر اس سائل کو دے دو، کہ یہ سائل اہل بیت سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ ہے: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ پر عمل اور ایثار، جو سخاوت کا اعلیٰ درجہ ہے اس کی زندہ مثال اور عملی نمونہ۔ (از سیر الصحابہ/ ص: ۲۳۱/ ج: ۴)

ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے، دیکھا کہ کسی جگہ کچھ فقراء کھانا کھا رہے ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گذر ہوا، تو فقیروں نے ازراہِ محبت ان کو بھی مدعو کیا، آپؓ کی تواضع دیکھئے! فقیروں کی درخواست پر فوراً سواری سے اترے اور کھانے میں شریک ہوگئے، پھر فرمایا: تکبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا، اس کے بعد ان فقراء سے فرمایا: ”میں نے تمہاری دعوت قبول کرلی، اس لیے اب تم بھی میری دعوت قبول کرو“ پھر سب کو گھر لے جا کر کھانا کھلایا۔ (از سیر الصحابہ/ ص: ۲۳۱/ ج: ۴)

آپ کی انکساری وعاجزی کا ایک اور واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسینؓ اور ان کے باپ شریک بھائی حضرت محمد بن حنفیہؒ میں کسی بات پر تلخی وگرمی ہوگئی، دونوں جدا

ہو گئے، تو محمد بن حنفیہؒ نے گھر جا کر ایک خط حضرت حسینؓ کے نام روانہ کیا، جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے: ''بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم، محمد بن علیؓ کی طرف سے اس کے بھائی حسین بن علیؓ کی طرف، سلام مسنون کے بعد آپ کو ایسا مقام و مرتبہ اور شرف و فضیلت حاصل ہے جس تک رسائی میرے لیے ممکن نہیں، اس لیے کہ میری والدہ بنو حنیفہ کی ایک خاتون ہیں، اور آپ کی والدہ فاطمہؓ دخترِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، (اور خاتونِ جنت ہیں) اگر میری والدہ جیسی عورتوں سے زمین بھر جائے پھر بھی آپ کی والدہ کے برابر نہیں ہو سکتیں، لہٰذا اس مقام و مرتبہ کی بنا پر میرا مکتوب پڑھتے ہی آپ مجھے راضی کرنے میرے یہاں چلے آیئے! کہیں ایسا نہ ہو کہ جس فضیلت کو پانے کے آپ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں میں اس میں پہل کر لوں! والسلام۔''

حضرت حسینؓ نے خط پڑھا تو فوراً محمد بن حنفیہؒ کے گھر آئے، (انہیں معاف کر کے منایا اور) انہیں راضی کیا۔ (رفیق المسلمین فی الاسفار/ص:۳۲، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۶۸)

قرآنِ کریم نے جنتی لوگوں کی شان میں فرمایا:

﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (اٰلِ عمران: ۱۳۴)

جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے کے عادی ہیں، اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

صاحبو! انسان کے لیے شرافت و فضیلت کا اصل معیار ایمان، حسنِ خلق اور حسنِ عمل ہے، خاندان اور حسب نسب نہیں، لہٰذا اس پر اکتفا کر لینے کی ضرورت نہیں، سیدنا حسین ابن علیؓ کا حسب نسب نہایت اعلیٰ ہونے کے باوجود آپؓ نے اس پر اکتفا نہیں کر لیا، بلکہ حسنِ خلق و حسنِ عمل کو اپنا شعار بنایا۔

سیرتِ سبطِ پیغمبر کا سب سے جلی عنوان:

ان فضائل و محاسن کے علاوہ سیرتِ سبطِ پیغمبر کا سب سے جلی عنوان ''جذبۂ حق

پرستی'' ہے، خود بھی حق پر عمل کرتے، اوروں کو بھی اس کی تلقین کرتے، کبھی خلافِ حق وخلافِ شریعت کوئی بات برداشت نہ کرتے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ علامہ کردریؒ نقل کرتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ کے مقدس نواسے حضراتِ حسنینؓ ایک مرتبہ دریائے فرات پر تھے، ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے بڑی جلدی جلدی وضو کیا اور اسی طرح نماز پڑھی اور جلد بازی میں وضو اور نماز کے مسنون اور شرعی طریقوں میں کوتاہی ہوگئی، آپ حضراتؓ سے دیکھا نہ گیا، اسے سمجھانا چاہا، لیکن اندیشہ یہ ہوا کہ یہ عمر رسیدہ آدمی ہے، لہٰذا اپنی غلطی سن کر کہیں مشتعل نہ ہو جائے، اس لیے حکمت سے صحیح بات کہنی چاہیے، چناں چہ دونوں حضراتؓ نے بڑی حکمت اور بصیرت سے کام لیا، اس کے قریب گئے اور فرمایا: ''ہم دونوں نوجوان ہیں، اور آپ عمر رسیدہ ہونے کے سبب تجربہ کار ہیں، اس لیے وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہوں گے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو وضو کر کے اور نماز پڑھ کر دکھائیں، پھر اگر ہمارے وضو اور نماز کے طریقوں میں کوئی غلطی اور خلافِ شرع بات نظر آئے تو بتا دیجئے گا۔'' یہ کہہ کر دونوں نے سنت کے مطابق وضو کر کے نماز پڑھی، بوڑھے نے دیکھا تو سمجھ گیا، اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ (مناقب الامام الاعظم للکردریؒ /ص: ۳۹ تا ص: ۴۰، از تراشے/ص: ۱۱۴)

یہ تو بطورِ مثال ایک واقعہ ہے، ورنہ آپؓ کے ''جذبۂ حق پرستی'' کے لیے تو تنہا واقعۂ کربلا ہی کافی ہے!

کربلا کا واقعہ حالات کے کس تناظر میں پیش آیا؟ اس کی حقیقی وجوہات کیا تھیں؟ یزید کی ولی عہدی صحابہؓ اور خصوصًا سیدنا حسینؓ کو کیوں منظور نہ تھی؟ وہ آخر کیا چاہتے تھے؟ اس قسم کے سوالات کے جوابات کے لیے تاریخ کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد جو حقیقت منکشف ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے پسِ پردہ صرف اور صرف ''جذبۂ حق پرستی'' ہی کارفرما تھا، خدانخواستہ کوئی دنیوی غرض اور لالچ نہ تھی، اس موقع پر قدرے تفصیل سے واقعۂ کربلا پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دورِ خلافت اور خلیفہ کا حال:

اہلِ نظر کے نزدیک اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اسلام کا سب سے روشن دور دورِ نبوت ہے، جو امتیازی و انقلابی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد دورِ خلافت ہے، جو حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سے شروع ہوا، خلافت آسمانی، الٰہی اور شرعی حکومت کا دوسرا نام ہے، وہ حکومت عین اسلامی شریعت کے مطابق ہوا کرتی تھی، اس میں حکومت مال اور خراج (ٹیکس) کی وصولیابی تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر رعایا کے اعمال و اخلاق کی اصلاح، اور قوم وملت کی دینی و دنیوی اصلاح کی فکر کرنا بھی حکومت کے فرائض میں شامل تھا، اور وہ حکومت دنیا کی دیگر حکومتوں (مثلاً قیصر وکسریٰ) کی طرح موروثی (تخت نشینی والی) نہیں، بلکہ شورائی ہوا کرتی تھی، اور خلافت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن میں خوفِ الٰہی اور دل میں فکر عقبیٰ اور اللہ جل شانہٗ کے حضور جواب دہی کا پورا پورا احساس تھا، اس حکومت اور خلافت کا رئیس اور سربراہ خلیفہ کہلاتا تھا، جس میں کم از کم دس شرائط کا ہونا نہایت ہی ضروری تھا: (۱) مسلمان۔ (۲) عاقل۔ (۳) بالغ۔ (۴) آزاد۔ (غلامی سے) (۵) مرد۔ (۶) صحیح سالم۔ (تندرست) (۷) کتاب وسنت کا عالم۔ (۸) عادل۔ (۹) بہادر۔ (۱۰) قریشی۔ (امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ آخری شرط ضروری نہیں)

ظاہر بات ہے کہ ان صلاحیتوں کے حاملین نے جب حکومت کی تو اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ اسلام پوری تیزی اور قوت کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل گیا اور وعدۂ ربانی پورا ہوا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ﴾ (النور: ۵۵)

جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

اس آیت میں جو وعدہ اللہ رب العزت نے اپنے رسول ﷺ اور ان کی امت

سے کیا، اس کا پورا پورا ظہور ان ہی حضراتِ خلفاءِ راشدینؓ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں ہوا، اس لیے کہ جن شرائط (ایمان واعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ، اور جذبۂ حق) کی بنیاد پر یہ وعدہ کیا گیا تھا، وہ شرائط بھی ان ہی خلفاءِ راشدینؓ میں کامل ومکمل تھیں۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد کا حال:

مگر افسوس کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک دور تیس سال سے زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہا، خلافت کا سلسلہ جب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچا، تو ان کی حکومت میں خلافتِ راشدہ کا وہ مثالی رنگ نہ رہا، مزید برآں حضراتِ اکابر صحابہؓ سیدنا امیر معاویہؓ کی حکومت سے ابھی تو پورے طور پر مطمئن بھی نہ ہوسکے تھے کہ اپنے آخری زمانے میں ان سے ایک ایسا کام صادر ہوا یزید کی ولی عہدی کا جو رائے اور تدبیر کے اعتبار سے نفس الامر (حقیقت) کے اعتبار سے دو وجہ سے درست نہ تھا۔

(۱) اپنے بعد بیٹے کو ولی عہد نامزد کرنا خلفاءِ راشدینؓ کے طریقہ کے خلاف تھا۔

اگر چہ نیک نیتی کے ساتھ خلیفۂ وقت کا اپنے بیٹے کو اس کی اہلیت کے پیشِ نظر ولی عہد بنانا شرعاً جائز تو ہے، جیسا کہ حضرت امیر معاویہؓ نے کیا، لیکن تہمت کا موقع ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا بہتر ہے، اس لیے خلفاءِ راشدینؓ نے اس سے پرہیز کیا۔

(۲) خلیفہ کے لیے جو شرائط مطلوب تھیں اکابر صحابہؓ کے علم کے مطابق یزید ان پر پورا نہیں اترتا تھا، جب کہ اس سے اعلیٰ صفات و معیار کے مالک بہت سے بڑے بڑے صحابہؓ موجود تھے، لیکن حضرت امیر معاویہؓ سے یہ اجتہادی غلطی سرزد ہوگئی۔ ہم اس معاملہ میں اس سے زیادہ کچھ کہنا غیر مناسب سمجھتے ہیں۔

چناں چہ ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت امیرِ معاویہؓ سے اجتہادی غلطی ہوئی، حالاں کہ وہ بڑے آدمی تھے، تو بڑے کی چھوٹی سی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے، اس

لیے وہ بڑی سزا کے مستحق ہوئے، (نعوذ باللہ) فوراً جواب دیا: میاں! یہ معمولی سزا ہے کہ ہم تم جیسے گناہگار، گندے اور نالائق اتنے بڑے آدمی کو کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے غلطی کی۔

بہرکیف! کبارِ صحابہ خصوصاً عبادلۂ اربعہ یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کے اس موقف کی مخالفت کی، ان حضرات رضی اللہ عنہم کو پوری دیانت داری کے ساتھ اس بات کا یقین تھا کہ یزید صحیح طور پر خلافت کا اہل ہے ہی نہیں، وہ چاہتے تھے کہ یزید کے بجائے جو حقدار ہے اسے خلیفہ بنایا جائے، مگر بات نہ بنی، اس کے بعد ۶۰ھ میں جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اور یزید ان کا جانشین بن کر تختِ حکومت پر بیٹھا، تو بات اور زیادہ بگڑ گئی، حالات بدل گئے، اور ایک انتشار بپا ہوگیا۔

اس دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ہماری طرح حجاز کے اکابر و اہل حل وعقد نے بھی یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کردیا، ان حالات میں اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کے خلاف قدم نہ اٹھاتے تو سمجھ لیا جاتا کہ اسلام میں انتخابِ خلیفہ کے بجائے خاندانی بادشاہت بھی حکومت کا ایک طریقہ ہے، اس بنا پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے بھی اس تصور کے غلط ہونے کو ہمیشہ کے لیے لوگوں کے ذہن میں بٹھانے کا فیصلہ کرلیا، دوسری طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس عراق سے بکثرت خطوط اور وفود آنے لگے کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کو خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھ کر اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے، جس سے واضح ہوتا تھا کہ اہل عراق بھی ابھی تک یزید کی خلافت قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، لہٰذا صرف اہل شام کے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے ابھی تک اس کی خلافت منعقد ہی نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود بھی وہ پورے عالمِ اسلام پر اپنی طاقت کے زور پر حکومت کرنا چاہتا تھا، تو بقولِ شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ اس کی حیثیت ایک ایسے متغلب کی سی ہوئی جو غلبہ چاہتا ہے، مگر ابھی پا نہ سکا''۔

(حضرت امیر معاویہؓ اور تاریخی حقائق/ص: ۱۲۷)

اس حالت میں سیدنا حسینؓ یزید کے غلبہ کو روکنا جذبۂ حق کے تحت اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ ظالم کے ساتھ زندہ رہنا بھی جرم جانتے تھے، چناں چہ آج جو ہم فقہ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ جو شخص مسلمانوں کے انتخاب سے امیر بنا ہو اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں، یہ صحیح ہے، لیکن جو بزورِ قوت حکمران بن گیا ہو (جس کو قاضی ابو الحسن ماوردیؒ وغیرہ نے ''امارتِ قاہرہ'' سے تعبیر کیا ہے) اس کے خلاف بشرطِ قوت بغاوت جائز ہے، چوں کہ یزید امت مسلمہ کے اتفاق سے ابھی امیر بنا ہی نہ تھا، پھر حضرت حسینؓ کی رگوں میں خونِ نبوت تھا، آپؓ بہادر تھے، آپ رضی اللہ عنہٗ میں اس غلط روش کو روکنے کی پوری قوت تھی، پھر کوفہ والوں نے ساتھ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

سیدنا حسینؓ کا سفر کوفہ:

اس لیے کوفہ والوں کی دعوت پر آپؓ نے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو اپنا وکیل بنا کر حالات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے کوفہ روانہ کیا، جب وہ پہنچے تو کوفہ والوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جس سے انہوں نے چند روز کے قیام کے بعد یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں کے عام مسلمان یزید کی بیعت سے متنفر اور حضرت حسینؓ کی بیعت کے متمنی ہیں، چناں چہ آپؓ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت حسینؓ کے لیے بیعتِ خلافت لینی شروع کر دی، اور دیکھتے ہی دیکھتے کوفہ میں اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے حضرت حسینؓ کے لیے بیعت کر لی، پھر یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، تب حضرت مسلم بن عقیلؓ کو اطمینان ہو گیا کہ حضرت حسینؓ اگر تشریف لائے تو حجاز کے ساتھ عراق کے لوگ بھی آپ سے بیعت کر لیں گے، جس کے نتیجہ میں امت کے سر سے یزید کی مصیبت ٹل جائے گی، اور ان شاء اللہ ایک بار پھر صحیح خلافت قائم ہو جائے گی، اس خیال سے حضرت مسلمؓ نے حضرت حسینؓ کو کوفہ آنے کی بذریعۂ خط دعوت دے دی۔ (مستفاد از: شہید کربلا/ص: ۲، بحوالہ کامل ابن اثیر)

حضرت مسلمؓ کے خط سے جب کوفہ کے احوال معلوم ہوئے تو آپؓ نے ایک دینی ضرورت سمجھ کر کوفہ کا ارادہ کرلیا، بعض خیر خواہوں نے خطرات سے آگاہ کر کے سفر ملتوی کرنے کا مشورہ بھی دیا، مگر مقصد کی اہمیت نے آپؓ کو خطرات کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا، پھر تین یا آٹھ ذی الحجہ ۶۰ھ کو آپ مکہ مکرمہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

کوفہ کے حالات میں تبدیلی:

ادھر کوفہ کے احوال شاہی جاسوسوں کے ذریعہ کوفہ کے دارالحکومت دمشق میں یزید کو پہنچے، تو یزید نے اپنے خاص لوگوں کے مشورہ سے بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد کے نام ایک تاکیدی خط لکھا کہ ''فوری طور پر کوفہ جا کر مسلم بن عقیل کو خارج البلد کرو، اگر وہ مزاحمت کریں تو گرفتار کر کے قتل کر دو'' خط ملتے ہی ابن زیاد بصرہ سے کوفہ آیا اور جامع مسجد میں سب کو جمع کر کے ایک سخت تقریر کی کہ ''امیر المومنین (یزید) نے مجھے تمہارے شہر کا حاکم بنایا ہے، اور حکم دیا کہ میں تم میں سے جو مظلوم ہو اس کے ساتھ انصاف کروں، مطیع کے ساتھ احسان کروں، اور باغی کے ساتھ سختی کروں، یاد رکھو! میں فرماں برداروں کے ساتھ تو باپ کی طرح شفقت سے پیش آؤں گا، لیکن مخالفوں کے لیے سم قاتل ہوں'' اس تقریر سے کوفہ کے حالات میں تبدیلی پیدا ہوگئی، بعض نے خوف سے تو بعض نے لالچ میں آکر حضرت مسلم بن عقیلؓ کا ساتھ چھوڑ دیا، راہوں میں آنکھیں بچھانے والے اب آنکھیں چرانے لگے۔

حالات اچھے ہوں یا برے، بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی، اور صاحبو! دو چیزیں انسان کو حق سے محروم رکھتی ہیں: (۱) جہالت۔ (۲) ضد۔ اور دو چیزیں انسان کو حق سے ہٹاتی ہیں: (۱) خوف۔ (۲) لالچ۔ چنانچہ جہالت اور ضد نے مکہ کے مشرکوں کو حق سے محروم رکھا، اور خوف وطمع نے کوفہ کے منافقوں کو حق سے دور کر دیا۔

حضرت مسلم بن عقیلؓ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا، مگر معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا، وہ وقت بھی آیا کہ آپؓ کا ساتھ دینے والا اللہ جل شانہٗ کے سوا کوئی نہ رہا،

کوفہ میں آپ تن تنہا رہ گئے، بالآخر آپؓ کو گرفتار کرلیا گیا، جو گرفتار کرنے آئے تھے ان میں سے محمد بن اشعث سے آپؓ نے فرمایا: ''ایک آدمی فوری طور پر حضرت حسینؓ کی خدمت میں روانہ کرکے یہ اطلاع کی جائے کہ وہ جہاں ہوں وہاں سے واپس لوٹ جائیں، اور کوفہ والوں پر ہرگز اعتماد نہ کریں'' پھر آپؓ نے قریبی اعزہ میں سے ایک عمر بن سعد کو تین وصیتیں کیں:

(۱) میرا سات سو درہم کوفہ میں قرضہ ہے، وہ ادا کردیا جائے کہ قرض شہید کا بھی معاف نہیں۔ (مشکوٰۃ/ص:۳۳۰)

(۲) حضرت حسینؓ کو عزت کے ساتھ واپس جانے دیا جائے۔

(۳) میری لاش لے کر دفن کردی جائے۔ اس کے بعد حضرت مسلم بن عقیلؓ کو قصر شاہی کی بالائی منزل پر لے جا کر گردن مار کر شہید کردیا گیا، اور بڑی بے دردی کے ساتھ سر اور دھڑ نیچے گرادیا گیا۔ ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ''.

سیدنا حسینؓ کی گرفتاری:

وصیت کے مطابق محمد بن اشعث نے سیدنا حسینؓ کو اطلاع پہنچائی تو اس وقت آپ مقام ثعلبہ تک پہنچ چکے تھے، خبر سن کر سمجھ گئے کہ اب ان کے لیے کوفہ میں کوئی گنجائش نہیں، اور نہ اُس عظیم مقصد کا امکان ہے جس کے لیے اس سفر کا آپؓ نے عزم کیا تھا، لہٰذا واپسی مناسب تھی، کیوں کہ جنگ و جدال مقصد بالکل نہ تھا، پھر بعض رفقاءِ سفر کا مشورہ بھی یہی تھا، مگر حضرت مسلم بن عقیلؓ کی اولاد اور بھائی وغیرہ کہنے لگے: ''واللہ! ہم تو مسلمؓ کا قصاص لیں گے، یا پھر ان ہی کی طرح جامِ شہادت پی لیں گے۔

سوچا ہے کفیلؔ اب کچھ بھی ہو، ہر حال میں اپنا حق لیں گے
عزت سے جیے تو جی لیں گے، یا جامِ شہادت پی لیں گے

اس موقع پر حضرت حسینؓ نے فرمایا: ''اب اس کے بعد زندگی میں کوئی خیر معلوم

نہیں ہوتی'' غرض سفر جاری رکھا گیا، حتیٰ کہ منزل بمنزل کوفہ کے قریب ہو گئے، جب مقامِ ذی حشمہ پہنچے، تو حکومت شام کی جانب سے حر بن یزید تمیمی ایک ہزار سواروں کے ساتھ آ پہنچا، اور آپؓ کو گرفتار کر لیا، تب آپؓ نے وضاحت فرمائی کہ ''لوگو! میں خود یہاں نہیں آیا، تمہارے بلاوے پر آیا ہوں، تمہارے بہت سے خطوط اور وفود میرے پاس پہنچے کہ ہمارا اس وقت کوئی امیر اور امام نہیں، لہٰذا آپ آ کر ہماری رہبری فرمائیں، اس دعوت پر میں آیا ہوں، اب اگر تم اپنے وعدوں اور عہدوں پر قائم ہو تو میں تمہارے شہر کوفہ چلوں، اور اگر تمہاری رائے بدل گئی ہے، میرا آنا تمہیں پسند نہیں تو پھر میں جہاں سے آیا ہوں وہیں لوٹ جاتا ہوں'' جواباً حر بن یزید نے کہا: ''ان خطوط اور وفود کی ہمیں کچھ خبر نہیں، نہ ہم ان کے لکھنے والے ہیں اور نہ ہمارا ان سے کوئی واسطہ ہے، ہمیں تو امیر کا حکم ہے کہ جہاں آپ سے ملاقات ہو فوراً آپ کو عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں گرفتار کر کے پہنچایا جائے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''اس سے تو پھر موت ہی بہتر ہے'' حر کہنے لگا: ''مجھے تو آپ سے قتال کا حکم نہیں، اس لیے آپ کوئی مناسب راستہ اختیار کریں، اگر جنگ ہوئی تو آپ یقیناً مارے جائیں گے'' حضرت حسینؓ نے فرمایا: ''تم ہمیں موت سے ڈراتے ہو؟ تو سنو! اس موقع پر میں وہی کہتا ہوں جو حضور اکرم ﷺ کی مدد کو نکلنے والے صحابی نے اپنے بھائی کو کہا تھا۔

سَأَمْضِیْ، وَمَا بِالْمَوْتِ عَارٌ عَلیٰ الْفَتٰی　　إِذَا مَا نَوَی خَیْرًا، وَجَاهَدَ مُسْلِمًا

فَإِنْ عِشْتُ لَمْ أَنْدَمْ، وَإِنْ مِتُّ لَمْ أُلَمْ　　کَفٰی بِكَ ذُلًّا أَنْ تَعِیْشَ وَتُرْغَمَا

میں تو اپنا ارادہ پورا ہی کروں گا، اور مرنے میں جواں مرد کو عار نہیں جب کہ اس کی نیت خیر کی اور مسلمان ہو کر جہاد کرنے کی ہو، پھر اگر میں زندہ رہا تو کوئی ندامت نہیں، اور اگر مر گیا (شہید ہو گیا) تو کوئی ملامت نہیں، اور تمہارے لیے اس سے بڑی کیا ذلت ہو گی کہ ذلیل و رسوا ہو کر زندگی گذارو۔ حر بن یزید متاثر ہوا، مگر حکومت کی نمائندگی کی وجہ سے مجبور تھا، آپؓ کے قافلہ کو لے کر آگے بڑھا۔

سیدنا حسینؓ کربلا میں:

جب مقامِ نینویٰ پہنچے تو عبید اللہ بن زیاد کی جانب سے کوفہ کا ایک قاصد آکر حر بن یزید کو ایک خط دیتا ہے، جس کا مضمون یہ تھا: ''جس وقت میرا یہ خط ملے تم حسینؓ کو گھیر کر کسی ایسے چٹیل میدان میں لے آؤ جہاں کوئی جائے پناہ (قلعہ وغیرہ) ہو نہ پانی کا چشمہ، اور میں نے اس قاصد کو حکم دیا ہے کہ جب تک تم میرے اس فرمان کی تعمیل نہ کرو وہ تمہارے ساتھ رہے'' خط پڑھ کر حر بن یزید نے حضرت حسینؓ کو سنا کر اپنی مجبوری ظاہر کی کہ اس وقت میرے سر پر جاسوس مسلط ہے، لہٰذا میں آپؓ سے کوئی مصالحت نہیں کرسکتا، اس وقت قافلۂ حسینی میں سے حضرت زہیر بن القینؓ نے حضرت حسینؓ سے عرض کیا: ''حضرت! آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہر آنے والی گھڑی ہمارے لیے مشکلات میں اضافہ کررہی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ جو وقت آئے گا وہ اِس سے بھی زیادہ سخت ہوگا، موجودہ شامی لشکر سے مقابلہ کرکے ان سے نمٹنا آسان ہے آنے والے لشکر کی بنسبت، لہٰذا اجازت دیجئے!'' حضرت حسینؓ نے فرمایا: ''جنگ وجدال تو ہمارا مقصد تھا نہیں، لیکن اب حالات ایسے ہوگئے تب بھی میں اپنی طرف سے پہل کرنا نہیں چاہتا'' تو حضرت زہیرؓ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، پھر ہمیں سامنے والی بستی میں لے چلیں، جو دریائے فرات کے کنارہ پر ایک محفوظ جگہ ہے، پھر اگر وہ لوگ ہمیں روکیں گے تب ہم مقابلہ شروع کردیں گے'' ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ ابن زیاد کی جانب سے عمر بن سعد چار ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے آگیا۔

حالاں کہ وہ خود اِس کام کے لیے راضی نہ تھا، مگر خوف یا لالچ کی مجبوری تھی۔ عمر بن سعد نے بھی آنے کی وجہ پوچھی، تو حضرت حسینؓ نے وہی جواب دیا کہ میں از خود نہیں آیا، کوفہ والوں کے بلاوے پر آیا ہوں، وہ اگر انکار کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں، میں بخوشی واپس جانے کے لیے تیار ہوں، عمر بن سعد نے حضرت کا یہ جواب عبید اللہ بن زیاد کو لکھ بھیجا کہ ''حسینؓ واپس جانے کو تیار ہیں'' ابن زیاد کی طرف سے جواب آیا کہ ''حسینؓ کے سامنے

صرف ایک ہی بات رکھو کہ وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیں، اگر وہ انکار کریں تو ان پر پانی بالکل بند کرو" چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، عمر بن سعد نے فرات پر پانی روکنے کے لیے پانچ سو کا دستہ متعین کردیا، جب اس حالت میں تین دن گذر گئے تو بہت سوچ کر آپؓ نے شامی لشکر کے سامنے آخری فیصلہ سنایا، مقصد یہ تھا کہ کسی طرح جنگ کی نوبت نہ آئے، آپؓ نے فرمایا: "کوفہ والو! ہمارے متعلق تین صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرلو!

(۱) ہم جہاں سے آئے وہیں واپس چلے جائیں، لہٰذا ہمارا راستہ نہ روکا جائے۔

(۲) ہمیں کسی اسلامی ملک (ترکی) کی سرحد پر پہنچا دیا جائے، وہاں عام لوگوں کا جو حال (یزید کی بیعت کے بارے میں) ہوگا، ہم اسی کو اختیار کریں گے۔

(۳) یزید کی ملاقات کرادی جائے، تاکہ ہم آپس میں اپنا معاملہ حل کرلیں۔

(بعض نے آخری دو صورتوں کا انکار کیا ہے) آپؓ کا یہ فیصلہ نہایت ہی معقول تھا، اس لیے عمر بن سعد نے ابن زیاد کو اس پر مطلع کرتے ہوئے ایک خط بھیجا کہ "اللہ کا شکر ہے، جنگ کی آگ بجھ گئی اور فتنہ ٹل گیا، ہمیں حسینؓ نے ان تین صورتوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا اختیار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس سے مقصد پورا ہو جاتا ہے" شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں: "اس فیصلہ حسینی کا صاف مطلب یہی ہے کہ "حضرت حسینؓ کو جب یہ معلوم ہوگیا کہ یزید کا تسلط پوری طرح قائم ہوگیا، تو سلطانِ متغلب کی حیثیت سے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کے لیے رضامند ہوگئے تھے، لیکن عبید اللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کے مشورے پر عمل کیا (اس نے کہا تھا: آج حسین اگر تمہارے ہاتھ سے نکل گئے تو کبھی ان پر قابو پانا ممکن نہ ہوگا، اور مجھے تو اس میں عمر بن سعد کی سازش ہی معلوم ہوتی ہے، میں نے سنا کہ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہیں، اس لیے حسین کو اسی بات پر مجبور کرو کہ وہ تمہارے پاس آئے) عبید اللہ بن زیاد نے اس پر عمل کرتے ہوئے تینوں صورتوں کا انکار کردیا، اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ (Unconditional surrender) اَن کنڈیشنل سرنڈر، یعنی

غیر مشروط طور پر ہمارے پاس حاضری دیں'' ظاہر ہے کہ اس نامعقول بات کو ماننا حضرت حسینؓ پر نہ لازم تھا، نہ مناسب، اس لیے بالآخر مقابلہ کرنا پڑا''۔(از: حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق/ص: ۱۲۷)

سیدنا حسینؓ کی شہادت:

۹/محرم الحرام ۶۱ھ کو جنگ کی تیاری شروع ہوگئی، حریف مقابل بلامہلت جنگ کا آغاز کرنا چاہتے تھے، حضرت عباس بن علیؓ نے آکر سیدنا حسینؓ کو اطلاع دی، تو حضرت نے فرمایا کہ'' آج کی رات قتال ملتوی کردو، تاکہ میں وصیت اور نماز و مناجات (دعا و استغفار) وغیرہ کرسکوں، اس پر شمر اور عمر بن سعد نے دوسرے لوگوں سے مشورہ کرکے مہلت دے دی، اور واپس ہوگئے، حضرت نے اپنے اہلِ بیت اور اصحاب کو جمع کیا، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ''دشمن میرے طلبگار ہیں، وہ جب مجھے پالیں گے تو تمہاری طرف التفات نہ کریں گے، لہٰذا تم واپس ہو جاؤ، مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوگا'' یہ سن کر سب بیک زبان بول اٹھے: ''اللہ کی قسم! ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے'' بہن زینب بے قرار ہوکر رونے لگیں، تو آپؓ نے تسلی دی، پھر وصیت فرمائی: ''میری بہن! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ اور قسم دیتا ہوں، میری شہادت کے بعد ماتم نہ کرنا، سینہ کوبی نہ کرنا، آواز سے رونا اور چلانا نہیں'' (افسوس کہ آج حب حسینؓ کے دعوے دار ہی آپؓ کی اس آخری وصیت کی مخالفت کرتے ہیں) اس کے بعد آپؓ نے پوری رات نماز، دعا اور استغفار میں گذاری، یہ عاشوراء کی رات تھی، صبح یومِ عاشوراء، جمعہ اور ایک روایت کے مطابق سنیچر تھا، صبح کی نماز کے بعد شامی لشکر سامنے آگیا، حضرت حسینؓ کے پاس اس وقت کوئی لشکر جرار نہیں تھا، بلکہ کل ملاکر بہتر (۷۲) افراد تھے، جس میں سے بتیس (۳۲) سوار اور چالیس (۴۰) پیادہ تھے، لشکر حسینی کو ترتیب دیا گیا، میمنہ پر زہیر بن القین، اور میسرہ پر حبیب بن مطہر کو رکھا، اور جھنڈا اپنے بھائی حضرت عباس کو دیا، سامنے چار ہزار کا لشکر مسلح تھا۔

آغازِ جنگ سے قبل حر بن یزید اپنی سابقہ کاروائی پر نہایت نادم ہوکر حضرت حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: ''میری ابتدائی غفلت کا یہ نتیجہ ہے، واللہ! مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ معاملہ اس حد تک پہنچ جائے گا، حضرت معاف فرما دیجئے، میں سچے دل سے تائب ہوتا ہوں، اب جنگ ہو ہی رہی ہے تو میں آپؓ کی حمایت میں قتال کرتا ہوا جان دے دوں گا۔'' اور پھر ایسا ہی ہوا۔

صاحبو! دلوں اور ذہنوں کی دنیا میں بھی انقلاب آتے دیر نہیں لگتی، جب قسمتوں کا پانسا پلٹتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ بے شان وگمان یک بیک حالات بدل جاتے ہیں، اور دیکھنے والوں کی نظر حیرت زدہ ہوکر رہ جاتی ہے، کہ یہ کیا سے کیا ہوگیا، آناً فاناً کام ہوگیا، جنگ سے پہلے سیدنا حسینؓ نے شامی لشکر کے قریب جاکر بطورِ اتمام حجت ایک خطبہ دیا، کہ شاید وہ خونِ ناحق سے بچ جائے، جس میں فرمایا:

''أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوا قَوْلِيْ، وَلَا تَعْجَلُوْنِيْ، حَتّٰى أَعِظَهُمْ بِمَا يَجِبُ لَكُمْ عَلَيَّ، وَحَتّٰى أَعْتَذِرَ إِلَيْكُمْ مِنْ مَقْدَمِيْ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ قَبِلْتُمْ عُذْرِيْ، وَصَدَّقْتُمْ قَوْلِيْ، وَ أَنْصَفْتُمُوْنِيْ كُنْتُمْ بِذٰلِكَ أَسْعَدَ، وَلَمْ يَكُنْ عَلَيَّ سَبِيْلٌ، وَإِنْ لَمْ تَقْبَلُوْا مِنِّيْ الْعُذْرَ فَأَجْمِعُوْا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَ كُمْ، ثُمَّ لَاتَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً، ثُمَّ اقْضُوْا إِلَيَّ، وَلَاتُنْظِرُوْنِ، إِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتَابَ، وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ''.

لوگو! میری بات سنو! جلدی نہ کرو، تاکہ میں حق نصیحت ادا کروں جو میرے ذمہ ہے، اور تاکہ میں تمہیں اپنے یہاں آنے کا سبب بیان کروں، پھر اگر تم میرا عذر قبول کرو، میری بات کی تصدیق کرو اور میرے ساتھ انصاف کرو، تو اس میں تمہاری سعادت مندی ہے،

اور پھر تمہارے لیے میرے ساتھ قتال کا کوئی راستہ نہیں، لیکن اگر
میرا عذر قبول نہ کرو، تو تم سب مل کر مقرر کر وا پنا کام اور جمع کر لو اپنے
شریکوں کو، پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ، پھر کر گذرو میرے
ساتھ اور مجھے مہلت نہ دو، بلا شبہ میرا ولی اللہ ہے، جس نے کتاب
اتاری، اور وہی صالحین کا ولی ہے۔''

اخیر کے الفاظ وہ ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہے تھے، اور بھی آپؓ نے نصیحت آمیز باتیں بیان فرمائیں۔

جب گفتگو طویل ہونے لگی تو شمر لعین نے آگے بڑھ کر پہلا تیر چلا دیا، اور اس طرح تیر اندازی کا سلسلہ شروع ہو کر گھمسان کی جنگ ہوئی، جس میں فریق مخالف کے بھی کافی لوگ مارے گئے، اور حضرت کے بہت سے رفقاء بھی شہید ہو گئے، اسی اثنا میں نمازِ ظہر کا وقت ہوا، جس کے کانوں میں کملی والے نے اذان دی ہو اس کی نماز کب قضا ہو سکتی تھی؟ آپؓ نے تلواروں کے سایہ میں بھی نمازِ عشق ادا فرمائی، نمازِ ظہر صلوٰۃ الخوف کے مطابق ادا کی گئی۔ بقولِ فقیہ النفس حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ: پوری امت متفق ہے کہ صلاۃ الخوف اب بھی مشروع ہے اور اسے پڑھنا جائز ہے، صرف امام ابو یوسفؒ اور امام مزنی شافعیؒ اس کی مشروعیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ (از تحفۃ الالمعی / ج:۲/ص:۴۴۸)

حضرتؓ کے رفقاء یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کر گئے، اب حضرتؓ تقریباً تنہا رہ گئے، اللہ اللہ! انقلابِ زمانہ کا کیسا عجیب اور عبرت ناک منظر تھا، جس کے نانا کے گھر کی پاسبانی ملائکہ کرتے تھے، کربلا میں اس وقت ان کا نواسا تنہا رہ گیا، روئے زمین پر اللہ جل شانہٗ کے سوا اس کا کوئی ناصر و حامی نہ رہا، لیکن اس کے باوجود بھی کسی کو جرأت نہ ہوئی، کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی، کوئی آپؓ کو مارنے کا گناہ اپنے سر لینا نہ چاہتا تھا، لیکن شجاعت و جرأت کا پیکر برابر بڑھتا گیا، دشمنوں پر چڑھتا گیا اور مسلسل لڑتا گیا، حتیٰ کہ قبیلۂ کندہ کا ایک

شقی مالک بن نسیر آگے بڑھا اور حضرت حسینؓ کے سر پر تلوار سے حملہ کر دیا، سر پر خفیف سا زخم پڑا، اس کے بعد شمر دس آدمیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھا، تو آپؓ سخت پیاس اور سخت زخموں کے باوجود نہایت دلیرانہ مقابلہ کرتے رہے، بالآخر دشمنوں کے یکبارگی حملہ سے سبط پیغمبر بعمر پچپن سال (۵۵) شہید ہو گیا۔ ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن، فَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ، وَرَزَقَنَا حُبَّهٗ وَحُبَّ مَنْ وَالَاهُ''. آمين.

شہادت کے بعد آپؓ کی لاش کو دیکھا گیا تو تینتیس (۳۳) زخم نیزوں اور چونتیس (۳۴) زخم تلواروں کے تیروں کے علاوہ آپ کے بدن پر تھے۔

راہِ خدا میں مرحبا، سوکھا گلا کٹا دیا:

حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت حسینؓ کو پھول فرمایا۔ اور سب جانتے ہیں کہ پھول نہایت نازک، حسین اور دل رُبا ہوتا ہے، اسے مکان کی زینت، ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور گلے کا ہار بنایا جاتا ہے، پھول کو تو بھول کر بھی کوئی نہیں مسلتا، کس قدر ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے کربلا میں محمد ﷺ کے پھول کو مسل ڈالا، لیکن حسینؓ نے کربلا میں حق واضح کر دیا، کہنے والے نے سچ کہا کہ

باطل وحق حسینؓ نے کر کے جدا بتا دیا ☆ راہِ خدا میں مرحبا، سوکھا گلا کٹا دیا
ذاتِ حسین نور تھی، گویا چراغِ طور تھی ☆ کون ومکاں میں نور کا جس نے دیا جلا دیا
نورِ نظر رسول ﷺ کا، لختِ جگر بتول کا ☆ یعنی حسینؓ نے سبھی لُٹا کر ہمیں بتا دیا
نامے ہزار بھیج کر کوفی تمام پھر گئے ☆ شیطان ان پہ آ گیا، فتنہ نیا اٹھا دیا
سارے جوان کٹ گئے، بچے شہید ہو گئے ☆ آلِ نبی نے حشر کا نقشہ یہاں بتا دیا
نالہ کناں شجر حجر، گریہ کناں جن وبشر ☆ جس نے سنا وہ رو دیا، تو نے یہ کیا سنا دیا

قاتلانِ حسینؓ کا انجام:

امامِ زہریؒ فرماتے ہیں: ''جو لوگ قتل حسینؓ میں شریک تھے ان میں سے ایک بھی

ایسا نہ بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو، کوئی قتل کیا گیا، تو کسی کا چہرہ سخت سیاہ ہوگیا، یا مسخ ہوگیا، اور ظاہر ہے کہ یہ ان کی اصلی سزا نہیں، بلکہ اس کا ادنیٰ نمونہ ہے جو عبرت کے لیے دنیا میں دکھلایا گیا، یزید کو ایک دن بھی چین نصیب نہیں ہوا، تمام اسلامی ممالک سے خونِ شہید کا مطالبہ اور بغاوتیں شروع ہوگئیں، دو سال آٹھ ماہ کے بعد اس کی بھی موت واقع ہوگئی۔

عبیداللہ بن زیاد کے متعلق ترمذی میں حضرت عمارہ بن عمیرؓ سے ایک روایت ہے کہ ''جب عبیداللہ بن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سروں کو ابراہیم بن اشتر نے مولی گاجر کی طرح مسجد کے صحن میں کاٹ کر ڈھیر لگایا، تو اس منظر کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی ایک بھیڑ لگی، میں بھی گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لوگوں میں ایک شور ہوتا ہے کہ ان کے سروں میں ایک سانپ گشت کرتا ہوا عبیداللہ بن زیاد کی ناک میں گھس جاتا اور تھوڑی دیر اس کی ناک میں رہ کر پھر نکل کر غائب ہوجاتا، میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے کئی مرتبہ دیکھا۔''
(ترمذی شریف/ص: ۲۱۸، از: بکھرے موتی/ص: ۴۹)

واقعہ شہادت کے پانچ سال بعد ۶۶ھ میں مختار نے قاتلانِ حسینؓ سے قصاص لینے کا ارادہ ظاہر کیا، تو عام مسلمان بھی اس کے ساتھ ہوگئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو اتنی قوت حاصل ہوئی کہ کوفہ اور عراق پر اس کا تسلط ہوگیا، تو اس نے اعلانِ عام کیا کہ قاتلانِ حسینؓ کے علاوہ سب کو امن دیا جاتا ہے، اور پھر قاتلانِ حسینؓ کی تلاش و تفتیش پر اُس نے اپنی پوری قوت خرچ کردی، ایک ایک کو چن چن کر قتل کیا، ایک مرتبہ ایک ہی دن میں دو سواڑتالیس (۲۴۸) آدمی اس جرم میں قتل کیے گئے، کہ وہ قتل حسین میں شریک تھے، شمر لعین کو قتل کرکے اس کی لاش کتوں کے سامنے ڈال دی گئی۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی کتاب ''شہید کربلا'' میں تفصیل سے ان واقعات پر روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قاتلانِ حسینؓ کا یہ عبرتناک انجام معلوم کرکے بے ساختہ یہ آیت زبان پر آتی ہے:

﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ﴾ (القلم : ۳۳)

(اللہ جل شانہٗ کا) **عذاب ایسا ہی ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا ہے، کاش وہ سمجھ لیتے۔**

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

مجھے کوفہ والو! مسافر نہ سمجھو ☆ میں آیا نہیں ہوں، بلایا گیا ہوں
اک مہماں بنا کر ستایا گیا ہوں ☆ میں رویا نہیں ہوں، رُلایا گیا ہوں
ہے بابا علی، اور ماں فاطمہ ہیں ☆ ہیں بھائی حسن، نانا خیر الوریٰ ہیں
میرے کوفہ والو! مراتب تو سمجھو ☆ نجومِ ہدایت بنایا گیا ہوں
خدا جانے کیسی ہے یہ میزبانی! ☆ بہتّر پیاسوں کا ہے بند پانی
مقدر میں ہے جامِ کوثر کا پینا ☆ میں پیاسا نہیں ہوں، پلایا گیا ہوں
خیمہ جلایا، ساماں بھی لوٹا ☆ غنچہ بھی ٹوٹا، گلستاں بھی چھوٹا
بہشت بریں میں مکاں بن رہا ہے ☆ میں اجڑا نہیں ہوں، بسایا گیا ہوں
جھکایا تھا جو سر دربارِ خدا میں ☆ وہی سر قلم ہوگیا کربلا میں
شہادت کی منزل کو پایا ہے میں نے ☆ میں مردہ نہیں ہوں، جِلایا گیا ہوں

☆......☆......☆

(۲۲)

شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ بُرۡدَۃَ رضی اللہ عنہ عَنۡ أَبِیۡهِ قَالَ: "رَفَعَ -یَعۡنِی النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم- رَأۡسَهُ إِلَی السَّمَآءِ، وَکَانَ کَثِیۡراً مِمَّا یَرۡفَعُ رَأۡسَهُ إِلَی السَّمَاءِ فَقَالَ: "النُّجُوۡمُ أَمَنَةٌ لِلسَّمَآءِ، فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُوۡمُ أَتَی السَّمَآءَ مَا تُوۡعَدُ، وَأَنَا أَمَنَةٌ لِأَصۡحَابِیۡ، فَإِذَا ذَهَبۡتُ أَنَا، أَتٰی أَصۡحَابِیۡ مَا یُوۡعَدُوۡنَ، وَأَصۡحَابِیۡ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِیۡ، فَإِذَا ذَهَبَ أَصۡحَابِیۡ أَتٰی أُمَّتِیۡ مَا یُوۡعَدُوۡنَ".

(رواه مسلم، مشکوٰۃ/ص:۵۵۳/ باب مناقب الصحابۃ رضی اللہ عنہم، الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ "ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف اپنا سر مبارک اٹھایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر (انتظارِ وحی میں) آسمان کی طرف (دیکھتے اور) سر اٹھایا کرتے تھے، پھر فرمایا: "ستارے آسمان کے لیے امن وسلامتی کا باعث ہیں، جس وقت وہ جاتے رہیں گے تو وہ چیزیں آئیں گی جن کا وعدہ کیا گیا۔ (یعنی آسمان کا پھٹنا اور لپٹنا) اسی طرح میں اپنے صحابہؓ کے لیے باعث امن وسلامتی ہوں، جب میں جاتا رہوں گا تو وہ چیزیں آئیں گی جن کا وعدہ کیا گیا، (یعنی اختلاف اور بعض اعرابی قبائل کا ارتداد) اسی طرح میرے صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) میری امت کے لیے باعث امن ہیں، جب وہ نہ رہیں گے تو میری امت میں وہ چیزیں آئیں گی جن کا ان سے وعدہ کیا گیا"۔ (یعنی بد

اعتقادی و بد عملی اور بدعات، خیر کا خاتمہ یا کمی اور شر کی اشاعت)

صحابہؓ آفتابِ نبوت کے سب سے زیادہ فیض یافتہ :

اربابِ علم و دانش! یہ حقیقت مسلم ہے کہ جو چیز (ظاہری) آفتاب سے جتنی زیادہ قریب ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کے نور سے منور اور متاثر ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو چیز جتنی زیادہ دور ہوتی ہے وہ اتنی ہی اس کی نورانی شعاعوں اور روشنی سے کم مستفید ہوتی ہے، یہ اسی کا اثر ہے کہ جب سورج نکلتا ہے تو فضا بلا واسطہ اس کے سب سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے وہی سب سے زیادہ اس کی روشنی اور حرارت کا اثر لیتی ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ فضا صرف آفتاب کے نور سے منور اور روشن ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مستغرق اور فنا ہو جاتی ہے، اسی لیے فضا کے روشن ہو جانے اور چمک اٹھنے کے باوجود اس کی روشنی اور چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی، بلکہ آفتاب کی تیزی اور روشنی ہی نظر آتی ہے، اور فضا کے ہر حصّہ میں آفتاب ہی نظر آتا ہے۔ ٹھیک یہی صورت اور حقیقت روحانی آفتاب کی بھی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو تمام ہی لوگوں کے لیے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت تو تمام کائنات کی کل مخلوق کے لیے ہے، آپ ﷺ کے نورِ ہدایت سے تو سارا عالم ہی منور ہوا اور اس کے عالمگیر اثرات سے بھی سب ہی متاثر اور مستفید ہوئے، لیکن سب سے زیادہ آپ ﷺ سے فیضیاب وہ طبقہ ہوا جو سب سے زیادہ اور بلا واسطہ آپ ﷺ کے قریب رہا، اور وہ طبقہ حضراتِ صحابۂ کرامؓ کا ہے، بلا شبہ امت کا یہ طبقہ نہ صرف یہ کہ نورِ نبوت سے سب سے زیادہ منور اور متاثر ہوا، بلکہ فضا کے مانند روحانی آفتاب (آپ ﷺ کی ذاتِ پاک) میں مستغرق اور فنا ہو گیا، اسی لیے ہر صحابیؓ کی سیرت میں حضور ﷺ کا اسوہ اور نمونہ ہی نظر آتا ہے، اور تمام صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پر نور زندگی کا عملی نمونہ تھے، اور یہ آپ ﷺ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔

صحابیؓ کسے کہتے ہیں؟

چوں کہ "صَحَابِيٌّ" کا یہ لفظ "صُحْبَةٌ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ساتھ رہنے والا، یہ صحبت کم ہو یا زیادہ، دنوں کی ہو یا مہینوں اور سالوں کی، اور حقیقی ہو یا مجازی، لغت کے اعتبار سے لفظ "صحابیؓ" کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے، لیکن اصطلاحی اعتبار سے "صحابیؓ" کا اطلاق ابن حجرؒ کے قول کے مطابق اس خوش نصیب پر ہوتا ہے جس نے ایمان کی حالت میں حضور ﷺ کی زیارت کی ہو (یا خود حضور ﷺ کی نظر اس پر پڑی ہو) پھر اسلام وایمان ہی پر اس کی وفات بھی ہوئی ہو، تو اسے شرفِ صحابیت حاصل ہوگا، جو سب سے بڑا اعزاز ہے، خواہ اس کی مدتِ صحبتِ رسول کم ہو یا زیادہ، کوئی حدیث حضور ﷺ سے نقل کی ہو یا نہ کی ہو، کسی غزوہ میں شامل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، حتیٰ کہ کسی کو صرف بحالت ایمان حضور ﷺ کا دیدار نصیب ہوا، لیکن مجلس رسول میں بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو، یا نابینا ہونے کے سبب خود حضور ﷺ کو سر کی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکا، (مگر دل کی آنکھ سے دیکھا اور صحبت رسول ﷺ کو پالیا) تو وہ بھی طبقۂ صحابہ میں شامل ہے۔ واللہ اعلم۔ (الا صابہ/ص:۴/۱، از: حضرت ابو ہریرہؓ حیات اور خدمات/ص:۱۸)

اسی لیے شاہ حبشہ اصحمہ نجاشی اور حضرت اویس قرنیؒ کا شمار صحابہؓ میں نہیں ہوگا، کہ انہیں آپ ﷺ کے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ اور جو لوگ ملاقات سے مشرف ہوئے، گو کم عمر رہے ہوں، مگر وہ صحابی کہلائیں گے۔ جیسے حضرات حسنینؓ اور حضرت محمود بن ربیعؓ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ صحابی وہی ہے جس کو بحالت ایمان رسول اللہ ﷺ کی صحبت ملی ہو، یا زیارت نصیب ہوئی ہو، تو اسے نگاہِ رسول اللہ ﷺ اور صحبت رسول اللہ ﷺ سے وہ شرف ملا جو امت کے کسی اور طبقہ کو نہیں مل سکا، کیوں کہ آدمی ایمان وتقوی سے ولی تو بن سکتا ہے، صحابی نہیں، عدالت میں عدل وحق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا قاضی تو بن سکتا ہے، صحابی نہیں،

میدانِ جہاد میں دشمنانِ دین سے مقابلہ کرنے والا غازی تو بن سکتا ہے، صحابی نہیں، کعبۃ اللہ کا حج کرنے والا حاجی تو بن سکتا ہے، صحابی نہیں، بلکہ کتاب اللہ بھی اپنے کسی قاری کو صحابی نہیں بنا سکتی، نہ احادیث رسول اللہ ﷺ کسی کو صحابی بنا سکتی ہیں، ہاں، آدمی کو جو چیز صحابی بناتی ہے وہ ہے صحبت رسول اللہ ﷺ اور نگاہِ رسول اللہ ﷺ، حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ نے اس سارے مضمون کا خلاصہ اپنے ان اشعار میں بیان کر دیا کہ

در فشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا ☆ دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ پرنور کو اپنی کھلی اور سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حضرات صحابہؓ کے علاوہ اس عالم میں امت کے اور کسی طبقہ کو نصیب نہیں ہوا، ان ہی کی شان میں فرمایا:

عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لَا تَمَسُّ النَّارُ مُسْلِمًا رَاٰنِیْ، أَوْ رَاٰی مَنْ رَاٰنِیْ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵۵٤/الفصل الثانی)

نارِ دوزخ اس خوش نصیب کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھ کو ایمان کی حالت میں دیکھا، یا مجھے دیکھنے والوں کو دیکھا۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے حضرات صحابہؓ اور ان کے متبعینؒ کی۔

صحابہؓ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندے:

علماء فرماتے ہیں کہ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر بابرکت جماعت اور کوئی نہیں ہے، کیوں کہ جیسے حق تعالیٰ نے حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا، اسی طرح حضراتِ صحابہؓ کو بھی اپنے نبی کی صحبت کے لیے پسند فرمایا، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾ (النمل: ۵۹)

یعنی آپ فرما دیجیے کہ ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اور سلام ہے ان بندوں پر جن کو اللہ نے منتخب فرمایا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں حضرات صحابہؓ کو منتخب بندے قرار دیا گیا ہے۔ (مقام صحابہ/ص:۴۹)

اس کی تائید حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے، ارشادِ نبوی ہے:

''أَکْرِمُوْا أَصْحَابِیْ، فَإِنَّھُمْ خِیَارُکُمْ''. (نسائی، مشکوٰۃ/ص:٥٥٤)

لوگو! میرے صحابہؓ کی تکریم و تعظیم کرو، کیوں کہ وہ تم میں سے برگزیدہ اور منتخب (پسند) کیے ہوئے ہیں۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں عظمتِ صحابہؓ کے لیے اتنی بات بھی کافی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ قیمتی چیز قیمتی جگہ ہی رکھی جاتی ہے، مقدس چیز مقدس جگہ میں رکھی جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے سب سے بڑے اور مقدس نبی کو سب سے مقدس جماعت میں رکھا، ہمارے آقا ﷺ اللہ جل شانہ کی ساری مخلوق میں سب سے افضل ہیں، تو ان کے صحابہؓ ساری امت میں سب سے افضل ہیں، حضور ﷺ کی پوری امت میں افضل ترین طبقہ بلکہ سب سے بہترین سرمایہ حضراتِ صحابہؓ ہیں، صحابۂ کرامؓ کی جماعت حضور ﷺ اور امت کے درمیان سب سے مقرب اور مقدس واسطہ ہے، صحابہؓ حضور ﷺ کے براہِ راست شاگرد، صحبت یافتہ اور مرید ہیں، صحابہؓ نزولِ قرآنِ کریم کے عینی گواہ اور شاہد ہیں، صحابہؓ کا مدرسہ بیت اللہ، معلم جناب محمد رسول اللہ ﷺ، نصابِ تعلیم کلام اللہ، ممتحن خود اللہ تعالیٰ اور نتیجۂ امتحان ''رضي اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ''. اب جو ان کی عظمت کو مان لے وہ رحمۃ اللہ، اور جو انکار کرے اس پر لعنۃ اللہ۔

صحابہؓ نبوت کا اصل کارنامہ:

صحابہؓ حضور ﷺ کے تیار کیے ہوئے افراد، بلکہ نبوت کا اصل کارنامہ ہیں، نبوت نے دنیا کو وہ افراد دیے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں، اور ہر قوت و نعمت کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہونے کے

ساتھ اس کی ذات سے استفادہ کرنے اور اس سے مزید نعمتیں حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ صحابہؓ ہی ہیں جو ساری انسانیت کے شرف وفخر کا باعث ہیں، اس پوری کائنات میں حضراتِ انبیاء کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین وجمیل، دل کش اور دل آویز تصویر نہیں ملتی جوان کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا ایمان ویقین پختہ، ان کا علم گہرا، ان کا دل سچا، ان کی زندگی بے تکلف، ان کی بے نفسی وخداترسی، ان کی پاک بازی و پاکیزگی، ان کی شفقت ورقت، ان کی امانت ودیانت، ان کی شجاعت وجلالت، ان کا ذوقِ عبادت وشوقِ شہادت، ان کی شہسواری اور شب زندہ داری، ان کی سیم وزر سے بے پرواہی ودنیا سے بے رغبتی دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، اگر شانِ صحابہؓ کی شہادت تاریخ پیش نہ کرتی، اور دنیا کے صحیح العقل وسلیم الفطرت لوگ اس کی تصدیق نہ کرتے، تو یہ ایک شاعرانہ تخیل اور افسانہ معلوم ہوتا۔ لیکن صحابہؓ تاریخ کی ایک حقیقت ہیں، صحابہؓ کارنامۂ نبوت ہیں، صحابہؓ کمالاتِ نبوت کا مجموعہ اور خلاصہ ہیں۔ ان ہی کی یہ شان تھی کہ

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل وپاکباز

یاد رکھو! صحابہؓ کا انکار فیضِ نبوت کا انکار ہے، اسی لیے مجموعی طور پر تمام صحابہؓ کی صداقت، للّٰہیت، دیانت، عدالت، ثقاہت اور عفت پر امت کے تمام ہی صحیح العقیدہ لوگوں کا اتفاق ہے، جن کی تعداد جمہورِ امت کے بقول ایک لاکھ سے زیادہ ہے، جن میں سے ہر صحابیؓ صحبتِ نبی کی وجہ سے ولایت کے سارے درجوں میں سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز تھا۔

کیوں کہ صحیح یہ ہے کہ

یک زمانہ صحبتے با انبیاء بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

صحابہؓ کے درجات:

البتہ آپس میں ان کے درجات مختلف تھے، مثلاً:

(۱) جو صحابہؓ بالکل ابتداء میں اسلام لائے، اور اسلام کے خاطر سخت سے سخت حالات سے دوچار ہوئے، انہوں نے اقامت دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ایسی فقید المثال قربانیاں دیں کہ ان کا انفرادی واجتماعی کردار تا قیامت امت کے لیے مشعل راہ بن گیا۔

(۲) بعض صحابۂ کرامؓ وہ ہیں جو سفر وحضر میں ہر وقت صحبت رسول ﷺ میں رہا کرتے۔

(۳) جب کہ بعضوں کو یہ اعزاز مختصر مدت کے لیے حاصل ہوا تھا، جیسے حجۃ الوداع کے موقع پر انہیں صحبتِ رسول اللہ ﷺ یا زیارتِ رسول اللہ ﷺ کی صرف ایک ہی جھلک نصیب ہوئی۔ اس لیے علماءِ امت نے حضراتِ صحابہؓ کی خدمات، مدتِ صحبت اور حضور ﷺ کے ساتھ غزوات میں شرکت وغیرہ کے پیش نظر ان کے الگ الگ درجات قائم فرمائے، جن میں سب سے افضل درجہ حضراتِ شیخینؓ (سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ) کا ہے، اس کے بعد حضراتِ صاحبینؓ (سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا علی مرتضیٰؓ) کا ہے، ان خلفاءِ اربعہ کے بعد عشرۂ مبشرہ یعنی وہ دس صحابہؓ جنہیں خصوصی طور پر دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی، جن میں چار تو یہی خلفاءِ اربعہ ہیں، ان کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جرّاحؓ ہیں۔ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵۶۶/ الفصل الثانی)

پھر اہل بدرؓ، اہل احدؓ، اہل بیعت رضوانؓ، درجہ بدرجہ، پھر وہ انصارؓ جو بیعت عقبۂ اولیٰ یا ثانیہ میں شریک ہوئے، پھر وہ جنہوں نے دونوں قبلوں کا استقبال کیا، (آخری درجہ فتح مکہ اور اس کے بعد مسلمان ہونے والوں کا ہے، جن میں حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت

معاویہؓ) وغیرہ ہیں۔ (تدریب الراوی/ص:۴۰۹، از: حضرت ابوہریرہؓ حیات وخدمات/ص:۲۲)

غرض یہ درجاتِ صحابہ تو ان کے آپس کے اعتبار سے ہیں، ورنہ ہمارے لیے تو ہر صحابی لاکھوں ابوحنیفہؒ، امام بخاریؒ اور جنید بغدادیؒ وغیرہ سے افضل ہے۔ ہمیں تو صدیق اکبرؓ میں حضور ﷺ کا کمال، فاروق اعظمؓ میں حضور ﷺ کا جلال، عثمان غنیؓ میں حضور ﷺ کا جمال، علی مرتضٰی میں حضور ﷺ کے خصال اور سارے صحابہؓ بے مثال نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر صحابہؓ کے خصائص وفضائل بیان فرمائے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کو رضائے الٰہی کا پروانہ ملا:

جن میں سب سے بڑی خصوصیت وفضیلت یہ بیان ہوئی کہ ربِ کریم نے انہیں اپنی رضا کا تمغہ و پروانہ عطا فرمادیا، ارشاد فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ و الْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْه﴾ (التوبة: ۱۰۰)

اور جو مہاجرینؓ وانصارؓ سابق بالایمان (ایمان لانے میں سب سے مقدم ہیں) اور بقیہ امت میں جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے متبع ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے۔ آیت مذکورہ میں اللہ رب العزت نے حضرات صحابہؓ کے دو درجات بیان فرمائے:

(۱) سابقین اولین۔

(۲) بعد کے مومنین متبعین۔ پھر دونوں ہی کے متعلق یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔ علماءِ مفسرین کے سابقین اولین کے متعلق مختلف اقوال ہیں: مثلاً ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ صحابہؓ ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں کی نماز پڑھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے وہ حضرات مراد ہیں جو

بیعت رضوان یعنی واقعۂ صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے۔ پھر ان کے بعد کے تمام صحابہؓ کو ”وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ“ میں شامل فرما کر سب ہی کے لیے اپنی رضا کا اعلان فرمایا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ تمام صحابہ کو رضا کا پروانہ اس ذاتِ پاک کی جانب سے ملا ہے جو خالق ہے، اور جو مخلوق کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے تمام احوال سے واقف ہے، انسان کے بھی ہر ہر سانس، کام، قدم، اور تمام موجودہ وآئندہ کے اچھے برے احوال سے واقف اور باخبر ہے، اس نے حضرات صحابہ کو ہر میدان میں آزمایا اور ان کے دلوں تک کا امتحان لیا، جن کا حال اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا:

﴿أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ أَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ (الحجرات : ۳)

یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، ان کو مغفرت بھی حاصل ہے اور زبردست اجر بھی۔

اس کے بعد ان کے حالات، معاملات، واقعات اور انجام حیات کو جانتے ہوئے بشارت دی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ”اَلصَّارِمُ الْمَسْلُوْلُ عَلٰی شَاتِمِ الرَّسُوْلِ ﷺ“ میں فرمایا کہ اللہ رب العزت اسی بندہ سے راضی ہو سکتے ہیں جس کے بارے میں اس کو معلوم ہے کہ وہ آخری عمر تک موجباتِ رضا کو پورا کرے گا، اور جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جاتے ہیں پھر کبھی اس سے ناراض نہیں ہوتے۔ (از: مقام صحابہ/ص:۵۲)

حضرت حکیم العصرؒ فرماتے ہیں:

خدا خود جن کو دے اپنی رضامندی کا پروانہ
گھڑا کرتے ہیں کچھ ناداں ان ہی پر اپنا افسانہ
خدا کی رائے بھی منحرف گر ہے، معاذ اللہ!
میں کہہ دوں کیوں نہ اے ظالم! خدا سے تجھ کو بیگانہ

قرآن وحدیث میں صحابہؓ کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہی مذکور ہے کہ ان سے اللہ جل شانہٗ ہمیشہ کے لیے راضی ہوگیا۔اس سے بڑی فضیلت کیا ہوسکتی ہے؟

﴿وَ رِضُوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبة : ۷۲)

اور اللہ کی خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے۔

صحابہؓ کے فضائل:

حضرات صحابہؓ کے اس کے علاوہ بھی فضائل ہیں، چناں چہ حدیث مذکور میں رحمت عالم ﷺ نے صحابہؓ کے فضائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”أَصْحَابِیْ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِیْ“ امت کے لیے صحابہ کا وجود ہی باعث برکت ہے،اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اہل خیر کا وجود شر کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جیسے ستاروں کے بارے میں فرمایا کہ ”اَلنُّجُوْمُ أَمَنَةٌ لِلسَّمَاءِ“ ستارے آسمان کے لیے امن کا ذریعہ ہیں،مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ آسمان کی زینت وحفاظت ستاروں سے ہے،تو زمین کی زینت وحفاظت میرے صحابہ اور جاںثاروں سے ہے، پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ستاروں سے صرف ظاہری روشنی ملتی ہے،لیکن نبی کے یاروں سے ایمانی روشنی ملتی ہے،اسی لیے فرمایا:”أَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ، فَبِأَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ“.(رواه رزين، مشكوٰة/ص:۵۵٤، الفصل الثالث/باب مناقب الصحابةؓ)

راہ ملتی ہے شب کو تاروں سے   رہبری ملتی ہے سب کو نبی کے یاروں سے

صاحبو! صحابۂ کرامؓ بدن کے فرشی تو روح کے عرشی ہیں،صحابہؓ ظاہر میں خلق کے ساتھ تو باطن میں خالق کے ساتھ ہیں۔”رضی اللہ عنهم ورضوا عنه“

حضور اکرم ﷺ کا وجود صحابہؓ کے لیے باعث سکون تھا،تو صحابہؓ کا وجود امت کے لیے باعث حفاظت ورحمت تھا،اسی لیے دورِ صحابہؓ کے بعد دورِ فتن شروع ہوگیا،اور دورِ صحابہؓ حضور ﷺ کی ابتداءِ بعثت سے شروع ہوکر پہلی صدی ہجری کے ختم تک رہا ہے،جیسا کہ شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ نے علامہ شوکانیؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ ”تمام اہل علم اس بات

پر متفق ہیں کہ تمام صحابہؓ میں سب سے اخیر میں حضرت ابوالطفیل عامل بن واثلہ الجہنیؓ کی وفات ہوئی، یعنی ۱۰۲ھ مکہ مکرمہ میں۔ (الفوائدالمجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ، از: تراشے/ص: ۲۳)

صحابہؓ جس زمانے میں تھے وہ زمانہ بھی مبارک، اور جس زمین پر رہے حتیٰ کہ مدفون ہوئے وہ زمین بھی مبارک ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ أَصْحَابِيْ يَمُوتُ بِأَرْضٍ، إِلَّا بُعِث قَائِدًا وَّنُوْرًا لَّهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

(ترمذی، مشکوٰۃ/ ص: ٥٥٤، الفصل الثانی)

یعنی میرا جو بھی صحابی جس زمین میں وفات پائے گا، قیامت کے دن اس زمین والوں کے لیے قائد، پیشوا اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔

آخر کوئی تو بات تھی کہ ربِ کریم نے حضرات صحابہؓ کے ایمان واعمال کو کسوٹی قرار دیا:

﴿فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (البقرة : ١٣٧)

اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی ایمان اسی طرح لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ بھی راہ راست پر آجائیں۔

ان کے اخلاص کامل کی وجہ سے ان کے معمولی عمل کو ہمارے اُحد پہاڑ کے برابر کیے جانے والے عمل سے افضل قرار دیا، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا، مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ، وَلَا نَصِيْفَهٗ“. (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ٥٥٣/الفصل الأول)

میرے صحابہؓ کو برا نہ کہو، تم میں سے کوئی شخص اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے راستہ میں خرچ کرے، تو بھی اس کا ثواب صحابہؓ کے ایک مد بلکہ آدھے مد کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ (”مُد“ اس زمانہ کا ایک پیمانہ تھا، جس میں سیر بھر کے قریب جو وغیرہ آتے تھے)۔

مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ کا چھوٹے سے چھوٹا نیک عمل بھی ہمارے بڑے بڑے اعمالِ صالحہ پر بھاری ہے، کیوں کہ جو خلوص ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیوست تھا، جو اجر وثواب کے استحقاق میں سب سے زیادہ موثر ہے، اس درجہ کا خلوص بعد والوں میں نہیں پایا جاسکتا، انہوں نے فوز وفلاح کے جو چراغ روشن کیے ہم اس کی روشنی میں بغیر کسی دقت کے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

صحابہؓ کے خصائص:

بہر کیف! صحابہؓ کے بڑے فضائل وخصائص ہیں، فضائل سنے، اب خصائص سنیں!

مجموعی طور پر تمام صحابہؓ میں تین خصوصیات پائی جاتی تھیں، جن کا اظہار فقیہ الامت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے تابعین اور رفقاءِ مخلصین کے سامنے کیا، اور امت کو ان خصائص کا اتباع کرنے کی ترغیب دی، فرمایا:

”أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ، كَانُوا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أَبَرَّهَا قُلُوبًا، وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا“. (رواه رزين، مشكوة/ص: ۳۲/باب الاعتصام بالكتاب والسنة/الفصل الثالث)

حضور پاک ﷺ کے صحابہؓ اس امت کا بہترین اور افضل ترین طبقہ ہے، جن میں بے شمار خصائص تھے، لیکن ان کا خلاصہ اور مجموعہ تین خصلتیں ہیں:

پہلی خصوصیت: ”أَبَرَّهَا قُلُوبًا“...... وہ نیک دل تھے، ظاہر ہے کہ جب قلب نیک ہوگا تو قالب بھی نیک ہی ہوگا: ”إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ“. (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ۲٤۱)

دل چوں کہ سلطان الاعضاء ہے، اس لیے اس کی نیکی کا اثر جسم کے دیگر تمام اعضاء پر پڑتا ہے، اس لیے تمام صحابہؓ نیک اور نہایت نیک دل تھے، اور کیوں نہ ہوتے؟ جب کہ ان کے دلوں کا تزکیہ خود رحمت عالم ﷺ نے فرمایا، آپ ﷺ ان کے مربی، مزکی اور مرشد تھے۔

صحابہ کے نیک دل ہونے کے اثرات زندگی میں تین طرح ظاہر ہوتے تھے:

(۱) اخلاص۔ (۲) اطاعت۔ (۳) بغض وعناد سے اجتناب۔ اس کی شہادت قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں دی:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹)

حتیٰ کہ دشمنوں اور نقصان پہنچانے والوں سے بھی ان کے دلوں میں بغض وعناد نہ تھا، چناں چہ مروی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے کچھ روپئے چوری ہو گئے، تو ان کے گھر والے چور کو برا بھلا کہنے لگے، آپؓ نے فرمایا: ”اے اللہ! اگر اس کام پر چور کو کسی حاجت نے مجبور کیا ہے تب تو اس کو ان دراہم میں برکت دے، اور اگر اس کام کا باعث گناہ پر زورآوری اور فخر ہے تو پھر اس کا کام نمٹادے، یہ کام اس کا آخری بنادے۔“ (جمال الخواطر: ۲/ ۴۸)

دوسری خصوصیت: ”وَ اَعْمَقَهَا عِلْمًا...... اُن کا علم گہرا تھا، جس کا اثر یہ تھا کہ وہ بدعات سے دور تھے، کیوں کہ بدعت کا سبب جہالت ہے یا شرارت، صحابہؓ میں نہ جہالت تھی، نہ شرارت، ہر صحابی نیک دل اور علم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا، اور کیوں نہ ہوتا؟ جب کہ ان کے معلم اور مدرس سرورِ کونین، سالارِ بدر وحنین، نبی الثقلین، امام القبلتین، وسیلتنا فی الدارین جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ علوم سے صحابہؓ کو وافر حصہ نصیب ہوا، اور ان ہی کے واسطے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ہمیں اور بقیہ امت کو ملا۔

تیسری خصوصیت: وَ اَقَلَّهَا تَكَلُّفًا...... ان میں تکلف بہت کم تھا؛ کیوں کہ تکلف میں تکلیف ہوتی ہے، ہر صحابی کی وہ شان تھی جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ﴿وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ (صٓ: ۸۶) اور میں بناوٹ کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ ان کی گفتگو، رہن سہن، معاشرت اور زندگی کا ہر گوشہ تکلّفات سے پاک تھا۔

بالیقین ان میں کا ہر فرد سادگی وبے تکلفی کی منھ بولتی تصویر تھا، ان کی زندگی پر نظر

ڈالیں تو ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ بلا وجہ اپنا علمی رعب تھا نہ ہمہ دانی کا دعویٰ، بلکہ اپنے سے زیادہ علم والوں کا احترام اور ان کی قابلیت کا اعتراف تھا، جو جانتے وہ بتا دیتے، اور جو معلوم نہ ہوتا اس کے بارے میں صاف کہہ دیتے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت میں سادگی کا یہ حال تھا کہ نہایت سادہ عربی لہجہ میں تلاوت کرتے، ذرّہ برابر بناوٹ نہ تھی۔ احوالِ باطنی میں سادگی کا یہ عالم تھا کہ نہ زور زور سے ذکر واذکار، نہ طرب ومستی اور وجد وحال، نہ قوالی وسماع کا کوئی خیال تھا۔ معاشی زندگی کو دیکھئے تو کھانے پینے اور پہننے کے لیے وقت پر جو چیز میسر آ گئی بشرطیکہ وہ حلال اور شرعی حدود میں ہوا سے کھا، پی اور پہن لیتے تھے، حتیٰ کہ لوگوں کا جھوٹا کھانے پینے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہننے میں بھی انہیں کوئی عار محسوس نہ ہوتی۔ کسی کے پیر میں جوتے چپل ہوتے، تو کسی کو وہ بھی میسر نہ ہوتے، لیکن اسے ننگے پیر چلنے میں شرم نہ آتی۔

مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سادگی، سچائی، معاملات کی صفائی تھی اور نہایت صاف ستھری زندگی تھی، جو ظاہری حالت تھی وہی حقیقت تھی، بناوٹ نہ تھی۔

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت — نہ پوشش سے مقصود زیب اور زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت — فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

صحابہؓ کے معاشرہ میں یہ امتیاز دشوار تھا کہ کون امیر ہے اور کون مامور ہے؟ کون حاکم ہے اور کون محکوم ہے؟ سب کے سب آپس میں بے تکلف دوستوں کی طرح رہتے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اور تو اور خود حضور ﷺ بھی صحابہؓ سے بے تکلف ملتے جلتے تھے، اور صحابہؓ اور حضور ﷺ میں تصنع وتکلف کا نام نہ تھا، چناں چہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لیے گئے تو ہر طرف سے لوگ زیارت کے لیے حاضر ہوئے، ایک نوجوان انصاری صحابی حضرت طلحہ بن البراءؓ بھی حاضر خدمت ہوئے اور بے تکلف آپ سے لپٹ

گئے، دست مبارک کو بوسے دیے، پھر فرطِ محبت میں کہا: ''حضور! آپ مجھے جس کام کا حکم دیں میں بجا آوری کے لیے تیار ہوں'' آپ ﷺ نے بطور امتحان فرمایا: (تمہارا باپ دشمن دین ہے) ''جاؤ اپنے والد کو قتل کر آؤ!'' حضرت طلحہ فوراً ہی تعمیل ارشاد میں تیار ہو گئے، تب آپ ﷺ فرمایا: ''نہیں بابا! یہ تو محض آزمائش تھی، ورنہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔'' کچھ دنوں کے بعد یہ محبّ صادق، عاشقِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جوانی کے عالم میں سخت بیمار ہو گئے، زندگی سے مایوسی ہو گئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لیے بے تکلف تشریف لے گئے، اور باچشم نم آپ واپس لوٹے، اور صحابہؓ سے فرمایا: ''طلحہ پر علامت موت ظاہر ہے، لہٰذا جب ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا'' کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نمازِ جنازہ پڑھا کر دعاءِ مغفرت فرمائیں، مگر حضرت طلحہؓ نے آخری وقت وصیت کی کہ جب رات کو میرا انتقال ہو جائے تو تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ کرنا، خود ہی نمازِ جنازہ پڑھ کر جلد دفن کر دینا، کیوں کہ اس وقت وہ بنی عمرو بن عوف میں رہتے تھے، جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر مسجد قباء کے اطراف میں تھا، اور راستہ میں یہودی لوگ آباد تھے، اور ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینے کی کوشش کرتے، اس بنا پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضور ﷺ کو اطلاع نہ کرنا، ورنہ آپ ﷺ کے تشریف لانے میں رات کے وقت یہودیوں کی شرارت اور تکلیف پہنچانے کا قوی اندیشہ ہے، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میری نمازِ جنازہ کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو'' انتقال کے بعد لوگوں نے حسبِ وصیت نمازِ جنازہ پڑھا کر رات ہی دفن کر دیا، صبح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو اسی وقت صحابہؓ کے ہمراہ ان کے یہاں تشریف لائے، اور ان کی قبر پر جا کر یہ دعا مانگی:

''اَللّٰھُمَّ اِلْقَ طَلْحَةَ وَ أَنْتَ تَضْحَكُ إِلَيْهِ، وَهُوَ يَضْحَكُ إِلَيْكَ''.

''الٰہ العالمین! (پیارے) طلحہ سے اس حالت میں ملاقات کیجئے کہ آپ اسے دیکھ کر اور وہ آپ کو دیکھ کر ہنسیں'' (مراد اعلیٰ درجہ کی رضا ہے)۔ سبحان اللہ! (الاصابۃ/ ج:۳/

ص:۲۹۹،از: حیاۃ الصحابہ/ ج:۲/ص:۲۹۹)

”الصحابۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ“ کا مطلب:

معلوم ہوا کہ جیسے تمام صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتے تھے، خود حضور بھی ہر صحابی سے بے تکلف محبت فرماتے، آپ ﷺ کے بے تکلف طرزِ عمل سے ہر صحابی کو یہ محسوس ہوتا کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت فرماتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کا محبت بھرا اور بے تکلّفانہ معاملہ سب کے ساتھ برابر تھا، ہر ایک کو اپنے سے قریب کرتے، فرماتے:

”مَا أَنَا عَلَیْهِ وَ أَصْحَابِیْ“. (رواه الترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۳۰)

فرقۂ ناجیہ وہ ہے جو میرے اور میرے اصحابؓ کے طریقے پر ہو۔

مستند راستے وہی مانے گئے — جن سے ہو کر تیرے دیوانے گئے
لوٹ آئے جتنے فرزانے گئے — تا بہ منزل صرف دیوانے گئے

صاحبو! صحابہؓ کی روش تو ہمارے لیے اسوہ ہے ہی، ان کی لغزش میں بھی ہمارے لیے نمونہ ہے، جیسے حضرت ماعز بن مالک اسلمیؓ سے غلطی ہوگئی، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے نفس کو ملامت کی، اور شریعت مطہرہ کی مقررہ سزا جاری کرانے کے لیے تیار ہوگئے، کیا اس سے بڑھ کر بھی ہمارے لیے غلطی و گناہ سے توبہ و استغفار کرنے کا کوئی نمونہ ہوسکتا ہے؟

(تفصیل مسلم شریف/ کتاب الحدود/ باب من اعترف علی نفسہ بالزنا میں ہے، مشکوٰۃ/ص:۳۱۰)

اہل حق کا یہ مسلمہ اصول اور عقیدہ ہے کہ ”اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ“.

(یعنی مدتِ صحبت اور زمانۂ استفادہ میں فرق کے باوجود) تمام ہی صحابہؓ عدول ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہی نہیں ہوا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ معصوم نہیں، البتہ مغفور اور مقبول ضرور بالضرور ہیں، ویسے عدول کا مطلب بھی عموماً یہی بیان کیا گیا کہ جان بوجھ کر کبائر اور اصرار علی الصغائر نہ کرے، اور اگر کبھی کسی گناہ کا

صدور ہو بھی جائے فوراً توبہ کر لے۔

پھر جہاں تک صحابہؓ کے آپس میں ہونے والے بعض اختلافات کی بات ہے، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان وعقائد اور اکثر اعمال میں تمام ہی صحابہؓ متفق تھے، اختلاف صرف بعض اعمال میں ہی ہوا، اس میں ان میں سے جس صحابیؓ نے جو کچھ کیا وہ اپنے اجتہاد کے مطابق محض رضائے الٰہی کے خاطر کیا، اب اگر کسی کا اجتہاد خطا کر گیا تو نہ وہ لائق ملامت ہے اور نہ وہ اجتہادی غلطی حقیقی غلطی کے مانند ہے، اور نہ یہ بات ان کے عدول ہونے کے منافی ہے۔

اس سلسلہ میں شمس العلماء حضرت مولانا خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے کتنی بہترین بات بیان فرمائی کہ:

اگر اختلاف ان میں باہم دیگر تھا — بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے، لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا — خلاف آشتی سے خوش آئند تر تھا

صحابہؓ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو:

ان حقائق کے باوجود اگر کوئی دل کا اندھا حضرات صحابہؓ کو طعنہ دے اور ان کا افسانہ بنائے، ان پر سب وشتم اور لعنت وملامت کرے تو وہ ملعون خود ہی قابل لعنت ہے، کیوں کہ جس طرح فضا تک اول تو کوئی گندگی پہنچتی نہیں، لیکن کوئی عقل کا اندھا فضا میں تھوکے اور گندگی پہنچائے تو وہ گندگی لوٹ کر خود گندگی پہنچانے والے پر ہی پڑتی ہے، بالکل اسی طرح صحابہؓ جو روحانی فضا کے مانند ہیں (جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا) اگر کوئی شقی ان کو تنقید کا نشانہ بنائے اور سب وشتم اور لعنت وملامت کی جسارت وجرأت کرے تو اس کی یہ ناپاک حرکت خود لوٹ کر اس کی طرف آئے گی، شانِ صحابہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا، حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ: "اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي أَصْحَابِيْ،

لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:٥٥٤)

لوگو! میرے صحابہ کے حق میں اللہ سے ڈرو، میرے بعد ان کو (تنقید کا) نشانہ مت بنانا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

عَنْ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَسُبُّوْنَ أَصْحَابِیْ، فَقُوْلُوْا: "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی شَرِّکُمْ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:٥٥٤)

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ پر لعنت ملامت اور سب وشتم کرتے ہیں تو ان کو کہو: "اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جو تم میں برا ہو۔"

اور ظاہر بات ہے کہ یقیناً برا لعنت کرنے والا ہے، نہ کہ صحابۂ کرامؓ، اس طرح یہ لعنت اس لعنت کرنے والے پر ہو جائے گی، ویسے بھی شریفوں پر سب وشتم کرنا شریروں کا ہی وطیرہ اور طریقہ ہے۔

جو بھلے ہیں وہ بھلوں کی نہیں کرتے تنقیص — جو برے ہیں وہی اچھوں کو برا کہتے ہیں

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھ کر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۳)

شانِ علم وعلماء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ مُوۡسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الۡهُدٰى وَ الۡعِلۡمِ كَمَثَلِ الۡغَيۡثِ الۡكَثِيۡرِ أَصَابَ أَرۡضًا، فَكَانَتۡ مِنۡهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الۡمَاءَ، فَأَنۡبَتَتِ الۡكَلَأَ وَالۡعُشۡبَ الۡكَثِيۡرَ، وَكَانَتۡ مِنۡهَا أَجَادِبُ أَمۡسَكَتِ الۡمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوۡا وَسَقَوۡا وَزَرَعُوۡا، وَأَصَابَ مِنۡهَا طَائِفَةً أُخۡرٰى إِنَّمَا هِيَ قِيۡعَانٌ لَا تُمۡسِكُ مَاءً وَلَا تُنۡبِتُ كَلَأً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنۡ فَقُهَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ بِمَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنۡ لَّمۡ يَرۡفَعۡ بِذٰلِكَ رَأۡسًا، وَلَمۡ يَقۡبَلۡ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيۡ أُرۡسِلۡتُ بِهٖ". (متفق عليه، از مشکوٰۃ/ص: ۲۸/باب الاعتصام بالکتاب والسنة/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "حق تعالیٰ نے جو (دولت) ہدایت اور علم دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر برسی ہو، چناں چہ اس زمین کا جو حصہ بہتر تھا اس نے تو بارش کا پانی لے لیا، پھر گھاس چارہ خوب اگایا، اور زمین کا جو حصہ سخت تھا اس نے بارش کے پانی کو روک لیا (جمع کرلیا) تو حق تعالیٰ نے اس کے ذریعہ (بھی) لوگوں کو نفع دیا کہ لوگوں نے وہ پانی پیا، پلایا اور کھیتی باڑی کی، اور (لیکن) یہ بارش کا پانی زمین کے ایک دوسرے حصہ پر بھی پہنچا جو بے کارِ محض (چٹیل میدان) تھا، اس حصہ نے نہ تو پانی روکا، نہ

گھاس اگائی، پس یہی مثال ہے کہ (میرے ذریعہ علم و ہدایت کی ایمانی و روحانی جو بارش ہوئی تو) جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دین کو سمجھا اسے اس (روحانی) بارش نے نفع دیا، اس لیے خود اس نے بھی وہ علم سیکھا اور لوگوں کو بھی سکھایا، اور اس شخص کی مثال (چٹیل میدان اور بنجر زمین کی سی ہے) جس نے علم و ہدایت کی طرف (دیکھنے کے لیے غرور اور تکبر کی وجہ سے) سر بھی نہ اٹھایا، اور جو علم و ہدایت دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا اسے قبول نہ کیا۔

علم اور معلومات میں فرق:

عظمتِ انسانی کا انحصار و دار و مدار دو چیزوں پر ہے:

(۱) علم نافع۔ (۲) عملِ صالح۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ دونوں ہی لازم ملزوم ہیں، کیونکہ علمِ نافع وہی ہے جو دل میں نور پیدا کر دے، جس کے بعد عملِ صالح آسان ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف جس علم سے دل میں نور پیدا نہ ہو، زبان تک محدود ہو، وہ علم غیر نافع ہے، حدیث میں فرمایا گیا:

عَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ قَالَ: "اَلْعِلْمُ عِلْمَان، عِلْمٌ فِيْ الْقَلْبِ، فَذٰلِكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ، فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ".

(رواہ الدارمی، مشکوٰۃ/ص:۳۷، الفصل الثالث)

علم کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ علم جو دل میں ہوتا ہے۔ (۲) وہ علم جو زبان پر ہوتا ہے، یہ علم ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور دلیل ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب علم نافع کا نور دل میں آتا ہے تو قلب روشن اور قالب مطیع ہو جاتا ہے، ظاہر و باطن دونوں پاک صاف ہو جاتے ہیں، ایسا عالم نیک دل و نیک عمل بن جاتا ہے، شریعتِ مطہرہ میں یہی علم مطلوب ہے، اس کے برخلاف جو علم انسان کو صالح بنانے کے بجائے طالح بنائے، نیک بنانے کے بجائے نافرمان بنائے، نیک دل بنانے کے بجائے خبیث دل بنائے وہ علم نہیں، وہ معلومات ہو سکتی ہیں، حدیث پاک میں

ایسے علم سے پناہ مانگی گئی:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ". (مشکوٰۃ/ص:٢١٦)

آج انسان اور انسانی سماج کو معلومات کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ وہ تو بہت ہیں، ضرورت اور کمی ہے تو علم کی، اسی سے انسان اور انسانی سماج صالح بنے گا۔

علم ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے:

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ زور اسی پر دیا، بلکہ ایک مقام پر قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَاعْلَمْ أَنَّهٗ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ (محمد : ١٩)

محبوبم! جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور (آپ معصوم ہونے کے باوجود امت کی تعلیم کے لیے اپنی ایسی باتوں پر بھی جو گناہ نہیں) بخشش کی دعا مانگتے رہیے۔

بظاہر یہاں علم کو مقدم فرمایا، پھر توحید اور استغفار کو بیان کیا، اس لیے کہ علم کے بغیر توحید بھی سمجھ میں نہیں آسکتی، یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کے موقع پر ہی توحید سے پہلے قراءت (پڑھنے) کا حکم دیا گیا، اور اس طرح تعلیم کی تلقین کی گئی، جیسا کہ فقیہ العصر حضرت علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

"اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے اوّل دن سے علم پر زور دیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز ہوئے، اس میں کیا کچھ برائیاں اور کوتاہیاں نہیں تھیں؟ شرک عام تھا، سینکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، طاقت کی حکمرانی تھی، نہ جان محفوظ تھی، نہ مال، اور نہ عزت و آبرو سلامت تھی، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات ایسی نہ تھی جو سماج میں نہ پائی جاتی ہو، بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام توحید باری کی دعوت اور شرک و بت پرستی کی تردید

کا آنا چاہیے تھا، کہ اسلام کی ساری تعلیمات کا لبِ لباب اور خلاصہ یہی ہے، یا پھر پہلی وحی ظلم وجور کی مذمت اور عدل وانصاف کی اہمیت کی بابت ہونی چاہیے تھی، کیوں کہ ایک انسان سب سے زیادہ ضرورت مند ایسے سماج کا ہوتا ہے جو پرامن ہو، ظلم وزیادتی سے محفوظ ہو اور بقاءِ باہمی کے اصول پر قائم ہو، لیکن غور فرمائیں کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو نازل ہوئی اس میں صراحۃً ان باتوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، بلکہ فرمایا:

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ﴾ (العلق : ١)

اپنے رب کے نام سے پڑھئے جو تمام کائنات کا خالق ومالک ہے۔ یعنی سب سے پہلے ربِ اکبر نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو جس بات کی تلقین فرمائی وہ ہے تعلیم، کیوں کہ علم ایسا سر چشمہ ہے جس سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہیں اور تمام مفاسد کا مداوا ہوتا ہے"۔ (شمعِ فروزاں/ص:۱۴۸/۱)

عربی کا مقولہ ہے کہ "اَلۡعِلۡمُ وَسِیۡلَۃٌ لِکُلِّ فَضِیۡلَۃٍ" جب علم ہوگا تو سب سے بڑی دولت ہدایت ملے گی، اور ضلالت دور ہوگی، شاید اسی لیے حدیث بالا میں علم وہدایت کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے کہ:

"مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنُ الۡهُدَی وَالۡعِلۡمِ".

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد علم و ہدایت کو عام کرنا تھا۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ﴾ (الجمعة : ٢)

وہی ہے جس نے امی لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کرے، اور ان کو پاکیزہ بنائے، اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، جب کہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

علم ترقی کا زینہ ہے:

خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ مکہ مکرمہ میں سخت حالات کے باوجود آپ ﷺ ہر وقت امت کے لیے تعلیم وتعلم کا اہتمام فرماتے، اس کے بعد مکہ مکرمہ کا جو لٹا پٹا قافلہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آیا، تو اس میں سیکڑوں بے گھر و بے در تھے، خود رحمت عالم ﷺ کا بھی ذاتی مکان نہ تھا، سیدنا ابوایوب انصاریؓ کو شرفِ میزبانی نصیب ہوا، اس وقت آپ ﷺ نے اولاً اپنے رفقاء وجاںنثاروں کے گھروں کی فکر کرنے کے بجائے سب سے پہلے مسلمانوں کے دینی مرکز کی حیثیت سے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی، اور اس میں پہلی باضابطہ درسگاہ ایک چبوترے کی شکل میں قائم فرمائی، جسے ''الصُّفَّةُ'' کہا جاتا ہے، جو عرب وعجم کے کونے کونے سے آنے والے لوگوں کی تعلیم وتربیت گاہ تھی، اس کے منتظم ومعلم خود رحمتِ عالم ﷺ تھے، پھر اسی کی نورانی، عرفانی وعلمی کرنیں ساری دنیا میں پہنچیں، اور پہنچتی رہیں گی۔

صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ ہم بھی گھربار اور دیگر اسبابِ آسائش سے بڑھ کر تعلیم کی طرف توجہ دیں، اولاد کی شادیوں میں پانی کی طرح لاکھوں روپیہ فضول خرچ کرنے کے بجائے اس پیسہ کو ان کی تعلیم وتربیت میں لگائیں، اسی میں قوم کی ترقی ہے، اس کے برخلاف جو قوم اپنا گھر پھونک کر علم کا چراغ جلانا نہ جانتی ہو، کامیابی وکامرانی اس کے حصہ میں نہیں آتی، صحابہؓ کی کامیابی وترقی کا تو یہی تو راز ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ الحدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اسی محمدی دارالعلوم کے ایک طالبِ علم اور اصحابِ صفہ میں سے ایک تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کو حصولِ علم کی بے پناہ خواہش تھی، آپ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں، خود فرماتے ہیں کہ ''میں رحمت عالم ﷺ کی صحبت میں تین سال رہا، اس طویل عرصہ میں مجھے فرمانِ نبی ﷺ کو یاد (علم حاصل) کرنے کے علاوہ کسی کام سے دلچسپی نہ تھی۔ (مسند

احمد:۱۵/۱۴۴)

ایک مرتبہ مالِ غنیمت تقسیم کرتے ہوئے حضور ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم بھی اس میں سے کچھ مانگو گے؟'' تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس کے بدلے آپ مجھے وہ چیز سکھا دیجیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائی''۔ (تذکرۃ الحفاظ/ص:۳۴/۱، از: حضرت ابو ہریرہؓ حیات و خدمات/ص:۲۰۰)

حالاں کہ اس وقت آپؓ کا گذر بسر نہایت تنگی کے ساتھ ہوتا تھا، لیکن ایمان کے بعد علم (نافع اور عمل صالح) کی برکت سے بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اور صحابہؓ کو جو عزت دی وہ محتاجِ بیان نہیں۔

علم سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں:

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ علم سے بڑھ کر کوئی عزت و دولت نہیں، اور جہل سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں، عربی کا شاعر کہتا ہے:

اَلْعِلْمُ عِزٌّ لَا ذُلَّ فِيْهِ   يَحْصُلُ بِذُلٍّ لَا عِزَّ فِيْهِ

حضرت عطا بن ابی رباحؒ حدیث اور فقہ کے بہت بڑے امام اور عالم گذرے ہیں، ابتداء میں آپؒ مکہ مکرمہ کی ایک خاتون کے غلام تھے، نیز سیاہ فام اور کانے تھے، ناک چپٹی، ہاتھ لُنجے اور پاؤں میں بھی لنگ، مطلب یہ کہ ہر ظاہری حیثیت سے بے حیثیت تھے، مگر حصولِ علم کے بعد کس بلند مقام پر فائز ہوئے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہِ وقت سلیمان بن عبد الملکؒ ایک مرتبہ اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ ان کے یہاں آئے، تو وہ نماز میں مشغول تھے، بادشاہِ وقت انتظار کرنے لگے، شدہ شدہ حضرت عطاؒ کے لیے ایک جم غفیر (بڑا مجمع) جمع ہو گیا، حضرتؒ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک حلقہ سا بن گیا، اور لوگ احکامِ حج وعمرہ کے متعلق سوالات کرنے لگے، حضرتؒ ہر سوال کا برابر جواب دیتے رہے، اس وقت حضرتؒ کی پشت بادشاہ اور شہزادوں کی طرف اور رخ لوگوں کی

جانب تھا، بادشاہِ وقت کی موجودگی کا نہ حضرت کو علم اور نہ لوگوں نے حضرتؒ کے ہوتے ہوئے اس کا خاص اہتمام کیا، ظاہر ہے کہ یہ بات آدابِ شاہی سے میل نہ کھاتی تھی، فوراً سلیمان نے شہزادوں سے کہا: ''کھڑے ہو جاؤ'' پھر کہا: ''علم حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرو! اللہ کی قسم! میں اس سیاہ فام کے سامنے اپنی ذلت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔''

(من اخلاق العلماء/ص:۱۳۱، از شمع فروزاں/ص: ۱/۱۴۵)

علم کی دولت ہے ایسی لا زوال ☆ جس کے آگے ہے گنجِ قارون پامال
علم سے انسان پاتا ہے تمیز ☆ علم سے ہے آدمی ہر دل عزیز
علم وہ دولت ہے جو کبھی لٹتی نہیں ☆ خرچ کرنے سے کبھی گھٹتی نہیں

حصولِ علم کے لیے تین چیزوں کی ضرورت:

غور کیجیے! حضرت عطاءؒ کو بادشاہ سے زیادہ عزت ملی، کس بنیاد پر؟ علم ہی کی وجہ سے تو یہ مقام ملا، اس لیے قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ﴾ (المجادلة: ۱۱)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا۔'' اس سے واضح ہوگیا کہ علم انسان کو رفیع المرتبت بناتا ہے، علم انسان کو ذلت سے نکال کر عزت کی چوٹیوں پر بٹھاتا ہے، علم انسان کو تاریکی سے روشنی اور ناکامی سے کامیابی کی طرف لاتا ہے، علم کی بڑی شان ہے، اس لیے جتنا علم حاصل کیا جائے کم ہے، حق تعالیٰ خود اس کی زیادتی طلب کرنے کا حکم نبی کو فرما رہے ہیں:

﴿قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا﴾ (طٰهٰ: ۱۱۴)

محبوبم! اپنی دعاؤں میں یہ بھی مانگئے کہ الٰہ العالمین! میرے علم میں زیادتی عطا فرما۔ معلوم ہوا کہ حصولِ علم کے لیے پہلا کام اس کی دعا ہے۔

علاوہ ازیں لفظ علم میں تین حروف ہیں، اور ہر ایک کی مراد الگ الگ ہے، اس لیے علومِ الٰہیہ و نافعہ کے حصول کے لیے تین چیزیں درکار ہیں: عین سے عنایتِ ربانی، لام سے

لطفِ استاذ اور میم سے محنت ۔ مطلب یہ ہے کہ حصولِ علم کے لیے ایسے کام کرنا ضروری ہے جن سے عنایت ربانی حاصل ہو، اساتذہ کا لطف نصیب ہو اور بلا ناغہ محنت بھی ہو، اور عنایت ربانی کے لیے طاعت باری ضروری ہے، لطفِ استاذ کے لیے ان کی خدمت ہے اور طلب علم کے لیے محنت ہے، تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، استاذ کی خدمت اور طلب علم کے لیے محنت، یہ تین چیزیں اگر میسر آجائیں تو آدمی علم نافع کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔

حصولِ علم کی پانچ منزلیں:

پھر علماء نے فرمایا کہ طلبِ علم اور حصولِ علم کی پانچ منزلیں ہیں:

(۱) ''السَّمْعُ''...... سننا، جب استاذ سبق پڑھائے، قرآن وحدیث کا درس دے تو اسے اچھی طرح سنیں۔

(۲) ''ثُمَّ الإِنْصَاتُ''...... مجالس دینی وعلمی کو خاموش رہ کر گوشِ ہوش سے سنیں۔

(۳) ''ثُمَّ الْحِفْظُ''...... پھر جو باتیں علماء سے سنیں انہیں محفوظ رکھیں۔

(۴) ''ثُمَّ الْعَمَلُ''...... اس کے بعد اس علم پر عمل کریں جو اس کے جاننے اور سننے کا حق ہے، یہ نہ ہو کہ علم کی چاشنی لیں، مگر عمل کی تلخی ترک کردیں، اس لیے کہ جیسے چراغ جلے بغیر روشنی نہیں دیتا، علم بھی عمل کے بغیر فائدہ نہیں دیتا۔

(۵) ''ثُمَّ النَّشْرُ''...... پھر اسے پھیلائیں، جو علم کا شکر ہے۔

اسی کے ساتھ اخلاص اور اللہ تعالیٰ کا استحضار بھی حصولِ علم کے لیے نہایت مفید ہے۔

صاحبو! شانِ علم یہ ہے کہ کوئی خوش نصیب گہوارے سے گور تک بھی اسے حاصل کرکے سارے عالم میں پھیلا دے تو گھٹتا نہیں، اور کوئی بد نصیب محروم حاصل کرکے نہ پھیلائے تو بچتا بھی نہیں، علم سب کی ضرورت ہے، اس لیے سب تک پہنچانا چاہیے، کہ جہل موت ہے، اور علم حیات ہے، جیسے حیاتِ ظاہری کے لیے پانی ضروری ہے اسی طرح حیاتِ روحانی وایمانی کے لیے علم ضروری ہے۔

حدیثِ پاک کی دلنشین تشریح:

شاید اسی لیے حدیث مذکور میں علم کو ماءِ کثیر سے تشبیہ دی: "کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ" حضورا کرم ﷺ گویا ابرِ رحمت ہیں، اور آپ ﷺ کا ظاہری و باطنی، نورانی وعرفانی فیض، آپ ﷺ کا کام و کلام اور علم وعمل بارانِ رحمت ہے، انسانوں کے دل مثل زمین کے ہیں، زمین کتنی ہی اعلیٰ اور تخم کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، مگر بارش اور پانی کی ضرورت بہر حال ہوتی ہے کہ بارش اور پانی سے زمین میں ہریالی اور تازگی آتی ہے، اسی طرح علم کے پانی سے دلوں کی زمین میں تازگی آتی ہے۔ پھر جیسے بارش کا پانی تو ہر قسم کی زمین پر برستا ہے، لیکن جو زمین بنجر ہوتی ہے وہ نہ تو اس پانی کو جذب کر کے ثمر اور شجر اگاتی ہے، نہ پانی کو جمع کر کے لوگوں اور کھیتوں کو پلاتی ہے، اس بنجر زمین کو بارش کے پانی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی بارانِ رحمت تو قیامت تک کی انسانیت کے لیے ہے، مگر جن کے دلوں کی زمین ویران اور بنجر ہے انہیں اس بارانِ علمی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، البتہ جو مومن ہیں ان کے قلوب قابلِ کاشت زمین کے مانند ہیں، جس کو حدیث میں "قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْکَلَأَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ" میں بیان فرمایا، کہ "جب علم نافع کی بارش ان کے دلوں کی زمین پر ہوتی ہے تو عملِ صالح کے مختلف پودے اس سے اُگتے ہیں"۔ پھر علماء اور فقہا کے قلوب اس زمین کے مانند ہیں جو پانی جذب اور جمع کرتی ہے تالاب وغیرہ کی شکل میں، اسے حدیثِ پاک میں "مِنْهَا أَجَادِبُ، أَمْسَکَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوْا، وَسَقَوْا، وَزَرَعُوْا" سے ذکر کیا، پھر تالاب کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً چھوٹے، بڑے، کم نفع والے، زیادہ نفع والے وغیرہ، اسی طرح علماء کی بھی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً مجتہدین، محدثین، مفسرین وغیرہ، حدیثِ مذکور کی تشبیہ علماء کی تمام قسموں کو شامل ہے، ہر عالمِ دین کی اپنی جگہ ضرورت ہے، ہر ایک کی ایک حیثیت اور بڑی شان ہے، لوگوں کے ایمان واعمال کی کھیتیوں کو ان ہی کا آبِ علم سیراب وشاداب کرے گا، اس لیے قیامت تک

لوگ دینی امور میں ان کے حاجت مند رہیں گے، بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ عام لوگوں کو جتنی ضرورت ڈاکٹروں، وکیلوں، انجینئروں وغیرہ کی ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ دین داروں کو علماء کی ضرورت ہے، ان کو روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں علماء کی ضرورت، شادی میں ان کی ضرورت، موت میں ان کی ضرورت، غرض ہر دینی معاملہ میں اور مسئلہ ان کی ضرورت ہے، اس لیے فرمایا:

﴿فَاسْئَلُوْآ أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)

انہیں سماج پر بوجھ نہ سمجھیں، بلکہ سماج کی نہایت اہم ضرورت جانیں، اگر آج ان کی ضرورت نہیں تو سماج کے اسی طبقہ کو جس کی صالح سماج میں خود کوئی ضرورت نہیں، یہ سماج کا وہ طبقہ ہے جن کے دلوں کی زمین بنجر ہے، جن کو حدیث میں "طَائِفَةٌ مِنْهَا أُخْرٰى إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ، لَاتُمْسِكُ مَاءً، وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً" فرمایا، لیکن یاد رکھو! ان مثالوں کے ذریعہ بیان کردہ حقائق کو سمجھنا بھی سب کے بس کی بات نہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ (العنکبوت: ٤٣)

''ہم ان مثالوں کو لوگوں کے فائدے کے لیے بیان کرتے ہیں، مگر انہیں صرف اہلِ علم ہی سمجھتے ہیں۔'' جن کے دلوں کی زمین علم سے ویران اور بنجر ہے وہ محروم القسمت ان امثال اور حقائق کو نہیں سمجھ سکتے، اور جیسے بنجر زمین کی کوئی خاص وقعت، عظمت اور فضیلت نہیں ہوتی اسی طرح جن کے دلوں کی زمین بنجر ہے، ان کی کوئی وقعت اور اہمیت اللہ تعالیٰ اور اہل اللہ کے یہاں نہیں ہوتی، انہیں علم کی بارش سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا:

بے عمل دل ہے اگر، تو جذبات سے کیا ہوتا ہے؟
بنجر زمین ہے اگر، تو برسات سے کیا ہوتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی عظمت کا انحصار ہی علم نافع اور عملِ صالح پر ہے۔
حق تعالیٰ ہمیں علم نافع و عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۲۷)

دین کی سمجھ اور اس کی علامت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَنۡ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيۡرًا يُفَقِّهۡهُ فِي الدِّيۡنِ، وَ إِنَّمَا أَنَاقَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعۡطِيۡ“. (متفق عليه، مشكوٰة/ص:۳۲/ كتاب العلم/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ جل شانہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے تفقہ فی الدین (دین کی سمجھ) عطا فرماتے ہیں، اور میں تو علم کو تقسیم کرنے والا ہی ہوں، اور اللہ تعالیٰ علم دینے والے ہیں۔“

دین کی سمجھ عظیم نعمت ہے:

اسلام آسمانی و فطری دین ہے، اور نجاتِ ابدی (دونوں جہاں میں ہمیشہ کی کامیابی) کا ضامن وداعی ہے، اسلام نے فطرت اور انسانیت کی ہر ضرورت کا لحاظ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام جہاں حقوق، شروط اور حدود بیان کرتا ہے وہیں حاجتوں کا بھی ذکر کرتا ہے، وہ جہاں مقصد زندگی کی طرف توجہ دلاتا ہے وہیں طریقِ زندگی کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اگر دینی احکامات کو واضح کرتا ہے تو دنیوی معاملات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، غرض

اسلام کی روشن تعلیمات اور جامع ہدایات زندگی کے تمام شعبوں کو لیے ہوئے ہیں، اس لیے اسلام کو عملی زندگی میں لانے سے یا اسلام کی عملی زندگی میں اپنے آپ کو داخل کرنے سے دنیا کے ساتھ عقبیٰ (آخرت) بھی سنور جاتی ہے، جس کی روشن دلیل حضراتِ صحابہؓ اور صلحاءؒ کی زندگیاں ہیں۔

جب یہ حق اور حقیقت ہے تو پھر کیا بات ہے کہ لوگ اسلام اور اس کے احکام کو کما حقہ اختیار نہیں کرتے؟ اور اس پر عمل نہیں کرتے؟ الا ماشاء اللہ۔ اس کا صاف، اور صحیح جواب یہ ہے کہ وہی لوگ اسلام اور اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے جنہوں نے اسے حق اور سچ سمجھا ہی نہیں، کیوں کہ دین اسلام پر عمل اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب دین اسلام کے حق اور سچ ہونے کی سمجھ نصیب ہو جائے، جنہیں دین کی سمجھ مل گئی ان کے لیے دین پر چلنا آسان ہو گیا، پھر جن کے لیے دین پر چلنا آسان، ان کے لیے کامیابی اور جنت کا راستہ آسان، پس ثابت ہوا کہ تفقہ فی الدین (دین اسلام کے حق اور سچ ہونے کی سمجھ) عظیم الشان نعمت ہے، بلکہ نبوت کے بعد تفقہ فی الدین ہی بہت بڑی نعمت ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "دین کی فہم سب سے زیادہ نافع اس لیے ہے کہ اس سے عقائد درست ہوتے ہیں، اعمال کی توفیق ہوتی ہے، اور عقائد و اعمال پر آخرت میں نجات و ثواب ہے، اور دنیا کی کوئی نعمت ثواب اور نجات کی برابری نہیں کرسکتی۔" (بیان القرآن)

دین کی سمجھ خیرِ کثیر کی علامت ہے:

لیکن یہ نعمت ہر کس و ناکس کو نہیں ملتی، بلکہ حق تعالیٰ جس کے ساتھ اپنا فضل خاص فرمانا چاہتے ہیں اسی کو یہ نعمت عطا فرماتے ہیں، ارشادِ باری ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾

(البقرة : ٢٦٩)

"وہ جسے چاہتا ہے حکمت و دانائی عطا کر دیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہوئی اسے وافر

مقدار میں بھلائی مل گئی۔‘‘

اللہ جل شانہ حاکم بھی ہیں، حکیم بھی ہیں، وہ جسے چاہتے ہیں حکمت سے نوازتے ہیں، پھر جسے حکمت مل گئی اسے خیرِ کثیر یعنی بہت زیادہ بھلائی مل گئی۔

لفظ حکمت قرآنِ کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنیٰ بیان کیے گئے ہیں، ایک معنیٰ ’’اَلتَّفَقُّهُ فِي الدِّيْنِ‘‘ بیان کیے گئے ہیں، اب مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے حکمت یعنی دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں، اسی کو حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا ہے: ’’مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ‘‘ جس خوش نصیب انسان کے ساتھ حق تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی فقاہت اور ایسا ملکہ عطا کر دیتے ہیں جس سے احکام پر عمل کرنا اور مسائل کا حل نکالنا آسان ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اس دنیا میں جسے مال و دولت ملے، حکومت و سلطنت ملے، ضروری نہیں کہ اللہ پاک اس کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتے ہوں، لیکن جسے تفقہ فی الدین مل جائے، دین کی سمجھ نصیب ہو جائے، اس کے بارے میں قسم کھا کر یعنی یقینی طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ خیر مطلق کا نہیں، بلکہ خیرِ کثیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس لیے کہ حدیث پاک کے تحت محدثین فرماتے ہیں ’’مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا‘‘ میں ’’مَنْ‘‘ سے اگر عموم مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتے ہیں اسے دین کی سمجھ دیتے ہیں، جب کہ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں دین کی سمجھ تو نہیں ملی، مگر حق تعالیٰ کا ارادۂ خیر پایا جاتا ہے، جیسے کوئی بچہ مکلّف ہونے سے پہلے ہی بچپن میں انتقال کر گیا، یا ایک غیر ایمان والا آخری وقت میں ایمان لے آیا تو حق تعالیٰ کا ان کے ساتھ ارادۂ خیر یقیناً پایا گیا، اس لیے محدثین فرماتے ہیں حدیث مذکور میں ’’خَيْرًا‘‘ کی تنوین سے تعمیم کے بجائے تعظیم مراد لیں گے۔ اب مطلب اس طرح ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کثیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کی سمجھ دیتے ہیں۔ اور جس شخص کو یہ دولت ملتی ہے اس کا سینہ دینی احکام و مسائل کی سمجھ بوجھ کے لیے پوری طرح کھل جاتا ہے، پھر نہ تو وہ

حالات سے مرعوب ہوتا ہے، نہ کوئی لالچ اور دھمکی اسے راہِ حق سے ہٹنے پر مجبور کرتی ہے، اس کے برخلاف جو شخص محض عبادت گزار ہے، عالم اور فقیہ نہیں، اس کے لیے حق پر ثابت قدم رہنا مشکل ہوتا ہے، وہ بہت جلد حالات یا فتوحات سے متاثر ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ بسا اوقات گمراہی تک جا پہنچتا ہے، اسی لیے فرمایا: "فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ". (رواه الترمذی، مشکوٰة/ ٣٤/ الفصل الثانی)

شیطان پر ایک فقیہ اور عالم ہزار عابدوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ امام محمدؒ فرماتے تھے:

تَفَقَّهُ، فَإِنَّ الْفِقْهَ أَفْضَلُ قَائِدٍ ☆ إِلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، وَأَعْدَلُ قَاصِدٍ
وَكُنْ مُسْتَفِيْدًا كُلَّ يَوْمٍ زِيَادَةً ☆ مِنَ الْفِقْهِ، وَاسْبَحْ فِيْ بُحُوْرِ الْفَوَائِدِ
فَإِنَّ فَقِيْهًا وَاحِداً مُتَوَرِّعًا ☆ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ

(۱) تفقہ حاصل کرو، کیوں کہ فقہ نیکی اور تقویٰ کی طرف لے جانے والا بہترین رہنما اور آسان راستہ ہے۔

(۲) اور ہر روز فقہ سے استفادہ میں زیادتی کر کے علمی فوائد کے سمندر میں غوطہ زنی کیا کرو۔

(۳) اس لیے کہ ہر صاحبِ ورع وتقویٰ فقیہ (عالم) شیطان پر ایک ہزار عابدوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔

اس سے بھی تفقہ فی الدین کی زبردست فضیلت ثابت ہوئی۔

دین کی سمجھ ملنے کی علامت:

اب سوال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جسے خیرِ کثیر کی یہ عظیم الشان نعمت یعنی دین کی سمجھ سے نوازا تو اس کی علامت کیا ہے؟ تو علماءِ محققین نے اس کی چار علامتیں بیان فرمائی ہیں، وہ جس میں پائی جائیں تو سمجھ لو کہ اسے دین کی سمجھ نصیب ہوگئی، گویا علماء اور فقہاء وہ ہیں جن

میں چار صفات وعلامات موجود ہوں، ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ شرحِ مشکوٰۃ میں نقل فرمایا:

"اَلزَّاهِدُ فِي الدُّنيا، الرَّاغِبُ فِي الآخِرَةِ، البَصِيرُ بِأَمْرِ دِينِهِ، المُدَاوِمُ عَلىٰ عِبَادَةِ رَبِّهِ". (مرقاۃالمفاتیح/ص:۲٦٧/١)

(۱) پہلی علامت: دنیا میں زہد وقناعت یعنی حلال اور جائز کوشش سے بقدرِ ضرورت جو کچھ مل جائے اس پر راضی رہے، مزید دنیا کی رغبت نہ رکھے، یا دنیا کو ضرورت کے درجہ میں رکھے، مقصد نہ بنائے، کہ دنیا ہاتھ میں تو ہو، دل میں نہ ہو، اور دنیا میں ایسے رہے جیسے کشتی پانی میں، خود دنیا میں رہے، لیکن دنیا کو اپنے دل میں ہرگز نہ رکھے، یہ حال تھا حضرات صحابہؓ اور صلحاءؒ کا، حتیٰ کہ ان میں بعض کا حال تو یہ تھا کہ دنیا اپنی ساری دولت وزینت سمیت ان کے قدموں میں آئی، مگر وہ اس کی طرف دل سے متوجہ نہ ہوئے، ان کی شان بڑی نرالی تھی، شاعر نے صحیح کہا:

قباؤں میں پیوند، پتھر شکم پر ☆ مگر قدموں کے نیچے تاجِ کسریٰ وقیصر

ایک حیرت انگیز واقعہ:

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت سعید بن عامرؓ کو حمص کا امیر (گورنر) بنایا، ایک عرصہ کے بعد اہلِ حمص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اپنے علاقے کے فقراء اور ضرورت مندوں کے نام لکھ کر دو، تاکہ ہم ان کی مدد کرسکیں" انہوں نے فقراءِ حمص کی فہرست پیش کی، تو ان میں ایک نام حضرت سعید بن عامرؓ کا بھی تھا، حضرت عمرؓ نے از راہِ تعجب دریافت کیا: "یہ سعید بن عامرؓ کون ہیں؟" کہا: "ہمارا امیر" پوچھا: "تمہارا امیر فقیر ہے؟" کہا: "جی ہاں، اللہ قسم! کئی کئی دن گذر جاتے ہیں، مگر ان کے گھر میں آگ تک نہیں جلتی" حضرت عمرؓ یہ سن کر رونے لگے، اور آنے والے وفد کے ساتھ ایک ہزار دینار ان کے لیے بھیجے، جب وہ دینار ان کو ملے، تو ایک دم "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن" پڑھنے لگے، بیوی نے کہا: "کیا بات ہے؟ امیر المومنین انتقال کر گئے؟"

کہا: ''معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، کہ دنیا میرے پاس آنے لگی، فتنہ میرے پاس آنے لگا، مجھ پر چھانے لگا'' بیوی نے کہا: ''اس کا حل موجود ہے، کہ راہِ الٰہی میں تقسیم کر دیجئے'' چناں چہ اسی وقت ساری رقم مستحقین میں تقسیم کر دی گئی۔

(اسد الغابۃ/ص:۳؍۲/۴۶۳، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۶۷)

اپنی کوئی ملک نہ املاک سمجھنا ☆ ہونا ہے تمہیں خاک سب خاک سمجھنا

اور:

یہ وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں زمانہ کی قیادت ہے
یہ وہ ہیں جن کے سر پر ضوفشاں تاجِ سعادت ہے
یہ وہ ہیں جن کی ٹھوکر پر نچھاور جاہ و ثروت ہے
یہ وہ ہیں جن کے قدموں پر تصدق باغِ جنت ہے
ان ہی کی اقتدا انسان کو انسان کرتی ہے
گدائے بے نوا کو دہر کا سلطان کرتی ہے

تفقہ فی الدین کے سبب واقعی یہ حضرات زاہد فی الدنیا تھے، آج ہم راغب فی الدنیا ہیں۔ حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسنؒ فرماتے تھے: ''ضروریاتِ زندگی میں کم از کم پر گذر کرنا زہد فی الدنیا ہے، اور ضروریات کو بالکل ترک کر دینا رہبانیت ہے (اسلام میں اس کی ممانعت ہے) اور اسی میں پورا مشغول ہو جانا حبِ دنیا ہے۔''

تو زہد فی الدنیا مطلوب ہے، ترکِ دنیا ممنوع ہے، اور حبِ دنیا مذموم ہے، اور دل میں جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت اہل اللہ کی صحبت وغیرہ کی برکت سے پیدا نہ ہو جائے وہاں تک دنیا کی محبت نکل نہیں سکتی، پھر جب زہد فی الدنیا کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد خود بخود ساری توجہات آخرت کی طرف مبذول ہو جاتی ہیں۔

(۲) دوسری علامت: دین کی سمجھ ملنے کے بعد جب دنیا کی دناءت و حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے، تو پھر ساری خواہشیں اور رغبتیں آخرت کے لیے ہو جاتی ہیں،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی رغبت آخرت کی طرف کرنے کے لیے کبھی فرماتے: ”اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ“ حقیقی عیش تو آخرت کا ہی ہے۔ کبھی فرماتے: ”اَللّٰھُمَّ لَاخَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃِ“ اے اللہ! حقیقی خیر و بھلائی تو آخرت کی خیر و بھلائی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ کو درخت لگاتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: ”ایسا درخت نہ بتاؤں جو لگانے کے قابل ہے!“ عرض کیا: ”ضرور!“ تب فرمایا: ”وہ جنت کا درخت ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ ”سبحان اللہ“ کہنا جنت میں درخت لگانا ہے، ”الحمد للہ“ کہنا جنت میں درخت لگانا ہے، ”لا الہ الا اللہ“ کہنا جنت میں درخت لگانا ہے، ”اللہ اکبر“ کہنا جنت میں درخت لگانا ہے“۔ (ابن ماجہ/کتاب الادب/باب فضل التسبیح/ص:۲۷۰)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ امت کی ساری رغبت آخرت کی طرف ہو جائے، تا کہ دنیا کے فتنہ سے بچ جائے، اور جسے دین کی سمجھ ملتی ہے اس کی دوسری علامت یہی ہے کہ اس کی رغبتیں آخرت کی طرف ہو جاتی ہیں، دنیا سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رہتی۔ چناں چہ حضرت ربیع بن خراشؒ ایک جلیل القدر تابعی ہیں، ان کے بارے میں منقول ہے کہ آپؒ نے ایک مرتبہ قسم کھالی کہ ”جب تک مجھے آخرت میں اپنا مقام معلوم نہ ہو جائے ہرگز نہ ہنسوں گا“ پھر واقعی ساری زندگی کبھی نہ ہنسے، اللہ جل شانہ کی شان دیکھئے! وفات کے بعد لوگوں نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ (تراشے/ص:۱۷)

زہد فی الدنیا اور رغبت فی الآخرۃ پیدا کرنے کے لیے مراقبۂ موت، موت کی یاد اور اس کا استحضار نہایت ہی نافع عمل ہے۔

(۳) تیسری علامت: حق تعالیٰ جسے دین کی سمجھ دیتے ہیں اسے دینی امور کی بصیرت و مہارت عطا فرماتے ہیں، سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ اسے دین کا علم عطا فرماتے ہیں، اور جسے دین کا علم مل گیا اسے بہت بڑی دولت مل گئی، لیکن یاد رکھو! دین کا علم قرآن و حدیث کا ترجمہ اور الفاظ رٹ لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث کو صحیح سمجھنا علم ہے، اب جسے جتنا زیادہ قرآن و حدیث کا علم ہوگا اسے اتنی زیادہ دینی امور کی بصیرت و

مہارت نصیب ہوگی، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے علماءِ دین وفقہاءِ مجتہدین کو علمِ کتاب و سنت کی برکت سے عجیب وغریب بصیرت عطا فرمائی تھی، وہ ایک ایک آیتِ قرآنیہ وحدیث ِنبوی سے کئی کئی مسائل سمجھ لیتے تھے، آج ہمارا یہ حال ہے کہ پورا قرآن شریف اور بخاری شریف پڑھ کر بھی مسائل سمجھ میں نہیں آتے، جب کہ ہمارے علماء وفقہاء کا کیا حال تھا؟ سنئے:

ایک عبرت ناک واقعہ:

امام شافعیؒ امام مالکؒ کے مایۂ ناز شاگرد ہیں، ایک مرتبہ جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو استاذِ محترم نے ان کی دعوت کر دی۔

بہت مدت میں لائے ہو تشریف خوش تو ہیں آپ کے مزاج شریف

امام مالکؒ نے گھر والوں سے کہا کہ آج بہت بڑے عالم اور فقیہ کی دعوت ہمارے یہاں ہے، لہٰذا خصوصی طور پر اہتمام کیا جائے، چنانچہ گھر میں کھانے کا بڑا اہتمام کیا گیا، ان کے آرام کے لیے بستر لگایا، نماز کے لیے وضو کے پانی کا لوٹا بھر کر رکھا، مصلیٰ بچھایا، جب امام شافعیؒ دعوت کے لیے تشریف لائے تو خوب کھایا، حتیٰ کہ جتنا تھا سب ختم کر دیا، پھر رات بھر لیٹے رہے، نہ وضو کیا، نہ نماز پڑھی، صبح میں گھر والوں نے امام مالکؒ سے کہا: ’’حضرت! آپ تو کہہ رہے تھے کہ آنے والے مہمان بڑے عالم، امام اور فقیہ ہیں، لیکن ہمیں تو ان کے طرزِ عمل سے ایسا نہیں لگا، بلکہ اشکال واقع ہوا، اوّل تو ہم نے جتنا کھانا بھیجا تھا وہ ایک سے زیادہ افراد کے لیے کافی تھا، آپ کے مہمان اور شاگرد نے تو اتنا کھایا کہ برتن بالکل صاف ہو کر واپس آئے، ہمیں تو دھونے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی، دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے ان کی آرام گاہ پر پانی کا برتن اور مصلیٰ بچھا کر رکھا تھا کہ علم والے اور اللہ والے تہجد گزار ہوتے ہیں، لہٰذا انہیں تہجد کے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے، لیکن جیسا مصلیٰ بچھایا تھا صبح کو ویسا ہی رکھا ملا، اور پانی بھی جوں کا توں تھا، لگتا ہے کہ تہجد کی نماز بھی نہیں پڑھی، اور پھر مسجد میں تو وضو کا انتظام بھی نہیں، لوگ گھروں سے وضو کر کے جاتے ہیں (اس زمانے کا عمومی حال اور رواج

یہی تھا) اور یہ آپ کے مہمان اور شاگرد اسی طرح آپ کے ساتھ اٹھ کر مسجد چلے گئے، پتہ نہیں انہوں نے نماز کیسے پڑھی؟ امام مالکؒ کی بیٹیاں اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگیں: ''ابو! مہمان کا معاملہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے'' امام مالکؒ نے اپنے شاگرد رشید حضرت امام شافعیؒ سے بچیوں کا اعتراض نقل کر کے فرمایا: ''محمد بن ادریس! کیا واقعی تمہارا حال ایسا ہی ہو گیا جیسے سمجھا گیا؟'' اس پر امام شافعیؒ نے بڑے ادب سے عرض کیا: ''حضرت! بات یہ ہے کہ جب آپ نے کھانا پیش کیا تو اس پاکیزہ اور بابرکت کھانے میں میں نے بہت ہی زیادہ نور کے اثرات محسوس کیے، تو سوچا کہ ممکن ہے اتنا حلال مال اور پرنور کھانا زندگی میں پھر میسر ہو نہ ہو، آج موقع ہے کہ سارا کھانا کھا کر اسے جزوِ بدن بنالوں! اس لیے میں نے سارا کھانا ختم کر دیا'' فرماتے ہیں کہ ''پھر میں لیٹ گیا، لیکن اس کھانے کا اتنا اثر ہوا کہ نیند غائب، کیوں کہ نورانی اور پاکیزہ کھانا تھا، اس کا اثر اس طرح ظاہر ہوا کہ میں لیٹے لیٹے احادیثِ نبویہ میں سے ایک حدیث شریف میں غور کرتا رہا، جس میں حضورِ پرنور ﷺ نے ایک چھوٹے بچے حضرت انسؓ کے بھائی کو جس کا پرندہ مر گیا تھا پیار سے فرمایا تھا کہ ''یَا أَبَا عُمَیْرُ! مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ! (متفق علیہ، مشکوٰۃ رص:۴۱۶، باب المزاح/الفصل الاول) حضرت! حدیث کے ان چند الفاظ میں آج کی رات غور کرتا رہا، تو الحمدللہ! فقہ کے چالیس مسائل اخذ کر لیے، کہ کنیت کیسی ہونی چاہیے؟ بچوں سے اندازِ تخاطب کیسا ہونا چاہیے؟ بچہ کے دل کی ملاطفت کے لیے کیسے بات کرنی چاہیے؟ وغیرہ وغیرہ۔'' پھر فرمایا: ''حضرت! چوں کہ حدیث پاک میں غور وفکر اور مسائل کا اخذ کرنے سے سونے کی نوبت ہی نہیں آئی، لہٰذا میرا وضو باقی تھا، اس لیے نئے وضو کی ضرورت نہ پڑی، الحمدللہ! میں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔'' (بکھرے موتی/ص:۲۱۹/۴ تا ۲۲۰/۴)

شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''حدیث کے اس ایک جملہ سے حضراتِ فقہاء نے ایک سو دس فقہی مسائل نکالے ہیں، اور ایک محدث نے اس ایک حدیث کی تشریح اور اس سے نکلنے والے احکام پر مستقل کتاب لکھی ہے۔ (اصلاحی خطبات ج:۱۱/ص:۱۵۸)

بہر حال! حق تعالیٰ جب کسی کو دین کی سمجھ دیتے ہیں تو اس کی ایک علامت یہ ہوتی ہے کہ اسے من جانب اللہ دینی امور میں بصیرت اور مہارت نصیب ہوتی ہے، اور وہ دین کے اہم احکام و مسائل چٹکیوں میں حل کر لیتا اور سمجھ لیتا ہے، اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

(۴) چوتھی علامت: اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت پر مداومت اور پابندی ہے، بلا شبہ عبادت واطاعت بڑی خوبی اور نیکی کی بات ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ اطاعت الٰہی کی پابندی اور عبادت پر استقامت نصیب ہو جائے، حق تعالیٰ کو وہی عبادت اور عمل پسند ہے جس پر مداومت اور پابندی کی جائے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ’’جسے دو چیزیں نصیب ہو جائیں وہ صاحبِ نسبت ہے: (۱) دوامِ اطاعت (۲) ذکر اللہ کی کثرت۔‘‘

پھر نسبت مع اللہ حاصل ہونے کے بعد عموماً غفلت دور ہو جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ گناہوں سے حفاظت ہے، اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین۔

صاحبو! اللہ جل شانہٗ کو ماننا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کی بات ماننا اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کی اطاعت پر استقامت اختیار کرنا ضروری ہے، یہی مقصد زندگی ہے، جس خوش قسمت نے اس حقیقت کو صحیح معنیٰ میں سمجھ لیا اس نے دین کو سمجھ لیا، جس نے دین سمجھ لیا اس کے لیے دین پر چلنا آسان ہو گیا، پھر جس کے لیے دین پر چلنا آسان، اس کے لیے نجات اور جنت کا راستہ آسان، اور یہ نعمت حق تعالیٰ ہر کس و ناکس کو نہیں دیتے، بلکہ مومن ہی کو ملتی ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ ’’دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہو سکتیں، ایک مومن ہی کو مل سکتی ہیں: ایک خوش اخلاقی، اور دوسرے دین کی سمجھ۔‘‘

”عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُنَافِقٍ: ”حُسْنُ صَمْتٍ، وَلَا فِقْهٌ فِی الدِّيْنِ“. (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۳٤/ کتاب العلم/الفصل الثانی)

حق تعالیٰ ہر قسم کی نعمتوں سے ہمیں مالا مال فرمائے، محروم نہ فرمائے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۲۵)

تقلید کی حقیقت اہمیت اور ضرورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ مُعَاذِ بۡنِ جَبَلٍ رضؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا بَعَثَہٗ إِلَی الۡیَمَنِ، قَالَ: "کَیۡفَ تَقۡضِیۡ إِذۡ عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟" قَالَ: أَقۡضِیۡ بِکِتَابِ اللّٰہِ" قَالَ: "فَإِنۡ لَّمۡ تَجِدۡ فِیۡ کِتَابِ اللّٰہِ؟" قَالَ: "فَبِسُنَّةِ رَسُوۡلِ اللّٰہِ" قَالَ: "فَإِنۡ لَّمۡ تَجِدۡ فِیۡ سُنَّةِ رَسُوۡلِ اللّٰہِ؟" قَالَ: "أَجۡتَهِدُ بِرَأۡیِیۡ وَلَا اٰلُوۡ" قَالَ: "فَضَرَبَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی صَدۡرِہٖ وَقَالَ: "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَفَّقَ رَسُوۡلَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ لِمَا یَرۡضٰی بِہٖ رَسُوۡلُ اللّٰہِ". (رواہ أبو داؤد والترمذی والدارمی، مشکوٰۃ/ص: ۳۲۴/ باب العمل فی القضاء والخوف منه، الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قاضی (وحاکم) بنا کر یمن کے لیے روانہ فرمایا تو آپ نے (بطورِ امتحان) ان سے استفسار کیا کہ "جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ اور قضیہ پیش ہوگا تو اس کا فیصلہ کس طرح کروگے؟" تو انہوں نے عرض کیا: "میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا" رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر قرآن مجید میں تمہیں (اس کے بارے میں کوئی صریح حکم اور

ہدایت) نہ ملے تو؟'' (کیا کرو گے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ''پھر میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا'' آپ نے فرمایا: ''اگر اللہ کے رسول کی سنت میں بھی تمہیں اس سلسلہ میں کوئی حکم نہ ملے تو؟'' عرض کیا: ''پھر میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لوں گا اور اجتہاد کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا'' (راوی کہتے ہیں کہ) یہ جواب سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر شاباشی دی اور فرمایا: ''حمد و شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادہ (قاصد) کو اُس بات کی توفیق دی جو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔''

احکامِ شریعت کی تقسیم اور ان کی تفصیلات:

بلاشبہ حق تعالیٰ کی عالی و پاک ذات واجب الاطاعت ہے، رہی بات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، تو وہ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ خداوندی کی عین مرضی الٰہی کے مطابق تشریح فرمائی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ جل شانہ ہی کی اطاعت ہے، فرمایا:

﴿مَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جو رسول اللہ کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' یہی وجہ ہے کہ خود رب العالمین نے قرآنِ کریم میں اپنی اطاعت کے ساتھ ہی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا:

﴿قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ﴾ (ال عمران: ۳۲)

محبوبم! کہہ دیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے، ورنہ دراصل مطاع بالذات حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کتاب وسنت کی اطاعت پر ہی موقوف ہے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام پر عمل کیے بغیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ممکن نہیں، پھر احکامِ شریعت (یعنی کتاب وسنت کے احکام) کی مجموعی طور پر دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ احکام جو بالکل ہی واضح ہیں، اور ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے بھی قطعی ویقینی ہیں، ان میں کسی قسم کا اجمال وابہام ہے، نہ کوئی تعارض وٹکراؤ، جیسے اسلامی عقائد، (توحید ورسالت، قیامت) اور اسلامی ارکان (نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج) کی فرضیت، ہر قسم کے گناہوں کا حرام ہونا، اسی طرح محرمات سے نکاح کا ناجائز ہونا وغیرہ، یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار احکامِ شرعی ایسے ہیں، جن میں نہ کسی اجتہاد کی ضرورت ہے، نہ ان میں علماء وفقہاء کا اختلاف ہے۔

(۲) البتہ بعض شرعی احکام ایسے بھی ہیں جن کا صریح اور صاف صاف حکم کتاب وسنت میں نہیں، مثلاً دورِ حاضر میں ٹی.وی، موبائل، کمپیوٹر، سگریٹ پینا وغیرہ، یا اس کے علاوہ بعض احکام ایسے ہیں کہ ان میں خود رب العالمین نے اپنی خاص حکمت کے تحت تھوڑا سا ابہام اور بظاہر تعارض چھوڑا ہے، جس کی وجہ سے ان کی ایک سے زائد تشریحات وترجیحات ممکن ہیں، جیسے طلاق شدہ عورت کی عدت کتنی ہے؟ قرآن میں حق تعالیٰ نے اسے "ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ" (البقرۃ: ۲۲۸) کے لفظ سے تعبیر فرمایا، جس کے معنیٰ حیض کے بھی آتے ہیں اور طہر کے بھی، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کون سا معنیٰ مراد ہے؟ اسی طرح حدیث پاک میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ" نماز کا تحریمہ تکبیر ہے، تو یہاں تکبیر سے کیا مراد ہے؟ "اللہ اکبر؟" یا مطلق اللہ کی بڑائی کا کوئی کلمہ؟

اس طرح ایک کا حکم دوسرے سے متعارض اور مختلف ہونے کی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کس کو ترجیح دی جائے؟ مثلاً بے نکاح عورتوں سے متعلق قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ

نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَأَنكِحُوا الأَيَامىٰ مِنكُم﴾ (النور : ۳۲)

''اورتم میں سے جن مردوں یا عورتوں کا اس وقت نکاح نہ ہوا، ان کا بھی نکاح کراؤ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں خود اپنا نکاح کرنے کی مجاز نہیں، ان کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ ذاتی طور پر اپنا نکاح کرلیں، جب کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿لاَتَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ﴾ (البقرة : ۲۳۲)

''ان عورتوں کو اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں۔''

یہاں نکاح کرنے کی نسبت خود عورتوں کی طرف کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں خود اپنا نکاح کرسکتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے احکام میں عمل کس حکم پر کیا جائے؟

اسی طرح حدیث پاک میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرف یہ ارشاد ہے:

"عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:"لَا صَلوٰةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ". (متفق عليه، مشكوٰة/ص:۷۸/ باب القراءة فى الصلوٰة/ الفصل الأول)

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام، مقتدی اور منفرد ہر ایک پر فرض ہے، لیکن دوسری حدیث میں ہے کہ:

" مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ، فَقِرَاءَةُ الإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ" . (رواه الطحاوى فى شرح معانى الآثار/ص: ۱۰۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتدی پر تو کسی قسم کی قراءت فرض ہی نہیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر شریعت (قرآن وسنت) کے احکام کی دو قسمیں ہیں، جن میں پہلی قسم کے احکام پر عمل بالکل واضح ہونے کی وجہ سے مشکل نہیں، لیکن دوسری قسم کے احکام پر

عمل کرنا واضح نہ ہونے کی وجہ سے ذرا دشوار ہے۔

احکامِ شریعت کے اجمال میں تشریح وترجیح کی آسان صورت:

چوں کہ ان کا صریح حکم موجود نہیں، یا ان احکام میں اجمال اور بظاہر تعارض ہونے کی وجہ سے تشریح وترجیح کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں کسی ایک تشریح وترجیح کو متعین کرنے کے لیے عقلاً اور نقلاً دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(۱) ہر شخص انفرادی طور پر شریعت کے ان فروعی احکام ومسائل میں اجتہاد کرے اور اپنی علمی استعداد صرف کرے، اپنی صلاحیت واستدلال کی قوت سے کام لے کر ان کا صحیح حل تلاش کرے، جیسا کہ اہل ظواہر (اور بظاہر غیر مقلدوں) کا خیال ہے، تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے قرآن وسنت کے وسیع وکثیر علم کی ضرورت ہے، جو سب کے بس کی بات نہیں، اسی وجہ سے رب العالمین نے قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿فَلَوُ لَا نَفَرَ مِنُ كُلِّ فِرُقَةٍ مِّنُهُمُ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوُا فِي الدِّيُنِ﴾ (التوبة: ۱۲۲)

''ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ (جہاد کے لیے) نکلا کرے، تاکہ (جو لوگ جہاد میں نہ گئے ہوں) وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے محنت کریں۔''

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وحدیث کا ایسا وسیع وعمیق علم حاصل کرنا ہر ایک کے لیے ممکن ہے نہ ضروری، اس لیے تمام لوگ اس میں مشغول نہ ہوجائیں، بلکہ کچھ لوگ جہاد وغیرہ کریں، اور کچھ لوگ علم شرعی والٰہی کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیں، اور پھر یہ اپنے علم واجتہاد کے نتائج وفوائد دوسروں تک پہنچائیں، تو وہ ان کا اتباع کریں، (یہی تقلید ہے) تاکہ ان کو فائدہ اور نفع ہوجائے۔

الحمدللہ! اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ملت کے علماء اور امت کے فقہاء نے اپنی

مبارک ومقدس زندگیاں کھپادیں، اوراس قسم کے احکام میں اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی صحیح مراد ومنشا معلوم کرنے کی بے مثال جدو جہد کی، اوراسی کا نام اجتہاد ہے، جس کا ثبوت احادیث طیبہ میں موجود ہے، چناں چہ حدیث مذکور میں جس کا ذکر شروع میں گذرا، حضرت معاذؓ نے حضور ﷺ کے سامنے اجتہاد کا ذکر کیا اور شاباشی حاصل کی، ظاہر ہے کہ رحمت عالم ﷺ کی تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں ان کو یہ اصول معلوم ہو چکا تھا کہ جب کوئی فیصلہ طلب معاملہ پیش آئے تو اس کے بارے میں ہدایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، اگر وہاں سے ہدایت نہ مل سکے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے طریق کار سے ہدایت حاصل کی جائے، وہاں بھی نہ ملے تو کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد اور قیاس کیا جائے، اسی لیے تو جب حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی ومفتی مقرر کیا تو بطورِ امتحان ان سے استفسار کیا کہ تمہارے سامنے جو معاملات اور مقدمات آئیں گے تم ان کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ اس پر انہوں نے وہ جواب دیا جو حدیث میں مذکور ہے، لیکن جیسا کہ کہا گیا یہ کام نہایت نازک اور مشکل ترین ہے، بہت ہی بھاری ذمہ داری والا کام ہے، عام لوگوں کے لیے تو اس میں گمراہی کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔

(۲) دوسری صورت جو کہ بہت ہی آسان ہے یہ کہ ہم میں سے ہر شخص خود اپنی عقل اور علم واجتہاد پر اعتماد کرنے کے بجائے یہ دیکھے کہ امت کے جلیل القدر علماء وفقہاء نے اس قسم کے احکام ومسائل میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا ہے؟ پھر ان میں جن کے علم واجتہاد پر ہمیں زیادہ اعتماد اور بھروسہ ہو ان کے قول وعمل اور علم واجتہاد پر اس حسن ظن کے ساتھ عمل کریں کہ انہوں نے صحیح طور پر سمجھ کر احکام شرع کی تشریح کی ہوگی، کیونکہ ہمارے یہ اسلاف اول تو ہمارے مقابلہ میں زمانۂ نبوت اور علم وہدایت سے کہیں زیادہ قریب تھے، جس کی بنا پر ان کے لیے نزولِ قرآن کے ماحول اور احکامِ شریعت کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہونا نہایت ہی آسان تھا۔ دوسری بات یہ کہ حق تعالیٰ نے ان کو جو بے مثال قوتِ حافظہ اور علم وعمل کے ساتھ تقویٰ وللّٰہیت کی عظیم دولت سے نوازا تھا، اس کا مقابلہ وموازنہ اگر ہم اپنی قوتِ

حافظہ اور علم وعمل اور خلوص وتقویٰ کے ساتھ کریں تو یقیناً خاک اور عالم پاک والی نسبت نظر آئے گی، اس لیے ہر وسیع النظر اور انصاف پسند شخص ان دونوں صورتوں میں سے لازماً دوسری صورت جو کہ آسان ہے اسی کو اختیار کرے گا کہ شریعت کے فروعی احکام میں اپنی عقل وعلم پر اعتماد کے بجائے علماءِ دین، فقہاءِ شرع متین اور ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے اجتہاد کو صحیح سمجھ کر احکام شریعت کی جو تشریح انہوں نے کی ہے اس کے مطابق عمل کرے، اسی کو اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔

یاد رکھو! تقلید کی ممانعت سے تکلیف مالا یطاق (ایسی دینی وشرعی مشقت جو نا قابلِ برداشت ہو) لازم آتی ہے۔ شیخ الحرم علامہ محمد مکی حجازی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''اجتہاد ہر آدمی کا کام نہیں ہے، اگر ہر آدمی اجتہاد کرنا شروع کردے تو پھر دین سلامت نہیں رہے گا، جیسے اگر ہر آدمی کے ہاتھ میں استرہ پکڑا دیا جائے تو کسی کا سر سلامت نہیں رہے گا۔''

شریعت کے فروعی احکام میں تقلید کا حکم اور اس کا ثبوت:

اس لیے جمہور علماء فرماتے ہیں کہ جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے ان پر تقلید واجب ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ کا بیان ہے:

''غَیْرُ الْمُجْتَهِدِ الْمُطْلَقِ یَلْزَمُهٗ عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ التَّقْلِیْدُ''. (تیسیر التحریر :ص ٤/٢٤٦، از قاموس الفقه/ص:٤٩٩/ ج:٢)

پھر تقلید کے وجوب کے لیے قرآنِ کریم کی مختلف آیتوں سے استدلال کیا گیا ہے، مثلاً ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ٥٩)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو، اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں ان کی بھی۔''

اس میں حق تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ ''أولـــو

الأمر" کی اطاعت کوبھی واجب قرار دیا ہے۔"أولو الأمر" سے کون مراد ہیں؟ بعض مفسرین نے فرمایا اس سے امراء اور حکامِ وقت مراد ہیں۔لیکن مفسرین کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اس سے مراد علماءِ مجتہدین ہیں۔ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اسی کو واضح قرار دیا ہے۔ (واللہ اعلم) اس تفسیر کے مطابق یہ آیت تقلید کے ثبوت اور وجوب کی واضح دلیل ہے، کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جب علماءِ مجتہدین کی اطاعت کا حکم ہے،تو گویا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ فروعی احکام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا طریقہ یہی ہے کہ علماءِ مجتہدین کی اطاعت کی جائے ،اور اسی کا نام تو تقلید ہے! اس پر اہل ظواہر (بظاہر غیر مقلدین) کی جانب سے یہ اشکال ہوا کہ اسی آیت میں آگے حکم ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾......الخ" اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں علماء کا اختلاف ہو، وہاں ایک کی تقلید کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹانا چاہیے،اور یہ تقلید کے منافی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ ......الخ" میں خطاب مجتہدین کو ہے،عوام کو نہیں،ان کے لیے تو پہلا حکم "اطاعت اولی الامر" ہی کافی ہے، البتہ مجتہدین کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اجمالی واختلافی مسائل میں یہ دیکھیں کہ کونسا حکم اوفق بالکتاب والسنۃ ہے، پھر اپنے اجتہاد کی روشنی میں اسے حل کریں۔

الحمدللہ! اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہو جاتی ہے جو حدیث مذکور میں موجود ہے کہ سن ہجری ۹ میں رحمت عالم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم اور مفتی وقاضی بنا کر بھیجا،تو روانگی سے قبل حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ سے حکومت اسلامی وفیصلۂ شرعی کے منشور ودستور پر گفتگو فرمائی، حضور ﷺ نے پوچھا:"اے معاذ! مسائل کا فیصلہ کس طرح کروگے؟" "كَيْفَ تَقْضِيْ إِذْ عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟" حضرت معاذؓ نے جواب میں عرض کیا: "کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا،" ارشاد ہوا: اگر کتاب اللہ یعنی قرآنِ کریم میں وہ مسئلہ نہ ملے تو؟ "فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟" اس پر حضرت معاذؓ نے کہا: پھر میں سنت رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا، پھر ارشاد فرمایا:" فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ؟" اگر

سنت رسول میں بھی اس مسئلہ کا حل نہ پایا تو؟ تب حضرت معاذؓ نے عرض کیا: پھر تو میں اجتہاد کروں گا اور جو حکم قرآن وسنت سے زیادہ موافق اور قریب ہوگا اپنے اجتہاد کی روشنی میں اسی کے مطابق فیصلہ کروں گا، اس موقع پر حضور ﷺ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لِمَا یَرْضٰی بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ"

(مشکوۃ/ص:۳۲٤)

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو اس (اجتہاد) کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔" اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ فروعی مسائل میں اجتہاد ممنوع نہیں، بلکہ مامور بہ ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ اور ان کی عین منشا کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین جو حضور ﷺ لے کر تشریف لائے وہ کامل اور قیامت تک کے لیے ہے، اس لیے اس میں نئے پیش آمدہ مسائل کے لیے اجتہاد کی گنجائش رکھی گئی، اب جو اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتے ان کے لیے لازم ہے کہ وہ مجتہدین کا اتباع اور تقلید کریں، یہ کوئی نئی چیز اور بدعت نہیں، بلکہ یہ ترتیب تو خیر القرون سے چلی آرہی ہے، اس کا ثبوت خیر القرون میں بھی ملتا ہے۔

خیر القرون میں شریعت کے فروعی مسائل حل کرنے کے طریقے:

چناں چہ زمانۂ خیر القرون میں شریعت کے فروعی احکام ومسائل حل کرنے کے تین طریقے تھے:

پہلا یہ کہ جو لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، یا ہو سکتے وہ تو براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے تمام مسائل کا حل دریافت کر لیتے، کیوں کہ آپ ﷺ کی شان یہ تھی کہ

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال!
مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور صحبت ہی ہر سوال کا جواب تھی۔اس لیے جو بھی آپ ﷺ سے ملاقات کرتا اور مجلس نبوی میں حاضر ہوتا اس کی ہر مشکل کا حل بے چوں و چرا ہو جاتا، یہ پہلا طریقہ تھا۔لیکن جو لوگ آپ ﷺ کے پاس موجود نہ ہوتے، جب انہیں کوئی سوال پیش آتا تو اس کے حل کی دو صورتیں تھیں: ایک یہ کہ وہ اگر مجتہد ہوتے تو کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے، جیسے بنو قریظہ کے موقع پر نمازِ عصر کے بارے میں حضراتِ صحابہؓ نے کیا۔جس کا واقعہ یہ تھا کہ جب ان میں راستہ میں نماز پڑھنے کے متعلق ذرا سا اختلاف ہو گیا تو ان صحابہؓ مجتہدین نے ارشادِ باری: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ کے مطابق حضور ﷺ کی خدمت میں وہ معاملہ پیش فرمایا اور آپ ﷺ نے فیصلہ سنایا۔اور جیسے حضرت معاذؓ یمن میں کیا کرتے تھے،لیکن جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوتی وہ اپنے اپنے علاقے میں مجتہد کی تقلید کرتے،جیسا کہ اہلِ یمن حضرت معاذؓ کی تقلید کیا کرتے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگ پہلے طریقہ سے تو محروم ہو گئے،اس لیے پیش آمدہ نئے مسائل کو حل کرنے کے دو طریقے باقی رہ گئے: (۱) اجتہاد۔(۲) تقلید۔اجتہاد کرنے والوں کو مجتہدین اور تقلید کرنے والوں کو مقلدین کہا جاتا ہے، خیر القرون میں یہی دو طریقے تھے۔رہی بات آج کے بظاہر غیر مقلدین کی، جو نہ اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ ائمہ اربعہ تقلید کرتے ہیں، ان کا وجود خیر القرون تو کجا اسلامی سلطنت میں بھی ان کا نام ونشان نہ تھا! یہ نومولود طبقہ انگریزی حکومت میں ایک خاص سوچی سمجھی منظّم سازش کے تحت وجود میں آیا، جس نے ائمۂ مجتہدین کو قرآن و حدیث کے خلاف عمل کرنے والا بتلایا، اوران کے اجتہاد کو قرآن وحدیث کے خلاف قرار دیا اور مقلدین کو مشرک تک کہہ دیا۔

انقلابِ چمن میں دہر کی دیکھی تکمیل — آج قارون بھی کہہ دیتا ہے حاتم کو بخیل
بوحنیفہؒ کو کہے طفلِ دبستاں جاہل — مہ تاباں کو دکھانے لگی مشعل قندیل
حسنِ یوسف میں بتانے لگا اَبرَص سو عیب — لگ گئے چیونٹی کو پیر، کہنے لگی: ہیچ ہے فیل
شرک توحید کو کہنے لگے اہلِ تثلیث — لوحِ محفوظ کو کہتی ہے مُحرَّف انجیل

بہر کیف ! خیر القرون میں جدید فقہی مسائل حل کرنے کے دو طریقے تھے: یا تو اجتہاد کے ذریعہ یا تقلید کے ذریعہ۔

تقلید کی دو صورتیں ہیں اور ان میں ''تقلیدِ شخصی'' ضروری ہے :

پھر اس تقلید کی بھی دو قسمیں اور دو صورتیں ہیں:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ تقلید کے لیے کسی ایک امام و مجتہد کو متعین نہ کرے، بلکہ مطلق تقلید کرے، یعنی کسی مسئلہ میں ایک امام اور مجتہد کی، تو دوسرے میں کسی اور کی، اسی طرح مختلف احکام و مسائل میں مختلف ائمہ و مجتہدین کی تقلید کرے، اسے تقلید مطلق کہتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لیے کسی ایک امام اور مجتہد کو مقرر کر لیا جائے، پھر تمام فروعی مسائل میں اس کی طرف رجوع کر کے اس کے اجتہاد پر عمل کرے، اسے تقلید شخصی کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''عہد صحابہؓ میں تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں کے نظائر بکثرت موجود ہیں، اور واقعہ یہی ہے کہ اصل کے اعتبار سے تو دونوں جائز ہیں، اور قرونِ اولیٰ میں جو سب سے بہترین زمانہ تھا دونوں طریقوں پر بلا نکیر عمل ہوتا رہا ہے، لیکن بعد میں جب کہ مرضیاتِ ربانی کے بجائے خواہشاتِ نفسانی پر عمل بکثرت ہونے لگا، تو علماء نے ایک عجیب انتظامی مصلحت سے تقلید مطلق کے بجائے تقلید شخصی کا التزام کیا، اس لیے کہ اگر اس بات کی کھلی اجازت دے دی جائے کہ جس مجتہد کا جو چاہو قول اختیار کر لو، تو دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا، کیوں کہ اکثر مجتہدین کے یہاں کچھ نہ کچھ منفرد اقوال ایسے ملتے ہیں جو (ہماری) خواہشاتِ نفسانی کے عین مطابق ہوتے ہیں، مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شطرنج کھیلنا جائز ہے، حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کی طرف موسیقی کا جواز منسوب ہے، حضرت قاسم بن محمدؒ کی طرف منسوب ہے کہ وہ بے سایہ تصویروں کو جائز کہتے تھے، مالکیہ (کہ ان کی طرف نکاحِ متعہ کا جواز منسوب ہے نیز ان

میں) سے امام سحنونؒ کی طرف اپنی زوجہ کے ساتھ وطی فی الدبر کا جواز منسوب ہے، امام اعمشؒ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک روزہ کی ابتداء طلوعِ شمس سے ہوتی ہے۔ ابن حزمؒ ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو تو اسے برہنہ دیکھنا بھی جائز ہے، نیز ان ہی کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو کسی مرد سے پردہ کرنا مشکل ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس بالغ مرد کو اپنی ثدی سے دودھ پلادے، اس طرح حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی، اور پردہ اٹھ جائے گا، اور حضرتِ عطاء بن ابی رباحؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر عید کا دن جمعہ کے روز آ جائے تو اس دن ظہر اور جمعہ دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔ غرض اسی طرح اگر کوئی شخص ایسے اقوال کو تلاش کر کے ان پر عمل شروع کر دے، تو اس سے ایک ایسا دین تیار ہو جائے گا کہ جس کا بانی سوائے شیطان اور نفس کے کوئی نہیں۔ (از درسِ ترمذی/ص:۱۱۹/۱)

آج اگر تقلید شخصی کو لازم اور ضروری نہ قرار دیا جائے، اور مختلف فقہی مذاہب سے خوشہ چینی کی عام اجازت دی جائے تو بقولِ فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی ''ہوا پرست لوگ اجتہاد کی نقاب اوڑھ کر ہر نا گفتنی اور نا کردنی کے لیے اسلام میں جگہ پیدا کر لیں گے، اس لیے فی زماننا ضروری ہے کہ عام لوگوں پر کسی ایک فقیہ کی تقلید کو ضروری قرار دیا جائے۔
(از قاموس الفقہ/ص:۲/۵۰۱)

اس وجہ سے علماءِ امت نے دین کو کھیل اور کھلونا بنانے سے، اور امت کو فتنہ سے بچانے کے لیے تقلید شخصی کو واجب قرار دیا۔

تقلید شخصی کا انحصار ائمہ اربعہ میں کیوں؟

اب اس کے لیے ضروری ہوا کہ کسی ایسے امام اور مجتہد کی تقلید کی جائے جس کا مذہب اصولاً و فروعاً ایسا مرتب و مدوّن اور محفوظ ہو کہ اس میں قریب قریب تمام فروعی مسائل کا حل ہو، اور سارے سوالات کے جوابات جزئی یا کلی طور پر موجود ہوں، تا کہ کسی دوسرے کے قول و عمل اور اجتہاد و استنباط کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے، اس سلسلہ میں یوں تو بہت سے

مجتہدین گذرے ہیں، لیکن سلف صالحین میں ہم جن فقہاء اور مجتہدین کا نام سنتے ہیں ان میں سے کسی کا مذہب مرتب و محفوظ شکل میں موجود ہے نہ مدَوَّن ہوا، حتیٰ کہ خود حضراتِ صحابہؓ میں سے بھی کسی کا مذہب مدون نہیں ہوا، بلکہ ان کے اجتہادات منتشر طور پر مختلف کتابوں میں ملتے ہیں، اور وہ بھی اتنے کم ہیں کہ ان کے ذریعہ زندگی کے سو، دوسو مسائل سے زیادہ پر روشنی نہیں پڑتی، سوائے ائمہ اربعہ کے، یعنی حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ النعمانؒ (۸۰،۱۵۰) حضرت امام شافعیؒ (۱۵۰،۲۰۴) حضرت امام مالکؒ (۹۳، ۱۷۹) اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴۔۲۴۱) حضراتِ فقہاء وائمۂ مجتہدین میں یہی چار امام ہیں، جن کی فقہ (کے (MALLS) مولس میں ہر چیز موجود ہے اور) بڑی حد تک مکمل طور پر مرتب و محفوظ ہے، اس لیے ائمۂ اربعہ کے علاوہ دوسروں کی فقہ پر عمل کرنے سے معذوری ہے، اور خود بخود یہ تقلید ائمہ اربعہ کی فقہ کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے، لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فقہاء وائمۂ مجتہدین میں سے ان ہی کی تقلید ضروری قرار دی جائے، اس بنا پر مدت سے اکثر جمہور علماءِ امت کا یہی تعامل اور توارث چلا آیا ہے کہ جس علاقے میں جس امام کا مذہب عملاً متواتر ہو گیا وہ سب لوگ اسی فقہ اور مذہب کے مطابق شریعت کے صرف فروعی احکام پر عمل کرتے ہیں جو محض ترجیحی ہیں، تبلیغی نہیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مقلد اپنے مذہب کے مطابق کوئی عمل کر رہا تھا، اس پر کسی بظاہر غیر مقلد نے اعتراض کیا اور کہا کہ ''یہ عمل اس طرح کرنا چاہیے'' تو اس مقلد نے بڑا عمدہ جواب دیا کہ ''جناب! آپ اپنی فکر کیجیے! میری فکر چھوڑ دیجیے، مجھے جس طرح سے عمل کرنا ہے اسی طرح عمل کروں گا، اس لیے کہ میری قسمت میں اگر کسی کے کہنے کے مطابق عمل کرنا لکھا ہے تو پھر آپ کے کہنے کے مطابق کیوں عمل کروں؟ امام ابوحنیفہؒ کے کہنے کے مطابق عمل کیوں نہ کروں؟ جنہوں نے قرآن وحدیث سے ایک لاکھ مسائل حل فرمائے۔''

مذاہبِ اربعہ کی حقیقت:

یہاں ایک بات یہ یاد رکھو کہ مذاہب اربعہ کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآنِ کریم کے الفاظ قراءت کے ائمہ سبعہ کے ذریعہ امت کو مکمل اور متواتر و یقینی طور پر ملے، اسی طرح قرآنِ کریم کا عمل اور احکام جسے اسوۂ حسنہ اور سنتِ نبوی بھی کہہ سکتے ہیں، یہ بھی امت کو فقہ کے ائمۂ اربعہ کے ذریعہ مکمل اور عملاً متواتر شکل میں ملے، اسے مذاہبِ اربعہ کہتے ہیں، یہ ایک سے چار نہیں بنے، بلکہ ہزاروں میں سے چار باقی رہے، اور چاروں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت۔

جس طرح امام کے پیچھے نماز پڑھنے والا امام کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ امام کی اقتدا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے، اسی طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسلک کو ماننے والا اپنے امام کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ امام کی اقتدا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فروعی مسائل میں اطاعت کرتا ہے۔

اس کے یہ چار راستے مذاہبِ اربعہ کی شکل میں ہیں، جن میں عقائد و نظریات کا تو کوئی اختلاف ہی نہیں، صرف عملی راستہ میں اجتہادی و فروعی مسائل میں اختلاف ہے، اور چاروں برحق ہیں، اسی لیے حکم یہ ہے کہ تقلید شخصی یعنی کسی بھی ایک ہی امام کا اتباع واجب ہے، اگرچہ سب ہی برحق ہیں، جس طرح حضراتِ انبیاء علیہم السلام تمام برحق ہیں، سب ہی پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن اتباع صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ضروری ہے، بالکل یہی حال ائمہ مجتہدین کا ہے، سب ہی برحق ہیں، اور سب ہی ماجور ہیں، لیکن انتظامی مصلحت کے تحت شریعت کے فروعی مسائل میں اتباع اور تقلید ایک کی لازم ہے، یہ تقلید ایک دینی ضرورت ہی نہیں، بلکہ موجودہ عہد ہویٰ و ہوس میں سفینۂ نوح کا درجہ رکھتی ہے، اور اسی پر اہل سنت والجماعت کا چلن ہے۔

اس سے امت کے لیے عمل بالشریعت میں دشواری ختم ہو کر آسانی پیدا ہوگئی، اس

کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بہت بڑا سمندر ہو، اگر اس سے پانی پینے اور استعمال کرنے کے لیے ایک ہی گھاٹ ہو تو لوگ میلوں میل سے سفر کر کے آئیں تب ہی انہیں پانی حاصل ہوگا، لیکن اگر اس کے کئی مشرب اور گھاٹ ہوں تو چاروں سمت سے لوگ آکر آسانی سے پانی پی لیں گے، اور ہر سمت میں وہی پانی، وہی مزہ، وہی ذائقہ ہوگا، صرف سمت الگ ہے، بالکل اسی طرح سمجھ لیں کہ اسلامی شریعت بھی ایک سمندر کے مانند ہے، اس کے بھی مختلف مشرب ہیں، ایک مشربِ حنفی، ایک مشربِ شافعی، ایک مشربِ مالکی اور ایک مشربِ حنبلی، یہ سمتیں صرف مختلف ہیں، پانی ایک ہی ہے، اور اسی میں ہمارے دین کی حفاظت ہے، اس سے باہر نکلنے میں ذہنی آوارگی اور دینی بیزاری کے سوا کچھ نہیں۔

صاحبو! آج جب کہ ملت اسلامیہ چاروں طرف سے فتنوں کا شکار ہے، ہمیں بہت سے بڑے بڑے اور اہم ترین مسائل درپیش ہیں، ایسے وقت میں ضرورت تو اس کی ہے کہ ہم سب مل جل کر بلکہ یکجان ہو کر ان کا صحیح حل تلاش کریں، اور فروعی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے ہم ایک دوسرے کا تحمل کرتے ہوئے اس اصول پر عمل کریں کہ اپنے صحیح مسلک کو نہ چھوڑیں اور دوسرے کے مسلک کو نہ چھیڑیں، اس کے علاوہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم کرنے کا بظاہر کوئی راستہ اور ذریعہ نظر نہیں آتا۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ، وَهُوَ يَهْدِىْ إِلىٰ سَبِيْلِ الرَّشَادِ، وَالْعَاصِمُ مِنَ الظُّلُمَاتِ وَالْفِتَنِ وَالْفَسَادِ.

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۶)

شریعت اسلامیہ اور پردہ کی پابندی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ مَسۡعُوۡدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "اَلۡمَرۡأَۃُ عَوۡرَۃٌ، فَإِذَا خَرَجَتۡ اِسۡتَشۡرَفَھَا الشَّیۡطَانُ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۲۶۹/باب النظر إلیٰ المخطوبۃ و بیان العورات/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "عورت پردہ میں رہنے کی چیز ہے، جب وہ (بے پردہ باہر) نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے"۔ (پھر شیطان عورت کو خوبصورت کر کے مردوں کو دکھاتا ہے)

عورت کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے:

شریعتِ مطہرہ کی نظر میں کسی بھی عورت کا سب سے قیمتی سامان اور جوہر اس کی عصمت، عزت وعفت ہے، حکم ہے کہ عورت اپنی حفاظت کے لیے ہر حال میں ہر ممکن کوشش کرے، اور ہر شریف، سمجھدار اور سنجیدہ عورت اس پر اپنی بساط کے مطابق عمل کرتی ہے، اس لیے کہ عورت کی عزت وعصمت اس کی ذات وجان سے زیادہ قیمتی ہے، پھر اس کی حفاظت پر

وعدۂ جنت بھی ہے، فرمایا:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا، وَ صَامَتْ شَهْرَهَا، وَ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا، وَ أَطَاعَتْ بَعْلَهَا، فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ". (رواه أبو نعيم فی الحلية، مشكوٰة/ باب عشرة النساء ومالكل واحد من الحقوق/الفصل الثانی/ص: ۲۸۱)

"جو عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عزت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے، وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔" پھر وہاں جنت کی حوریں بھی اس پر رشک کریں گی۔

پردہ کی پہلی اور اچھی صورت:

ایک عورت کا تحفظ اسی وقت ممکن اور آسان ہے جب شریعت کی ہدایت کے مطابق اجنبی مرد اور عورت ایک دوسرے سے الگ رہیں، جس کی سب سے پہلی اور اچھی صورت یہ ہے کہ عورت بلاضرورت اپنے گھر سے باہر نہ نکلے، پردہ میں رہے، کیوں کہ پردہ عورت کے لیے بمنزلۂ قلعہ کے ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مسلمان خواتین کو خصوصی طور پر اپنے گھروں میں رہنے کا حکم فرمایا:

﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ (الأحزاب: ۳۳)

آیتِ شریفہ میں جو "قرن" کا لفظ آیا ہے وہ یا تو قرار سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں کہ "تم عورتیں گھروں میں ٹکی رہو، قرار پکڑو" یا "وقر" سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں کہ "تم عورتیں اپنے گھروں میں سکون اور وقار و چین سے رہو" تمہارا پردہ اسی میں ہے، حدیث میں ہے: "لِلْمَرْأَةِ سِتْرَانِ، قِيْلَ: "وَمَا هُمَا؟" قَالَ: "اَلزَّوْجُ وَالْقَبْرُ". (المعجم الأوسط: ۵۲، از: مسلمان عورت ص: ۳) عورتوں کے لیے دو پردے ہیں: (۱) شوہر۔ (۲) قبر۔ یہی اس کے لیے مضبوط حصار ہیں، یا تو اس کے شوہر (کا گھر) یا اس کی قبر۔ بوڑھی عورتیں کہتی

ہیں کہ ”عورت کے لیے گھر بھلا یا گور“ شریعت اور قرآن کی ہدایت کے مطابق ایک عورت شمع محفل کے بجائے نورِ خانہ اور گھر کی ملکہ بن کر رہے گی تو یقیناً اسے سکون کی وہ دولت نصیب ہوگی جس کا تصور بھی مارکیٹوں میں بلاضرورت مصروفِ کار رہنے والی خواتین نہیں کرسکتیں، حدیثِ پاک میں ایسی عورتوں کے لیے بڑی فضیلت آئی ہے، فرمایا:

”أَقْرَبُ مَا تَكُوْنُ فِيْ وَجْهِ رَبِّهَا وَهِيَ فِيْ قَعْرِ بَيْتِهَا“. (الترغيب للمنذری /ج :۱/ ص:۱۳۶)

عورت اپنے رب (کی رحمت) کے قریب سب سے زیادہ اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور اور پردہ میں ہو۔

شریعتِ مطہرہ نے عورتوں کو اپنے گھروں میں رہنے کی اس قدر ترغیب دی کہ نماز وجہاد جیسی اہم عبادتوں اور جنازہ ودفن جیسی اہم ضرورتوں میں بھی ان کی شرکت پسند نہیں کی، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ عورت میں فطری اور قدرتی کشش ہوتی ہے، اس لیے جب تک وہ اپنے گھر میں رہتی ہے عموماً فتنوں سے محفوظ رہتی ہے، مگر جب وہ بلاضرورت اور بے پردہ باہر نکلتی ہے، تو شیطان کے لیے آلۂ کار بننے کی صلاحیت بھی اس میں ہونے کی وجہ سے وہ فتنہ کا سبب بنتی ہے۔

عورت کو پردہ کا حکم اس کے جوہر عفت کے تحفظ کے لیے ہے:

اس لیے حدیث مذکور میں ارشاد فرمادیا کہ ”اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ“ عورت گویا ستر ہے، لفظ ”عَوْرَةٌ“ عربی زبان میں اس چیز یا اس حصۂ جسم کو کہتے ہیں کہ جس کا چھپانا اور پردہ میں رکھنا ضروری ہو اور کھولنا معیوب سمجھا جائے، اس اعتبار سے عورت کو عورت کہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رکھنے کے قابل ہے، جس طرح ستر کو چھپا رہنا چاہیے، اسی طرح عورت کو بھی چھپا رہنا چاہیے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عورت پردہ میں رہنے کی چیز ہے، بلکہ سراپا پردہ ہے، اب اگر وہ بے پردہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کو

لوگوں میں برائی پھیلانے کا ذریعہ بنا دیتا ہے، پھر خود بھی فتنہ میں مبتلا ہوتی ہے، اور اس کی بے پردگی و بے حیائی سے معاشرہ بھی فساد کا شکار ہو جاتا ہے، کیونکہ عورت کا فتنہ مال ہے تو مرد کا فتنہ جمال ہے، مرد کے لیے حکم ہے کہ مال کو چھپائے، اور عورت جمال کو، تا کہ ہر ایک فتنہ سے محفوظ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب عورت نقاب میں ہوتی ہے تو مرد وقار میں ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو پھر خطرہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ عورت (بے پردہ بن سنور کر) جب نامحرم مرد کے سامنے آتی ہے تو شیطان کے روپ میں آتی ہے۔ (ابوداؤد/ص:۲۹۲)

جس طرح شیطان بندوں کو گمراہ کرتا ہے اسی طرح بے پردہ عورت اپنے حسن و جمال کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرتی ہے، گویا کہ گمراہ کرنے میں اس کا اثر شیطان سے کم نہیں، اس لیے عورت کا پردہ میں رہنا ضروری ہے۔

اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ عورت کو چاند کی طرح نہیں ہونا چاہیے، جسے ہر کوئی بے نقاب دیکھے، بلکہ عورت کو سورج کی طرح (شرم وحیا سے روشن) ہونا چاہیے، جسے دیکھنے سے پہلے ہی آنکھیں جھک جائیں۔

پردہ کا حکم کلام اللہ میں:

پھر پردے کے دو درجات ہیں: جن میں سے پہلا درجہ وہ ہے جس کا حکم آیت قرآنی ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ میں ذکر کیا گیا ہے، کہ عورت اپنے گھر میں رہے، بلا حاجت نکلنے کی اجازت نہیں، اسی میں اس کی عصمت وعفت کی حفاظت ہے۔ شریعت کا اصل مقصد بھی یہی ہے، لیکن اگر کبھی کسی ضرورت کے وقت گھر سے نکلنا ہو تو چند چیزوں کی رعایت کے ساتھ نکلے، تا کہ اس کی عصمت وعزت برقرار رہ سکے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ باپ یا شوہر وغیرہ کی اجازت سے نکلے، یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے عورت کی عزت محفوظ رہنے میں نیز اس کے پاک دامن رہنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس برخلاف جو عورتیں اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر جہاں چاہیں آتی جاتی

ہیں اور جسے چاہیں شوہر کی غیر موجودگی میں گھر بلا لیتی ہیں، عموماً ان کے اخلاق آہستہ آہستہ بگڑتے چلے جاتے ہیں، اور وہ گناہوں کے دل دل میں دھنستی چلی جاتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ''جو عورت شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلتی ہے، حق تعالیٰ اس سے ناراض رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ گھر واپس آجائے''۔(کنز العمال)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بعد بھی زیب وزینت اور خوشبو کے بغیر نکلے، ورنہ فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ واندیشہ ہے، پھر جو عورت خاص اسی مقصد کے لیے خوشبو استعمال کرے یا زیب وزینت اختیار کرے اس کے لیے تو بڑی سخت وعید ہے، فرمایا کہ ''جو عورت خوشبو لگا کر مردوں کے پاس سے گذرے، تاکہ وہ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں، تو وہ عورت زانیہ ہے، اور ہر وہ آنکھ (جو اس کو دیکھے) زنا کار ہے۔''

(رواہ النسائی/ باب ما یکرہ للنساء من الطیب/ص:۳۷۹، ابن خزیمہ)

(۳) تیسری بات جس کا حکم شریعت نے ایک عورت کو اس کے جوہر عفت کے تحفظ کے خاطر دیا وہ پردہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بعد خوشبو، زینت اور فیشن کے بغیر بوقت ضرورت جب گھر سے نکلے تو اس طرح کہ سر سے لے کر پیر تک سادہ برقعہ پہن لے، تاکہ دنیا کی اس نازک وقیمتی ہستی اور شرم وحیا کی پتلی کے جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، اس طرح وہ کسی فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچی رہے گی۔

یہ پردہ کا دوسرا درجہ ہے۔ اور چوں کہ چہرہ بدن کا ممتاز و پرکشش حصہ اور مرکز حسن ہے، اس لیے اس کا پردہ بھی ضروری ہے، البتہ بعض خاص صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

حضرات فقہاء نے جو چہرہ اور ہتھیلیوں کو مستثنیٰ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں یہ چیزیں کھلی رہیں تو نماز میں خلل نہ آئے گا۔ یہ مسئلہ فقہ کی کتابوں میں شرائط نماز کے تحت آیا، پردہ کے بیان میں نہیں، لہٰذا منہ کھول کر نماز ہوجانے کے جواز سے غیر محرم کے سامنے بے پردہ آنے کا ثبوت دینا بہت بڑی بددیانتی و ناواقفی ہے۔

اوراس دوسرے درجہ کا حکم آیت قرآنی میں موجود ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ (الأحزاب : ٥٩)

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! آپ اپنی ازواج وبنات (بیٹیوں) اور مسلمان خواتین سے فرمادیجیے کہ وہ (پردہ کی غرض سے) لٹکالیں اپنے اوپر چادریں، (تاوہ کسی کونظر نہ آئیں) آیت کریمہ میں لفظ "جِلْبَابٌ" کے متعلق بغداد کے مفتی علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ "حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق "جِلْبَابٌ" اس چادرکو کہتے ہیں جو عورت (اجنبی مردوں کی نظر سے بچنے کے لیے) اوپر سے نیچے تک اوڑھتی ہے"۔

(روح المعانی/ص:۸۸/۲۲، ازحجاب/ص:۳۱)

دورِحاضر میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے سادہ برقعہ اسی جلباب کی ترقی یافتہ شکل ہے، یہ آیت پردے کے سلسلہ میں نازل ہونے والی آیتوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس میں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو دورِنبوت میں حکم دیا کہ اے میرے پیارے اور مقدس نبی! آپ اپنی ازواجِ مطہرات وبناتِ طاہرات کوان کے شرفِ خاص کی وجہ سے خصوصاً اور امت مسلمہ کی خواتین کو عموماً اس بات کا حکم دیں کہ وہ جب گھر سے باہر نکلیں تو پردہ کریں۔

پردہ کا اہتمام زمانۂ نبوت میں:

بس، پھر کیا دیر تھی؟ حکم ملتے ہی امت مسلمہ کی ان پاک دامن خواتین اور پاک دل عورتوں نے پورے اہتمام کے ساتھ زمانۂ نبوت میں، جو صرف اسی وقت کا نہیں، بلکہ کائنات کا سعید ترین وبہترین دور تھا، پردہ پر عمل کرنا شروع کردیا۔ سیدہ امِ سلمہؓ کا بیان ہے کہ "اس آیت کریمہ کے اترنے کے بعد انصارؓ (ومہاجرینؓ) کی خواتین سیاہ چادروں میں ملبوس ہوکر باہر نکلتی تھیں۔ (مصنف عبدالرزاق/ص:۱۲۳/۲، ازندائے شاہی/ص:۲۸/ مارچ ۲۰۰۹ء)

صحابیات بڑی سختی و پابندی سے پردہ پر عمل کیا کرتی تھیں، خود نبی اکرم ﷺ کے اہل بیت میں بھی پردہ کا بے حد اہتمام تھا، حتیٰ کہ ایک مرتبہ سیدہ عفیفہ عائشہ صدیقہؓ کے پاس ان کے رضاعی چچا حضرت افلحؓ آئے، تو سیدہؓ نے ان سے پردہ کیا، اس موقع پر حضرت افلحؓ نے تعجب سے کہا: ''میں تو تمہارا رضاعی چچا ہوں، پھر مجھ سے پردہ کیوں؟'' تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے، مرد نے نہیں''۔ جب حضور اکرم ﷺ کو سارا قصہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے چچا سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دی۔ (ابوداؤد/ص:۲۸۱/۱)

آج تو چچا، خالہ اور ماموں کے لڑکوں اور لڑکیوں سے بھی پردہ نہیں کیا جاتا، حالانکہ شرعاً ان سے پردہ ضروری ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن مکتومؓ ایک بار خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اس وقت ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ و میمونہؓ وہاں موجود تھیں، حضور ﷺ نے اپنی دونوں بیویوں کو حضرت عبداللہ ابن مکتومؓ نابینا صحابی سے پردہ کرنے کا حکم فرمایا، تو حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''حضور! یہ تو نابینا ہیں، جو ہمیں دیکھ نہیں سکتے، پھر پردہ کا کیا مطلب؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم تو نابینا نہیں ہو؟ پردہ کرو۔'' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۲٦۹/ باب النظر إلی المخطوبة وبیان العورات، الفصل الثانی)

دیکھئے! باوجودیکہ اس مقام پر برائی کا تقریباً کوئی احتمال بھی نہ تھا، کیوں کہ ایک طرف ازواجِ مطہرات جو مسلمانوں کی مائیں ہیں، دوسری طرف نیک دل صحابیؓ اور وہ بھی نابینا، لیکن اس کے باوجود بھی احتیاط کے لیے یا امت کی تعلیم کے لیے آپ ﷺ نے اپنی بیبیوں کو پردہ کا حکم دیا۔

معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوت میں پردہ کا بے حد اہتمام تھا، اور اس معاملہ میں ان کے یہاں کوئی فرق یا کوتاہی نہیں تھی، اس زمانے کی خواتین ہر عام و خاص اجنبی سے پردہ کیا کرتی تھیں، اور تو اور خود حضور ﷺ بھی ان سے اور وہ حضور ﷺ سے پردہ کیا کرتی تھیں۔

چناں چہ ایک طویل حدیث کے ذیل میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”ایک عورت کے ہاتھ میں پرچہ تھا، جس کو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی تھی، تو اس نے پرچہ دینے کے لیے پردہ کے پیچھے سے آنحضرت ﷺ کی طرف ہاتھ بڑھایا، آپ ﷺ نے ہاتھ روک لیا، اور فرمایا: ”معلوم نہیں مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟“ اس نے کہا: ”یہ عورت کا ہاتھ ہے“ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اگر تو عورت ہوتی تو اپنے ناخون پر مہندی لگاتی“۔

(أبو داود، مشکوٰۃ / ص:۳۸۳/ باب الترجل/الفصل الثانی)

غور کیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نیک نہ کوئی ہے، نہ ہوسکتا ہے، اس کے باوجود بھی آپ ﷺ خود صحابیاتؓ سے پردہ فرماتے تھے، بیعت لیتے وقت بھی پردہ کے پیچھے سے ہاتھ میں ہاتھ دیے بغیر صحابیاتؓ کو بیعت فرماتے تھے، جیسا کہ سیدہ میمونہؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ (مؤطا امام مالکؒ/ص:۱۳۰/ باب ماجاء فی البیعۃ)

کیوں کہ غیر محرم کو جس طرح دیکھنا ناجائز ہے، اسی طرح مصافحہ کرنا یا ہاتھ میں ہاتھ لینا، دینا بھی ناجائز ہے۔

جب آپ ﷺ سے پردہ ہے تو پیر سے پردہ کیوں نہیں ہوگا؟ اس واقعہ سے ان عورتوں کو عبرت حاصل کرنا ضروری ہے جو دنیا دار پیر کے سامنے بلا تکلف آتی جاتی ہیں، کہنا چاہیے کہ خود ان کی اور ان کے شوہروں اور پیروں کی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

بقولِ اکبر الٰہ آبادیؒ:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے: ”آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟“ — کہنے لگیں کہ ”عقل پہ مردوں کی پڑ گیا“

پردہ ستار العیوب ہے:

الغرض! ان گذارشات سے واضح ہوگیا کہ پردہ کا حکم کوئی فرضی یا اختراعی حکم نہیں ہے، جسے یوں ہی گھڑ لیا گیا ہو، اور پھر اس کا رواج ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے ماحول

میں اسے خواہ مخواہ شرعی حیثیت دے دی گئی ہو، نہ تو یہ واقعہ ہے، نہ قانونِ شریعت کے شایانِ شان ہے۔

صاحبو! حیا اور حجاب عورتوں کے لیے لازم ملزوم ہیں، باحیا عورت باپردہ ہوتی ہے، بے پردہ وہی عورت ہوتی ہے جو بے حیا ہو، ایک زمانہ میں پردے کا رواج ہندو گھرانوں میں بھی شرافت کی علامت سمجھا جاتا تھا، اور مسلمانوں کے دیندار گھرانوں میں تو پردہ شدت سے ہی نہیں، بلکہ افراط کی حد تک رائج تھا۔ مگر افسوس! اب صورتِ حال بدل کر رہ گئی، شریف سمجھی جانے والی خواتین بھی بے تکلف اور بے پردہ گھومنے لگیں۔

ایک زمانہ تھا جس میں عورت اور دولت دونوں کی حفاظت کی جاتی تھی، اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ دولت گھر سے نکل کر بینک میں پہنچ گئی، اور عورت گھر سے نکل کر مارکیٹ میں آ گئی، جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں وجود میں آ گئیں۔ یاد رکھو! ازواجِ مطہراتؓ، بناتِ طاہراتؓ اور صحابیاتؓ کا برگزیدہ گروہ ہماری عورتوں اور ساری خواتین امت کے لیے بہترین اسوہ اور نمونہ ہے، ان ہی سے طرزِ زندگی اور پردہ کی پابندی سیکھنی چاہیے، اور جو عورت ان کی تقلید کرے گی اسے اللہ جل شانہٗ کا قرب اور رضا نصیب ہوگی، ان شاء اللہ، بلکہ جو عورت دنیا میں پردہ کا اہتمام کرے گی قیامت میں حق تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈالیں گے، ان شاء اللہ۔ میرے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد صدیق شاہ بھائی صاحب جامعی بڑودوی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''پردہ ستار العیوب ہے۔'' یہ دنیا میں عورت کے ظاہری عیبوں کو چھپاتا ہے، اور قیامت میں گناہوں کو چھپائے گا''۔

پھر جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پردہ عورت کے لیے تقاضائے فطرت اور سامانِ حفاظت ہے، اس لیے عقلاً و نقلاً ہر دو اعتبار سے خوشی و غمی ہر حال میں اس کا اہتمام لازم اور ضروری ہے، جب دودھ اور دولت کو حفاظت کی غرض سے چھپانا ضروری ہے تو عورت کو حفاظت کی غرض سے چھپانا اور پردہ کرانا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ کیا عورت کی قدر دودھ

اور دولت کے برابر بھی نہیں؟ تجربہ کرکے دیکھ لیجیے، یہ مشاہدہ ہے کہ جس سماج میں مکمل پردہ کا رواج ہے وہاں عورت کے ایمان کے ساتھ عزت بھی عموماً محفوظ رہتی ہے، (اور اصل پردہ بھی وہی ہے جس میں عفت کی حفاظت ہو) اس کے برخلاف جہاں پردہ کا رواج نہیں وہاں زبانی دعویٰ کچھ بھی ہو، لیکن نہ ان کا ایمان محفوظ ہے نہ عزت، نہ صحت، نہ سماج۔ شاعر کہتا ہے:

الٹ دی جب نقابِ رخ، تو پھر کیا پاک دامنی!
کہ چہرہ کھولنا در پردہ ہے تمہید عریانی
یہ قید پردہ ہے عین اقتضائے طرزِ انسانی
جس آزادی کے تم خواہاں ہو وہ ہے خوئے حیوانی

پردہ کے بارے میں غیر مسلم خواتین کا اعتراف:

صاحبو! یاد رکھو! اسلام عورت کو اس کی فطرت کے مطابق آزادی کی اجازت تو دیتا ہے، مگر آوارگی کی اجازت نہیں دیتا، آج اگر کسی کے پاس عقلِ سلیم ہے، اور وہ تہذیب حاضر کے جھوٹے دعوے داروں کی غلامی کا شکار نہیں ہے، تو اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ دنیا کے موجودہ حالات پردہ میں تخفیف کے نہیں؛ بلکہ زیادہ اہتمام و تاکید کے متقاضی ہیں، فتنوں اور فحاشیوں کے اس دور میں پردہ کی اہمیت خواتین کی حفاظت کے پیش نظر اور بڑھ گئی ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف صرف اپنوں ہی نے نہیں، بلکہ عورت کو جنس بازار بنانے والے غیروں اور ان کی عورتوں نے بھی کیا ہے۔

چناں چہ ابھی ماضی قریب میں ایک واقعہ پیش آیا کہ فرانس میں ایک افغان طالبہ نے اسکارف (جو مکمل حجاب اور پردہ تو نہیں ہے، البتہ اس کا ایک حصہ ہے) پہن کر کالج میں آنے کی جرأت کی، تو اسے اس طرح آنے سے منع کیا گیا، مگر طالبہ نے صاف انکار کر دیا، جس کی سزا یہ ملی کہ کالج سے اس کا اخراج کر دیا گیا، طالبہ کے سرپرستوں نے کورٹ میں مقدمہ دائر کیا، تو الحمد للہ! فیصلہ بالآخر لڑکی کے حق میں آیا، معاملہ اخبارات میں آیا، پھر اسلامی

پردہ جب زیر بحث آیا تو اس کا تعارف ہوا، نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ سال سے کم عرصہ میں آدھے فرانس کی خواتین نے بلا تخصیص مذہب وملت حجاب پہننا شروع کر دیا، انہوں نے محسوس کیا کہ پردہ کی وجہ سے ان کے حسن اور صحت کو وہ عصمت حاصل ہوئی ہے جو ہزار ہا تصنع و بناوٹی طریقوں سے بھی ممکن نہیں، اس کے بعد جو اسکارف مسلم خواتین کی پہچان تھی اب وہ پورے فرانس کی باکردار خواتین کی پہچان بن گیا، جب فرانس کی ان غیر مسلم خواتین سے پوچھا گیا کہ تم کیوں اسکارف پہنتی اور اس پر اصرار کرتی ہو؟ جب کہ یہ نہ تو تمہارے کلچر کا حصہ ہے، نہ اس ترقی یافتہ ملک کے سماج سے میل کھاتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم اسکارف (اور پردہ) میں اپنے آپ کو زیادہ باوقار اور محفوظ محسوس کرتی ہیں''۔

(مستفاد از ندائے شاہی/ص:۳۶/فروری/۲۰۰۶ء)

کاش ہماری قوم کی بے پردہ خواتین بھی عبرت حاصل کریں! اور فرانسیسی اسکارف کے بجائے اسلامی حجاب کا مکمل اہتمام کریں تو اس گئے گذرے دور میں اس مردہ اسلامی فرض ''پردہ'' کو زندہ کرنے کی وجہ سے اللہ جل شانہٗ کے قرب ورضا کے ساتھ ایمان و عزت کی حفاظت نصیب ہوگی، اور حیا وفطرت کے تقاضے پورے ہوں گے، خاندانی نظام محفوظ اور ازدواجی زندگی پرسکون ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

حق تعالیٰ ہمیں تمام اسلامی احکام وفرائض پر صحیح عمل نصیب فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۷)

نیک عورت کی علامات اور اس کے فضائل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍو (بن العاصؓ) قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "الدُّنۡیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ، وَخَیۡرُ مَتَاعِ الدُّنۡیَا الۡمَرۡاۃُ الصَّالِحَۃُ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۲٦۷ /کتاب النکاح/الفصل الأول)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: "ساری دنیا (وقتی) فائدہ اٹھانے کی جگہ ہے، اور دنیا کی سب سے بہترین متاع نیک عورت ہے۔"

دنیا کی سب سے بہترین شئ نیک عورت ہے

حق تعالیٰ نے اس عارضی دنیا میں وقتی نفع اٹھانے کی جتنی بھی (جائز) چیزیں بنائیں، یہ زمین کا فرش، آسمان کی چھت، دن کی روشنی، رات کی تاریکی، آفتاب ومہتاب کی لمعانی، نہروں اور سمندروں کا پانی، غرض سب کا سب انسانوں کے لیے ہے، فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرہ:۲۹)

وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے پیدا کیا۔

پھر گویا قرآنِ پاک کی اس وضاحت وصراحت کی مزید تفصیل حدیث مذکور میں بیان کی گئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی بھی نفع اٹھانے کی چیزیں ہیں، ان میں سب سے بہترین چیز نیک عورت ہے، یہ کائنات کا حسن اور دنیا کی زینت ہے، صبح کا نور اور رات کا تارہ ہے، چاند سورج کی کرن اور معاشرہ کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ساری دنیا بے رونق اور ہر گھر ویران ہے، اس لیے کہ گھر تو گھر والی سے ہی اچھا لگتا ہے نا! یہی وجہ ہے کہ جب جنت میں ابوالبشر علیہ السلام کو تنہائی محسوس ہوئی تو رب العالمین نے بی بی حوا کے ذریعہ اسے دور فرمایا، واقعہ یہی ہے کہ نیک عورت کا وجود باعث تسکین ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَمِنْ آیٰتِہٖ أَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ أَنْفُسِکُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا إِلَیْھَا﴾ (الروم:۲۱)

''اور اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔''

نیک عورت قدرت کی طرف سے دیا گیا ایک بہترین عطیہ اور نیک اولاد کا ذریعہ ہے، نیز اس کی بدولت مرد کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔

جس کو قدرت کی طرف سے یہ عطیہ مل گیا وہ بڑا خوش قسمت ہے، حدیث میں ہے کہ جس کسی کو چار چیزیں نصیب ہوگئیں وہ شخص فلاحِ دارین سے مالا مال ہوگا: (۱) قَلْبًا شَاکِرًا، شکر گزار دل۔ (۲) لِسَانًا ذَاکِرًا، ذکر کرنے والی زبان۔ (۳) بَدْنًا عَلَی الْبَلَاءِ صَابِرًا، مصیبت میں صبر کرنے والا جسم۔ (۴) ''زَوْجَۃٌ لَاتَبْغِیْہِ خَوْنًا فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِہٖ''. (مشکوٰۃ/ص:۲۸۳) ایسی بیوی جو شوہر کے حق میں اپنی ذات اور اس کے مال میں خیانت نہ کرتی ہو۔ معلوم ہوا کہ نیک عورت نعمت ہے۔

نیک عورت کی علامات:

نیک عورت کی جب اتنی عظمت وفضیلت ہے، تو اب فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہے کون؟ نیک عورت کی خصوصیات، علامات اور صفات کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں دس ایسی خصوصیات وصفات بیان فرمائی گئی ہیں جو کسی مرد وزن کے نیک ہونے کے لیے بالکل کافی ہیں، فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنِ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ والْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّآئمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّ أَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الأحزاب: ۳۵)

یعنی (۱) اسلام (اور اسلامی احکام)۔ (۲) ایمان (اور ایمانی عقائد)۔ (۳) اطاعت (اور تابعداری)۔ (۴) (قول وعمل اور قلب کی) سچائی۔ (۵) صبر۔ (۶) عاجزی۔ (۷) صدقاتِ (واجبہ اور نافلہ) (۸) روزوں کی پابندی۔ (۹) اپنی شرم گاہ (عفت وناموس) کی حفاظت۔ (۱۰) اور ذکر اللہ کی کثرت، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو بلا فرق وامتیاز مردوں میں پائی جائیں تو وہ محبوبِ خدا ہیں، اور عورتوں میں پائی جائیں تو وہ خیر النساء ہیں، ان کے لیے ربِ کریم کے یہاں مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔

نیک عورت کے لیے راہِ جنت زیادہ آسان ہے:

ان صفاتِ حسنہ سے متصف ہونا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں، خصوصاً خواتین کے لیے تو نہایت ہی آسان ہے، اللہ کی قسم! وہ تو اگر ان صفات وخصوصیات کے مجموعہ وخلاصہ پر بھی عمل کرلیں تو خیر النساء میں شامل ہوکر جنت کی حقدار بن سکتی ہیں، اس لیے کہ حدیثِ پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے نیک بننا نہایت آسان ہے، بس چند چیزوں کا

اہتمام کرلیں، فرمایا:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا، وَصَامَتْ شَهْرَهَا، وَأَحْصَنَتْ فَرْجَهَا، وَأَطَاعَتْ بَعْلَهَا، فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ". (رواه أبو نعيم فى الحلية، مشكوٰة/ص : ۲۸۱، الفصل الثانی)

مطلب یہ ہے کہ جو عورت پانچ وقت کی نماز اور رمضان کے روزوں کا اہتمام کرے (مراد احکامِ الٰہی کی پابندی ہے) اور اپنی ناموس اور عفت کی حفاظت اور جائز امور میں اپنے شوہر کی اطاعت کرے، ایسی نیک خاتون کو اختیار ہوگا کہ وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے، یعنی قیامت میں جو مقام صدیقین کو ملے گا اِن چند اعمال کی برکت سے وہی مقام ان نیک خواتین کو ملے گا۔ کیوں کہ جہنم کے سات اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں، جن میں مختلف قسم کے لوگ مختلف دروازوں سے جائیں گے، لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار ہوگا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہیں داخل ہو جائیں۔ (مشکوٰۃ:۱۶۷) ان کے علاوہ مردوں میں جو صدیقین کے مرتبہ پر فائز ہیں انہیں بھی یہ مقام نصیب ہوگا، جب کہ خواتین کو یہ مقام ان چند اعمال کے اہتمام پر نصیب ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ نیک عورت کے لیے راہِ جنت تو بہت ہی آسان ہے، جیسے مرد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اپنے اچھے اعمال سے ولایت بلکہ صدیقیت اور جنت کا حقدار بن سکتا ہے اسی طرح عورت بھی بن سکتی ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ﴾ (النساء : ۱۲۴)

اور جو شخص نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

دنیا میں جنتی عورت کا اصل روپ:

اس بنا پر اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حقیقت میں عورت اگر اسم با مسمیٰ بن جائے تب بھی وہ جنتی ہے۔ان شاءاللہ العزیز۔

وہ اس طرح کہ لفظ ''عورت'' میں عین سے عفت وعصمت کی حفاظت مراد ہے، یہ وصف تو ہر ایک میں ہونا ضروری ہے، لیکن عورت کی تو خاص پہچان ہے، اگر کائنات کا حسن عورت ہے، تو عورت کا حسن عفت ہے، اور ''واؤ'' سے وفاداری مراد ہے، ظاہر ہے کہ نیک عورت کا مرکزِ وفا صرف اور صرف اس کا شوہر ہی ہوتا ہے، وہ بدترین عورت ہے جس کی محبت کے کئی مرکز ہوں۔ جیسے ایک ماڈرن عورت اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ آج کل میں ایک خط سے نہایت پریشان ہوں، جس میں مجھے یہ دھمکی ملی ہے کہ ''اگر تم نے میرے شوہر سے ملنا جلنا بند نہ کیا تو میں تمہیں قتل کردوں گی۔'' اس پر سہیلی نے کہا: ''تو تم ملنا جلنا چھوڑ دو! یہ کونسی بڑی بات ہے؟'' ماڈرن عورت بولی: ''دراصل مشکل یہ ہے کہ خط گم نام ہے، پتہ ہی نہیں کس شوہر کی بیوی نے لکھا ہے۔'' إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

حسن والیاں کسی کی یار نہیں ہوتیں
یار ہوتی ہیں تو وفادار نہیں ہوتیں

صاحبو! جس عورت کو شرم وحیا، پاک دامنی اور وفاداری کا پیکر ہونا چاہیے وہ اگر آوارہ ہوجائے، پھر اس بدترین عورت سے بڑا فتنہ بھی کوئی نہیں ہوسکتا، نیک عورت اگر دنیا کی روشنی ہے، تو بری عورت دنیا کی تاریکی ہے اور سویٹ پوئزن (میٹھا زہر) ہے۔

''را'' سے رحم دلی مراد ہے، اس صفت اور خصوصیت سے متصف ہونے والی عورت اپنے بچوں کی نہایت شفقت کے ساتھ جسمانی وایمانی تربیت کرتی ہے۔

اور ''تا'' سے مراد احکامِ الٰہی کی تابعداری ہے، یہ جیسے مردوں کے لیے لازم ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری ہے، جو عورت ان خصوصیات کی حامل ہے وہ اسم با مسمیٰ

ہے، اور یہی دنیا میں ایک جنتی عورت کا اصل روپ ہے، ہر خاتون کے لیے عاجز کی دعا ہے:

دین و دنیا میں عطا کر یا الٰہ! ☆ عورتوں کو اسوۂ خیر النساء

دیندار عورت دینی انقلاب پیدا کرسکتی ہے:

کسی بھی عورت کی سب سے بہترین اور بڑی خوبی اس کی خوبصورتی نہیں بلکہ عفت و پاکدامنی، وفاداری، رحم دلی اور تابعداری ہے، اور مختصر لفظوں میں کہا جائے تو نیکی اور دین داری ہے، کیونکہ خوب صورت اور نیک صورت ہونا تو سب کے بس کی بات نہیں، لیکن نیک سیرت ہونا یقیناً ہر کسی کے بس میں ہے، ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہر عورت مذکورہ صفات پیدا کرنے کی ہمت اور کوشش کرے، یہ ان کی سب سے بڑی اور پہلی ذمہ داری ہے، جن خواتین نے اس کا احساس کیا تو نہ صرف یہ کہ وہ خود نیک اور دیندار بنیں بلکہ ان کی کوشش سے عجیب انقلاب پیدا ہوا۔

چناں چہ آپ نے تاتاریوں کا نام سنا ہوگا، جنھوں نے ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنا کر گھروں میں ڈال دیا تھا، ان عورتوں نے قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا، اور وہ یہ کہ یہ نیک عورتیں تاتاریوں کے جس خاندان اور قبیلہ میں بھی باندیاں بن کر داخل ہوئیں، اس خاندان اور قبیلہ میں اسلام کے نور کو پھیلاتی چلی گئیں، اور کچھ ہی عرصہ میں چشم فلک نے یہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین نظارہ دیکھا کہ وہی تُرک جن کے ہاتھوں میں اسلام کا نام ونشان مٹانے کے لیے کل تلواریں تھیں، آج وہی ہاتھ اللہ سے دعائیں مانگنے میں مشغول اور مصروف تھے، وہی پیشانیاں کل جن پر کسی مسلمان کو دیکھ کر بل پڑ جاتے تھے، آج وہ سجدہ میں رگڑی جارہی تھیں، وہی آنکھیں جن میں کل کفر و عدوان کے شرارے تھے، آج ان آنکھوں سے خشیتِ الٰہی اور خوفِ قیامت سے آنسو ٹپک رہے تھے، جو کام مسلمانوں کے مرد نہ کرسکے وہ کام خواتین اسلام کی نیک نیتی اور دینداری نے سرانجام دے دیا، وہ قوم جسے مسلمان جوانوں کی جوانیاں شکست نہ دے سکیں اس قوم کو

بظاہر بے سہارا باندیوں نے اسلام کے قدموں پر لاکر ڈھیر کر دیا۔ (ندائے منبر و محراب: ۵/ ۳۲۸)

اپنی عظمتوں کو ذرا اپنی نگاہوں سے بھی دیکھ
تیرے جلوں سے معمور ضمیر انسان
برف تو برف ہے، پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
تو جو روشن کرے آتشِ قلبِ سوزاں

ایک نصیحت آموز واقعہ:

واقعہ یہ ہے کہ جب بھی عورت خوابِ غفلت سے بیدار ہوئی ہے، اس سے اجتماعی اور انفرادی طور پر انقلاب پیدا ہوا ہے، اجتماعی انقلاب کی روشن مثال آپ نے ملاحظہ فرمائی، اب انفرادی انقلاب کی مثال بھی سن لیجئے!

حضرت حمید الدین ابو حاکم قریشیؒ ایک نیک دل بادشاہ گذرے ہیں، مکران وغیرہ پر حکومت کیا کرتے تھے ''ذکرِ کرام'' میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدینؒ کے ساتھ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا، جس نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور ان کو سلطان سے شیخ بنا دیا، شیخ حمید الدینؒ اپنے دورِ حکومت میں دوپہر کو ایک باغ کے محل میں آرام کیا کرتے تھے، اس محل کی نگرانی اور بادشاہ کے آرام کا نظام ''زینت'' نامی ایک خادمہ کے سپرد تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حمید الدین کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا، تو اسے خواہش ہوئی کہ اس پر میں بھی آرام کا مزہ لوں، وہ اس پر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی اور نیند کی وادی میں کھوگئی، بادشاہ نے محل میں آکر خادمہ کو دیکھا کہ شاہی بستر پر پڑی سو رہی ہے، تو غصہ آیا، حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے، حکم کی تعمیل میں جب خادمہ کو کوڑے مارے گئے، تو حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سزا ملنے پر خادمہ آہ اور واویلا کرنے کے بجائے معنیٰ خیز انداز میں ہنس رہی ہے، جب اس سے بے موقع ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی، تو خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ ''حضور! اس سزا ملنے سے مجھے

خیال آیا کہ جب اس نرم ونازک شاہی بستر پر ایک بلاارادہ آ جانے والی نیند کی یہ سزا ہے، تو پھران لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس پر غفلت کے ساتھ آرام کرتے ہیں۔'' خادمہ کے اس کایا پلٹنے والے جملہ نے انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا، اوران کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا، یہاں تک کہ شاہی زندگی ترک کر کے درویشوں والی زندگی اختیار کر لی، آپؒ نے ۱۶۷ سال کی عمر پائی، اللہ کے بے شمار بندے اور بندیاں ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ (مستفاد از: ''حکایتوں کا گلدستہ'' /ص:۱۲۶)

دنیا کے اکثر باکمال مردوں کے پیچھے نیک عورت کا ہاتھ ہے:

بلا مبالغہ دنیا کی تاریخ میں جتنے بھی باکمال مرد گذرے ہیں، تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اکثر ان باکمال اور عظیم المرتبت مردوں کے روشن کارناموں کے پیچھے کسی نہ کسی شکل میں نیک عورت کی تعلیم وتربیت اور ایثار وقربانی نظر آئے گی:

مثلاً سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کے پیچھے ان کی والدہ سیدہ ہاجرؓ کی بے مثال تعلیم وتربیت نظر آتی ہے۔ سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے پیچھے بھی ان کی والدہ سیدہ ام موسیٰؑ کا بے مثال ایثار نظر آتا ہے، اسی طرح سیدنا عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کے پیچھے ان کی والدۂ عفیفہ سیدہ مریمؑ کی عظیم قربانی نظر آتی ہے۔ اور صحابۂ کرامؓ میں مثلاً حضراتِ حسنینؓ کے پیچھے ان کی والدہ خاتونِ جنت سیدہ فاطمہؓ کی بھی تربیت نظر آتی ہے، اسی طرح سیدنا انسؓ کو سرکارِ دوعالم ﷺ کی مبارک صحبت میں پیش کرنے والی ان کی والدہ تھیں، صحابہ کو حضور ﷺ کا تقریباً نصف علم ام المومنین سیدہ عائشہؓ کے ذریعہ ملا، جو حضور ﷺ کے تعلق سے تمام مومنین کی ماں ہیں۔ اور اولیاء میں مثلاً حضرت امام بخاریؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، امام شافعیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ کے روشن کارناموں کے پیچھے ان کی ماؤں کی روشن تعلیم وتربیت نظر آتی ہے، سیدنا عمر فاروقؓ کے ایمان لانے میں ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب کو بھی دخل تھا، سیدنا عکرمہؓ کے ایمان لانے میں بھی ان کی اہلیہ محترمہ حضرت امِ حکیمؓ کو

دخل تھا، حضرت ابوطلحہؓ کے ایمان لانے میں انکی رفیقۂ حیات سیدہ امِ سلیمؓ کو دخل تھا، خلیفۂ راشد سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی استقامت کے پیچھے بھی ان کی شریک زندگی سیدہ فاطمہ بنت عبدالملک کا دخل نظر آتا ہے۔

بہترین عورت کون؟:

آج درحقیقت ہمارے اس بدلتے ہوئے ماحول اور بگڑے ہوئے معاشرہ کو ضرورت ہے تو ایسی خواتین کی جو خود بھی دیندار ہوں اور دوسروں کو بھی دیندار بنانے کا جذبہ رکھتی ہوں، حدیث پاک میں اس عورت کو سب سے بہترین بتلایا جو شوہر کے ایمان میں مددگار ثابت ہو: "وَ زَوْجَةٌ مُّؤْمِنَةٌ تُعِيْنُهٗ عَلىٰ إِيْمَانِهِ". (رواه أحمد والترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۹۸/ باب ذکر اللّٰہ عزوجل والتقرب إلیه الفصل الثانی)

ایک روایت میں ہے کہ ایک مومن بندہ نے تقویٰ کی نعمت کے بعد کوئی ایسی بہترین چیز نہیں پائی جو اس کے حق میں نیک عورت سے بڑھ کر ہو۔

نیک بیوی کی کچھ علامات یہ ہیں:

۱- جب شوہر اس کو کسی کام کا حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ (بشرطیکہ خلافِ شرع کام نہ ہو)۔ نیک عورت کی سب سے بڑی خوبی اور نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی فرماں بردار ہو۔

۲- جب شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کردے۔ اپنے شوہر کو خوش کرنے والی ہو، شوہر جب بھی اس کی طرف دیکھے تو اسے ایک قلبی سکون کا احساس ہو، یعنی شوہر کی خوشی کا خیال رکھے۔

۳- جب اس کے لیے کسی معاملہ میں قسم کھائے تو وہ اس کو بری کردے۔ شوہر کی قسم کی لاج رکھنے والی ہو۔ مثلاً شوہر اپنے کسی رشتہ دار وغیرہ کے سامنے قسم کھا کر کہے

کہ میری بیوی میری اجازت کے بغیر کہیں جاتی نہیں، یا کسی فضول رسم و رواج میں پڑتی نہیں، وغیرہ، تو واقعی وہ اس طرح کر دکھائے۔

۴- جب وہ اس سے غائب ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال کی حفاظت کا پورا خیال رکھے، اور اپنے شوہر کی خیر خواہ ہو۔

عَنْ أَبِیْ أُمَامَۃَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّہٗ یَقُوْلُ: "مَا اسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَی اللّٰہِ خَیْرًا لَہٗ مِنْ زَوْجَۃٍ صَالِحَۃٍ، إِنْ أَمَرَھَا أَطَاعَتْہُ، وَإِنْ نَظَرَ إِلَیْھَا سَرَّتْہُ، وَإِنْ أَقْسَمَ عَلَیْھَا أَبَرَّتْہُ، وَ إِنْ غَابَ عَنْھَا نَصَحَتْہُ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِہٖ". (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص: ۲۶۸، کتاب النکاح، الفصل الثالث)

یہی وجہ ہے کہ نکاح میں بھی نیک عورت کو ترجیح دینے کا حکم ہے، کیوں کہ اگر عورت نیک ہے تو اس سے خیرِ کثیر وجود میں آسکتی ہے، پھر ساری دنیا میں اس سے اتنا نفع پہنچ سکتا ہے جتنا اس عارضی دنیا میں وقتی نفع کی چیزوں سے نہیں پہنچ سکتا، اسی حقیقت کو حدیث میں بیان فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو (بن العاصؓ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "الدُّنْیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ، وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ".

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۲۶۷ / کتاب النکاح/الفصل الأول)

حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''ساری دنیا (وقتی) فائدہ اٹھانے کی جگہ ہے، اور دنیا کی سب سے بہترین متاع نیک عورت ہے۔''

حق تعالیٰ ہماری خواتین کو یہ حقائق سمجھا دے اور ہم تمام کو نیک بنا دے۔ آمین۔

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَا ھُوَ أَھْلُہٗ۔

☆......☆......☆

(۲۸)

ازدواجی زندگی کا حسین تصور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "لَمۡ تَرَ لِلۡمُتَحَابَّیۡنِ مِثۡلَ النِّکَاحِ". (ابن ماجه، مشکوٰة/ص: ۲٦٨/کتاب النکاح/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (اے شخص!) تو نے نکاح کے مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہوگی جو دو محبت کرنے والوں کے درمیان محبت کو زیادہ کرے۔

ازدواجی زندگی پُر سکونِ زندگی کا انحصار:

بلاشبہ ہر انسان کی زندگی میں ایک دور اور موڑ ایسا ضرور آتا ہے جس میں فطری طور پر ہر مرد و عورت ایک دوسرے کے سخت محتاج اور ضرورت مند بن جاتے ہیں، ان کی زندگی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہوجاتی ہے، اس موقع پر ان دونوں کا خصوصی تعلق لازم و ضروری ہوجاتا ہے، جس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) نکاح۔ (۲) سفاح، یعنی زنا۔ ظاہر ہے کہ نکاح تو تقاضائے فطرت، انسانی خصوصیت، نسلِ انسانی کی حفاظت اور سرورِ زندگی وصحت کا ایک حلال، پاکیزہ اور آسان ترین و بہترین ذریعہ ہے، جب کہ زنا بالکل اس کی ضد ہے۔ اس لیے شریعتِ مطہرہ میں زنا اور اس کے اسباب تک پر پابندی لگادی، اور نکاح کی اجازت

ہی نہیں بلکہ خاص حالات میں حکم دے کر اسے مرد و عورت کے فطری اور خصوصی تعلق قائم کرنے کا ایک پاکیزہ و پر لطف ذریعہ بنا دیا گیا، پھر چوں کہ نکاح کے بعد والی ازدواجی (میاں بیوی کی) زندگی پر بڑی حد تک سکونِ زندگی کا دار و مدار اور انحصار ہے، اس لیے ہر شریف اور سمجھ دار جوڑے کی عین چاہت وخواہش ہوتی ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہو، تا کہ بقیہ زندگی بھی پر بہار ہو۔ قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کی خوش گواری کے لیے میاں بیوی کا آپسی تعلق اور سلوک کیسا ہونا چاہیے اس کی طرف نہایت ہی بلیغ و بہترین انداز میں اشارہ فرمایا:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (البقرة : ۱۸۷)

''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو''۔ علماءِ محققین و مفسرین کے بقول یہاں ازدواجی زندگی (میاں بیوی کے تعلق) کو جو لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس کی مختلف وجوہات ہیں۔

ازدواجی زندگی میں خوش گواری کا پہلا اصول:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ لباس انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اور اس سے انسان کا تعلق دائمی ہوتا ہے، وقتی نہیں، بلکہ لباس انسانی زندگی و جسم کا ایک حصہ ہے، بالکل اسی طرح ازدواجی زندگی (یعنی میاں بیوی کا تعلق بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ تعلق بھی) کوئی وقتی نہیں، دائمی ہے، اور لباس کی طرح دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی زندگی کا ایک حصہ ہیں، جیسا کہ ارشادِ ربانی ﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء : ۱) سے واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے عورت (مراد ماں حوا ہیں، ان) کی تخلیق مرد (مراد حضرت آدم علیہ السلام، کہ ان کا پتلا بنانے کے بعد جو مٹی بچ گئی اس) سے فرمائی ہے، اس اعتبار سے گویا دونوں ایک دوسرے کے بدن کا حصہ اور پارٹ ہیں، علاحدہ اور ایک دوسرے کے خلاف کوئی پارٹی نہیں، جب بات یہی ہے تو جس طرح ہر انسان اپنے حصّۂ بدن سے محبت اور اس کی حفاظت کرتا

ہے، اسی طرح میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے، ایک دوسرے کا تحفظ کرنا چاہیے، پھر ازدواجی زندگی میں ایک عورت اپنے شوہر سے (۱) تحفظ (۲) اور توجہ کی خواہش مند ہوتی ہے، تو مرد اپنی بیوی سے (۱) محبت (۲) وعفت کا خواہاں ہوتا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دونوں ایک دوسرے کو جسم اور زندگی کا ایک حصہ سمجھیں۔ غالبًا اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے ازدواجی زندگی کو لباس کے ساتھ تشبیہ دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو قربت لباس اور انسان میں ہوتی ہے، ایسی قربت میاں بیوی کے درمیان آپس میں ہونی چاہیے، ان کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیے، تب ہی ازدواجی زندگی خوش گوار ہوگی، یہ ازدواجی زندگی کی خوش گواری کا پہلا اصول ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضرورت بن کر رہیں، دونوں اس طرح ایک ہو کر رہیں جس کو شاعر نے یوں کہا:

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم، تو دیگری

لیکن یاد رکھو! میاں بیوی کا ایک ہونا ان کے نیک ہونے پر موقوف ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نیکی اور دینداری کی بنیاد پر نکاح کی ترغیب دی، اس لیے کہ وہی میاں بیوی ایک ہوں گے جو نیک ہوں گے، اور تبھی ان دونوں کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہوگی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''دنیا کی جنت یہ ہے کہ زوجین ایک ہوں اور نیک ہوں۔'' (اصلاحی خطبات/ ج:۱۱/ص:۷۹)

ازدواجی زندگی میں خوش گواری کا دوسرا اصول:

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ لباس سے ہر انسان محبت کرتا ہے، بلکہ لباس سے انسان کا گہرا تعلق ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ہر وقت کسی نہ کسی لباس میں ملبوس رہتا ہے، بے لباس نہیں رہتا، بالکل اسی طرح انسان کو بھی بے نکاح نہیں رہنا چاہیے، پھر ازدواجی زندگی میں

میاں بیوی کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ محض قانونی نہیں بلکہ محبت بھرا، اور بہت ہی گہرا ہونا چاہیے، ہر ایک دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی، ایک دوسرے کے سکھ کو اپنا سکھ اور ایک دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھیں، ہر جائز کام میں ایک دوسرے کی وفاداری، فرماں برداری، خیر خواہی اور رضا جوئی کا پورا پورا خیال رکھیں، اور اس حدیث پاک کا مصداق بن جائیں جس میں میاں بیوی کا گہرا اور محبت بھرا تعلق اس طرح بیان کیا گیا، کہ "لَمْ تَرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلَ النِّكَاحِ" کہ میاں بیوی جیسی گہری محبت کسی اور کی نہیں ہوتی، جتنی محبت نکاح سے پیدا ہوتی ہے کسی اور چیز سے اتنی نہیں ہوتی، وجہ یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان صرف شرعی اور قانونی تعلق ہی نہیں رکھا، بلکہ فرمایا:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (الروم: ۲۱)

''اس نے تم میاں بیوی کے درمیان رحمت و محبت کے جذبات رکھ دیے۔'' یہ اسی کا اثر ہے کہ عام طور پر نکاح سے پہلے میاں بیوی الگ الگ ماحول میں پرورش پاتے ہیں، لیکن نکاح کے بعد ان میں ایسا گہرا تعلق پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے طرزِ زندگی کو خیر باد کہہ کر ایک دوسرے کے ہو رہتے ہیں، ان کے درمیان یک بیک وہ محبت پیدا ہوجاتی ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر رہنا ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، تو یہ بھی قدرت ہی کا کرشمہ ہے۔

بقولِ شاعر:

خدا نے عرش پر جوڑے بنائے
فرش والوں نے بس لا کر ملائے

کون کس کا حبیب ہوتا ہے؟ کون کس کا رقیب ہوتا ہے؟
یوں ہی بن جاتے ہیں رشتے ناتے، جہاں جس کا نصیب ہوتا ہے

حق تعالیٰ نے ان کے درمیان مودت، محبت، چاہت اور رحمت پیوست کر دی، کیوں کہ ازدواجی زندگی کی خوش گواری کے لیے یہ ضروری تھا۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عموماً اس محبت کا حال یہ ہوتا ہے کہ قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کے بغیر میاں بیوی کے مابین صرف نکاح کی وجہ سے شدید ترین محبت ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ یہ محبت قرابت سے پیدا ہونے والی محبت سے بھی بڑھ جاتی ہے، نکاح کے بعد جوانی سے اس کا سلسلہ شروع ہو کر بوڑھاپے بلکہ موت تک رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ جوانی میں تو شہوت غالب ہوتی ہے، لیکن بوڑھاپے میں شفقت غالب ہوتی ہے۔

پھر میاں بیوی کا آپس میں گہری اور سچی محبت کرنا ان کے ایمان، آنکھ اور شرمگاہ کی حفاظت کا سبب بھی ہے، اس لیے شریعت میں یہ محبت صرف مطلوب ہی نہیں، باعث فضیلت بھی ہے، حدیث میں ہے کہ ’’جب مرد اپنی بیوی کو محبت سے دیکھتا ہے، اور عورت اپنے شوہر کو، تو حق تعالیٰ ان دونوں کو محبت سے دیکھتے ہیں، اور جب دونوں ایک دوسرے کا محبت سے ہاتھ تھامتے ہیں تو ان کی انگلیوں کے درمیان سے گناہ (صغیرہ) جھڑنے لگتے ہیں۔‘‘ (کنز العمال/ص:۶۷۲/ ۱۶، ذکرہ السیوطی فی الجامع الصغیر)

شاہِ ہند جہانگیرؒ کا ایک واقعہ:

لیکن محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر جائز و ناجائز کام میں ایک دوسرے کی اطاعت شروع کر دے، بالکل نہیں، میاں بیوی کی یہ محبت کبھی شریعت سے غفلت کا باعث نہ ہو تو پسندیدہ ہے، جیسے شاہِ ہند جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ ملکہ نور جہاں نے ان سے خلافِ شرع کسی کام کا مطالبہ کیا، تو چوں کہ آپس میں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اس لیے شروع میں انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب ملکہ نے اصرار کیا تو جہانگیرؒ نے صاف سنا دیا کہ: ’’جاناں بتو دل دادم، نہ کہ ایمان‘‘ یعنی جانم! میں نے تمہیں دل دیا ہے، ایمان نہیں دیا۔

یہ ہے محبت کی حد، شریعت کے آگے ساری محبتیں ختم ہو جاتی ہیں، کہتے ہیں کہ اس بات کی خبر حضرت شیخ مجدد الفِ ثانیؒ کو ہوئی تو آپؒ نے فرمایا: ’’جہانگیر کو کہہ دو کہ جنت میں

گیا تو تمہارے بغیر نہ جاؤں گا۔'' اس کے بعد جہانگیرؒ ہمیشہ حضرتؒ کے اس جملہ پر فخر کیا کرتے تھے، فرماتے کہ'' آخرت کے لیے اپنے پاس تو کوئی توشہ اور زادِ راہ حضرتؒ کے اس وعدے کے علاوہ ہے ہی نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ حق تعالیٰ حضرتؒ کا وعدہ ضرور پورا فرمائیں گے۔'' (حیرت انگیز واقعات/ص:۱۳۲)

المختصر! میاں بیوی کا آپس میں گہری محبت کرنا پسندیدہ عمل ہے، بشرطیکہ شریعت سے غفلت کا سبب نہ بنے، جیسے شریعت کے دائرہ میں رہ کر ہر طرح کا لباس پہننا جائز ہے، ایسے ہی شریعت کے دائرہ میں رہ کر میاں بیوی کا ہر طرح سے محبت کرنا بھی جائز ہے، شاید اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے ازدواجی زندگی کو لباس سے تشبیہ دی، کہ اگر لباس سے انسان محبت کرتا ہے بلکہ اس سے گہرا تعلق ہوتا ہے، تو میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے سے محبت بلکہ ایسا گہرا تعلق ہو کہ ایک دوسرے کو بزبانِ حال کہیں کہ

معیت گر نہ ہو تیری تو گلستاں میں گھبراؤں
رہے تو ساتھ تو صحرا میں گلشن کا مزہ پاؤں

جب زوجین کے درمیان اس طرح گہری اور سچی محبت ہوگی تب ہی ازدواجی زندگی خوش گوار ہوگی، یہ ازدواجی زندگی میں خوش گواری کا دوسرا اصول ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے گہری و سچی محبت کریں، اگر محبت دوطرفہ ہو تو ازدواجی زندگی کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور جدائی کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔

ازدواجی زندگی میں خوش گواری کا تیسرا اصول:

(۳) تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ لباس انسان کے لیے سترِ عورت کا سبب ہے، یعنی لباس انسان کے ستر کو چھپاتا اور زینت وحسن کو بڑھاتا ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے میاں بیوی کے تعلق کو لباس سے تشبیہ دے کر اس طرف اشارہ کیا کہ تم بھی ایک دوسرے کے حق میں لباس کے مانند ہو، اب تم بھی لباس کی طرح ایک دوسرے کے راز کو چھپاؤ اور راحت

وزینت کا سبب بنو! ایک دوسرے کے عیب وخامی کو چھپاؤ اور ایک دوسرے کے لیے حسن اور خوبی کو بڑھاؤ! اس کے بغیر ازدواجی زندگی میں خوش گواری ممکن نہیں۔ازدواجی زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوتے ہیں، جس کی بنا پر ایک دوسرے کی جسمانی، روحانی، اخلاقی وعملی کمزوریوں پر مطلع ہونے کا موقع ملتا ہے۔

اس صورت میں دونوں کا کمال یہ ہے کہ ایک دوسرے کی خوبی کو پھیلائیں اور خامی کو چھپائیں، دل میں اتنی وسعت پیدا کریں کہ اس میں ایک دوسرے کے راز سما جائیں، ایک دوسرے کی دل جوئی کریں، عیب جوئی نہ کریں، اور اگر کسی میں کوئی عیب ہو تو اس صورت میں جیسے کپڑے کی گندگی دور کی جاتی ہے، ایسے ہی ایک دوسرے کی خرابی دور کی جائے، خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، اور مرد سے ہو یا عورت سے، اسے بہتر سے بہتر انداز میں دور کرنے کی کوشش کریں۔حضرات صحابۂ کرامؓ اور صلحاءِ امت کا یہی حال تھا۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ نے ایک نہایت عبرت ناک واقعہ نقل فرمایا کہ امیر المومنین سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں ایک خاتون عدالت فاروقی میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگی کہ ''امیر المومنین! میرے شوہر بڑے نیک ہیں، دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات میں نماز پڑھتے ہیں'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ اس کی بات کا مقصد اچھی طرح سمجھ نہ پائے، اس لیے فرمایا: ''اللہ تمھیں برکت دے اور تمہاری مغفرت فرمائے، کہ نیک عورت ہمیشہ اپنے شوہر (میں نیکی دیکھتی اور اس) کی تعریف ہی کیا کرتی ہے'' عورت سن کر کچھ نہ بولی اور واپس جانے لگی، تب مجلس میں موجود حضرت کعب ابن سوار رضی اللہ عنہٗ نے اجازت لے کر عرض کیا: ''امیر المومنین! درحقیقت آپ اس عورت کی بات سمجھ نہیں پائے، وہ اپنے شوہر کی تعریف نہیں، تنقید اور شکایت کرنے آئی تھی کہ ''جوشِ عبادت میں وہ حقِ زوجیت ادا نہیں

کر پاتے۔‘‘

حضرت عمرؓ نے فرمایا: (اچھا! رونگ نمبر لگ گیا) پھر بلاؤ اسے، اور دوبارہ اس عورت سے دریافت کیا گیا تو واقعی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا خیال صحیح تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ’’جب بات تم ہی اچھی طرح سمجھے تو اب فیصلہ بھی تم ہی کرو‘‘ اس پر حضرت کعبؓ نے عجیب فیصلہ سنایا کہ ’’دیکھئے! حق تعالیٰ نے مرد کو زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، اب اگر کوئی شخص اس اجازت پر عمل کرتے ہوئے چار عورتوں سے نکاح کرے تو سیدھا حساب ہے کہ ہر عورت کے حصہ میں تین دن اور رات کے بعد چوتھا دن اور رات آئے گی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چوتھا دن اور رات ایک بیوی کا حق ہے، لہٰذا حکم دیجیے کہ اس عورت کا شوہر تین دن، رات عبادت کرسکتا ہے، مگر چوتھا دن لازمی طور پر اسے اپنی بیوی کے ساتھ گذارنا ہوگا، کہ اس کا بھی حق ہے‘‘۔

(آج چودھویں صدی کے بابو اور بیوی سے کہنا پڑتا ہے کہ اولیلیٰ مجنونو! ذرا خیال رکھو کہ تمہارے رب کا بھی حق ہے) حضرت عمرؓ اس فیصلہ سے بہت متاثر ہوئے، اور حضرت کعبؓ کو اسی وجہ سے بصرہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ (الاستیعاب/ص:۲۸۶/۳، از تراشے/ص:۸۴)

ازدواجی زندگی ایک مشترکہ تعاون کا ادارہ:

الغرض! نکاح کے بعد ازدواجی زندگی میں کئی قسم کے حالات اور نشیب وفراز آتے ہیں، جن میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، تقابل کی نہیں، ایک دوسرے کی دل جوئی کی ضرورت ہوتی ہے، دل شکنی کی نہیں، اور ازدواجی زندگی میں خوش گواری کا راز اسی میں چھپا ہے۔

فرصت زندگی کم ہے محبت کے لیے
لاتے ہیں وقت کہاں سے لوگ نفرت کے لیے

صاحبو! یہ حقیقت ہے کہ ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے

والے اور ایک دوسرے سے محبت ونصرت (تعاون) کا معاملہ کرنے والے عموماً زندگی کے دیگر شعبوں میں لوگوں کے ساتھ بھی اسی طرح سے پیش آتے ہیں، اس کے برعکس جو لوگ ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے سے مل جل کر نہیں رہتے، ایک دوسرے سے ہمدردی ودلجوئی کا معاملہ نہیں کرتے، ایسے لوگ ازدواجی زندگی تباہ کرنے کے علاوہ بقیہ زندگی میں بھی حقیقی اور سچی خوشی نہیں پاسکتے، اور عام ملنے جلنے والوں سے بھی تعلقات خوش گوار نہیں رکھ سکتے، یہ نتائج کوئی ظنی اور خیالی نہیں، بلکہ اس کی بنیاد ازدواجی زندگی کے تجربات اور سینکڑوں کامیاب وناکام شادیوں کے مشاہدات پر ہے، اس لیے اگر ازدواجی زندگی کو ایک مشترکہ تعاون کا ادارہ سمجھا جائے تو اس کے نتائج دین، دنیا وعقبیٰ ہر اعتبار سے بڑے حوصلہ افزا اور خوش گوار ثابت ہوں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور دارین میں خوش گوار زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۲۹)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”أَحَبُّ البِلَادِ إِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُھَا، وَ أَبۡغَضُ البِلَادِ إِلَی اللّٰہِ أَسۡوَاقُھَا“. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ ص: ٦٨/ باب المساجد و مواضع الصلاۃ/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”آبادیوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ حصہ اللہ کے نزدیک ان کی مساجد ہیں، اور آبادیوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ حصہ ان کے بازار ہیں۔“

مسجد زمین کا سب سے زیادہ پسندیدہ مقام:

یہ محفل نہیں، گھر ہے خدائے قدیر کا
رتبہ یہاں پر ایک ہے امیر وفقیر کا

مقصد حیاتِ انسانی یادِ الٰہی اور عبادتِ خداوندی ہے، اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے مخصوص جگہیں مردوں کے لیے مساجد ہیں، اس لیے اللہ رب العزت کے نزدیک وہ پسندیدہ ہیں، البتہ اس امت کی اتنی رعایت بلکہ خصوصیت ہے کہ اس کے عبادت گزار اپنے پروردگار کی عبادت، اس کی یاد و نماز کہیں بھی ادا کر سکتے ہیں، اس امت کی عبادتیں در و دیوار

کی قطعاً محتاج نہیں ہیں، اگر کوئی امتی کسی تنگ وتاریک جیل کی کوٹھری میں یادِ مولیٰ میں مست ہونا چاہتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے، بلکہ عورتوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے: ''بُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ''. (أبوداوٗد/ج:١/ص:٨٤، مشكوٰة/ص:٩٦/ باب الجماعة وفضلها / الفصل الثانی)

یعنی عورتوں کی بہترین مساجد ان کے گھر کے تنگ وتاریک گوشے ہیں، جہاں وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث شریف میں تو گھروں میں نماز پڑھنے کا مطلق حکم بیان کیا گیا ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ''اِجْعَلُوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ مِنْ صَلاتِکُمْ، وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا''. (متفق علیه، مشکوٰة/ص: ٦٩)

فرمایا کہ کچھ نمازیں (نفل وغیرہ) اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، کہ جیسے قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاتی، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھروں میں بھی نماز بالکل ہی نہ پڑھی جائے۔

لیکن مردوں کے لیے اس مقصد کی تکمیل (بالخصوص فرض نمازوں) کے لیے مخصوص جگہیں مساجد ہیں، جو روئے زمین پر عبادت کے لیے خاص ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین کا سب سے پسندیدہ حصہ مسجد اور ناپسندیدہ حصہ بازار ہے۔ لٰہذا جیسے بیت الخلاء گندگی کی جگہ ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ مقام سمجھا جاتا ہے، لیکن ضرورت کے بقدر اس سے تعلق بھی رکھا جاتا ہے، اسی طرح بازار بھی ناپسندیدہ ہونے کے باوجود ضرورت کے بقدر اس سے تعلق رکھا جائے گا۔

دوسری جگہ حدیث قدسی میں اس مضمون کی تفصیل اس طرح منقول ہے کہ ''ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی عالم نے دریافت کیا کہ زمین کا کونسا حصہ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ ربِ جلیل سے تحقیق کرنے کے بعد ہی اس کا جواب دیا جائے،

اس لیے جب جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تو ان کے ذریعہ رب العالمین سے دریافت کیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں: ”حضور! اس بار تو مجھے اللہ تعالیٰ کا اس قدر قرب نصیب ہوا کہ آج سے پہلے کبھی اتنا قریب نہ ملا“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیسے؟“ جواب میں جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ”میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان صرف ستر ہزار (۷۰۰۰۰ نورانی) پردے حائل تھے، حق تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”شَرُّ الْبِقَاعِ أَسْوَاقُهَا، وَ خَيْرُ الْبِقَاعِ مَسَاجِدُهَا“. (رواه ابن حبان فی صحیحه، مشکوٰة/ص: ۷۱/ الفصل الثانی، حدیث قدسی نمبر: ۵)

”زمین کا سب سے ناپسندیدہ مقام اس کے بازار اور سب سے پسندیدہ مقام اس کی مساجد ہیں“۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

”مسجد“ کے معنیٰ ہیں ”سجدہ کی جگہ“ وہ جگہ جہاں بندہ اپنے مولیٰ کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے، جو عبادت کی حقیقت ہے، اسی مناسبت سے عبادتِ الٰہی کی مخصوص جگہ کو مسجد کہا جاتا ہے کہ وہاں بندہ عبادت، نماز اور سجدہ وغیرہ کے ذریعہ عظمت کی آخری علامت پیشانی اور ناک کو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے خاک پر رگڑتا ہے، یہی تو وہ ادا اور جگہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اس کے برخلاف بازار وہ جگہ ہے جہاں عموماً انسان اپنے مالک و خالق سے غافل ہوجاتا ہے، اس لیے بازار ناپسندیدہ مقام ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والے مقامات تو بازار کے علاوہ اور بھی ہیں، اور وہ بازار سے زیادہ خطرناک بھی ہیں، مثلاً شراب خانے، سنیما ہال اور کلب وغیرہ، پھر انہیں ناپسندیدہ کیوں نہیں کہا گیا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بازار تو وہ جگہ ہے جس کا بنانا یا قائم کرنا ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، جب کہ شراب خانے، سنیما ہال اور کلب وغیرہ بنانے کی تو سرے سے

اجازت ہی نہیں، لہٰذا ان کا ذکر نہیں کیا گیا، اور جب بازار کا ذکر کیا تو اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے حلال اور جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے، ایسے ہی جائز جگہوں میں اللہ رب العزت کے نزدیک سب سے زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ جگہ بازار ہے، خصوصاً آج کے بازار میں دروغ گوئی، دھوکہ بازی، حرام کاری اور دین سے بیزاری عام ہے، اس صورت میں تو اس کی قباحت سمجھنے میں اب کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔

یہی وجہ ہے کہ بازار میں جہاں اللہ تعالیٰ کی یاد سے عمومی طور پر غفلت پائی جاتی ہے اگر کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے لیے بڑی فضیلت آئی ہے، حدیث میں ہے کہ جو شخص بازار میں ”لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ، وَ لَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِ وَ يُمِيْتُ، وَ هُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ“. پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھتے ہیں اور ایک لاکھ گناہ مٹاتے ہیں، ایک لاکھ درجات بلند فرماتے ہیں اور جنت میں ایک مکان تعمیر فرماتے ہیں۔ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۲۱۴/ باب الدعوات فی الاوقات/ الفصل الثانی)

مسجد کی اہمیت:

الغرض! حدیث نبوی سے ثابت ہوا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے نزدیک روئے زمین کا سب سے پسندیدہ حصہ ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں بار بار مساجد کا ذکر کیا گیا۔ فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ”قرآنِ کریم میں ۲۷ مقامات پر مساجد کا ذکر ہے، اور متعین طور پر مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا کا ذکر ملتا ہے“۔

ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی میں بکثرت مساجد کا ذکر آنا اس کی عظمت شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، حتیٰ کہ حدیث میں مساجد کو (دنیا میں) جنت کے باغات بتلایا ہے، کہ جب تم جنت کے باغوں سے گذرو تو خوب چرو، عرض کیا گیا کہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو فرمایا: مساجد، اور خوب چرنے کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا: ”سُبْحَانَ

اللّٰہِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ أَکْبَرُ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۷۰/باب المساجد و مواقع الصلوٰۃ/الفصل الثانی)

اور جب مسجد جنت کا باغ اور اللہ رب العزت کا پسندیدہ مقام ہے تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا بھی پسندیدہ مقام ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں مسجدوں سے خصوصی لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے، حتیٰ کہ آیت قرآنی: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکاً وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (اٰل عمران:۹۶) کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ "روئے زمین پر سب سے پہلا گھر جو تعمیر ہوا وہ خانۂ کعبہ ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر آنے کے بعد اپنے گھر سے پہلے اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر فرمائی، اس لیے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، مجاہدؒ، قتادۃؒ، سدیؒ وغیرہم صحابہؓ اور تابعینؒ اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا (کی سب سے بڑی مسجد ہونے کے علاوہ دنیا) کا سب سے پہلا گھر بھی ہے"۔ (معارف القرآن/ص:۱۱۴/۲)

تعمیر مساجد کا مبارک سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر جب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں اس کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ مسجد حرام موجود تھی، گو اس وقت اس پر مشرکین کا قبضہ تھا، لیکن جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی، تو مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے قبا میں ایک مسجد تعمیر فرمائی، گویا خالق کا وہ دروازہ جو مخلوق کے لیے بند ہو چکا تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ہمیں بتلاتا ہے کہ مسلمان جس آبادی میں بسنا چاہیں وہاں اپنے گھر سے پہلے اللہ تعالیٰ کے گھر کی فکر کریں، جیسے ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

مسجد تعمیر کرنے کی فضیلت:

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے بھی فرمائی اور رحمت عالم نے بھی، اور اتنا ہی نہیں، بلکہ امت کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی غرض سے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد تعمیر کرنے کے بڑے بڑے فضائل بھی بیان فرمائے، چناں چہ حضرت عثمانؓ کی روایت مشہور ہے:

عَنْ عُثْمَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا، بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص: ٦٨/الفصل الأول)

"جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے مسجد تعمیر کرے گا (خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، کچی ہو یا پکی، اور تعمیر پہلی ہو یا دوسری، یا اس کی تعمیر میں اپنی استطاعت کے بقدر حصہ لگائے گا) تو اللہ رب العزت اس کے لیے جنت میں ایک شاندار محل تعمیر فرمائیں گے"۔ یعنی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا گھر بنائے گا، جنت میں اللہ تعالیٰ اس کا گھر بنائے گا، اور اس جنتی گھر کی بڑی شان ہوگی، محدثین نے فرمایا کہ "اس جنتی مکان کو جنت کے دیگر مکانات ومحلات پر وہی فوقیت اور عظمت وفضیلت حاصل ہوگی جو زمین کے مکانات و محلات میں مساجد کو حاصل ہے۔" (مستفاد از: مرقات/ص: ۱/۲۹۳)

پھر جب تک اس تعمیر شدہ مسجد میں نماز اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہے گی تب تک تعمیر کرانے والوں کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، کہ تعمیر مسجد والا یہ عمل ثوابِ جاریہ اور صدقہ جاریہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص مسجد میں رات کو روشنی کا انتظام کردے تو جب تک اس کی روشنی مسجد میں رہتی ہے اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھانے والے فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں"۔ (احیاء العلوم، از: مساجد کی عظمت و حرمت/ص: ۱۳۰)

ایک واقعہ:

مروی ہے کہ حضرت تمیم داریؓ جب شام سے مدینہ طیبہ آئے، تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھ کچھ قندیلیں اور تھوڑا سا تیل بھی لیتے آئے، مدینہ منورہ پہنچ کر قندیلوں میں تیل ڈالا اور مسجد نبوی میں لٹکا دیں، اور جب شام ہوئی تو انہیں روشن کیا، اس سے پہلے

مسجد میں روشنی نہیں ہوتی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تشریف لائے اور مسجد کو روشن پایا تو دریافت فرمایا کہ مسجد میں روشنی کس نے کی ہے؟ صحابہؓ نے حضرت تمیمؓ کا نام بتایا، تو آپ ﷺ بے حد خوش ہوئے اور دعا دے کر فرمایا: ''اگر میری لڑکی ہوتی تو میں تمیمؓ سے اس کا نکاح کرا دیتا'' اتفاق سے اس وقت حضرت نوفل بن حارثؓ موجود تھے، انہوں نے اپنی بیٹی ام المغیرہؓ کو پیش کیا، تو آپ ﷺ نے اسی مجلس میں ام المغیرہؓ سے حضرت تمیم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا نکاح کرا دیا۔ (از: ''بکھرے موتی''/ص: ۱۵۰/۴)

بہر حال! مسجد تعمیر کرنے یا اس میں شرکت کرنے کی بڑی فضیلت ہے، اور یہ فضیلت صرف اخروی اعتبار سے ہی نہیں، بلکہ اس کے فضائل وفوائد دنیوی اعتبار سے بھی مسلم ہیں، جس کی شہادت ریاض سے شائع ہونے والے ایک رسالہ ''الدعوۃ'' میں فرانس کے وزیر داخلہ نے اپنی رپورٹ میں دی، انہوں نے کہا کہ یہاں جن محلوں میں مساجد کی تعمیر ہوتی ہے وہاں جرائم حیرت انگیز حد تک کم ہوتے جاتے ہیں، اور انہوں نے اس سروے کو بنیاد بنا کر باقاعدہ تعمیر مساجد کی عام اجازت دے دی، اور خود سرکاری طور پر بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ فرانس اور یورپی ممالک جرائم پر قابو پانے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے وہ مقصد حاصل نہیں کر سکتے جو تعمیر مساجد سے حاصل ہوتا ہے۔

(ماخوذ از: ماہ نامہ مظاہر العلوم/ص: ۵/ اگست/۲۰۰۴ء)

سچ ہے:

کوئی خوبی ہو تو دشمن بھی کرے گا اعتراف
صرف کرّ و فر سے نہیں ہوسکتا اونچا مقام

مسجد تعمیر کرنے کی فضیلت کا مدار خلوص وتقویٰ پر ہے:

لیکن یاد رکھو! ایک ہے باہر کی مسجد، اور ایک ہے اندر کی مسجد، حضرت پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: ''حدیث سے ثابت ہے کہ قلبِ

عبداللہ عرشُ اللہ ہے۔'' جیسے مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے ایسے ہی یہ دل بھی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، جہاں اللہ تعالیٰ رہتے ہیں، اور جب یہ حقیقت ہے تو جیسے مسجد کی صفائی ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ دل کی صفائی ضروری ہے، جیسے دنیا والے گندی جگہ جانا پسند نہیں کرتے ایسے ہی دنیا بنانے والا بھی گندے دل میں آنا پسند نہیں کرتا، لہٰذا پہلے دل کو اس قابل بنانا ضروری ہے، باہر مسجد بنانا آسان ہے، مگر اندر مسجد بنانا تقویٰ کے بغیر آسان نہیں۔ پھر تعمیر مساجد کے جتنے فضائل وفوائد ہیں ان کا اصلی اور حقیقی دارومدار بھی خلوص وتقوی اور تزکیہ پر ہے، جس کی طرف ارشادِ ربانی: ﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ﴾ ﴿إِنَمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الآخِرِ﴾ (التوبة:۱۰۸) اور ﴿وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ﴾ (الجن:۱۸) نیز ارشادِ نبوی ''مَنْ بَنىَ لِلّٰهِ مَسْجِدًا......الخ'' سے اشارہ ملتا ہے، کیوں کہ عربی گرامر میں ''ل'' ملکیت اور اختصاص کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مساجد کسی کی ملکیت نہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں، اس کی عبادت ہی کے لیے مخصوص ہیں، لہٰذا اس کی تعمیر بھی اسی کی رضا کے لیے ہوگی، البتہ اللہ تعالیٰ کے نام اور اس کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص شاندار، بلند، مستحکم اور خوبصورت مسجد بنائے تو کوئی ممانعت بھی نہیں، بلکہ ثواب کی امید ہے۔ (معارف القرآن: ۶/۴۲۷)

اس کے برخلاف اگر مسجد کی تعمیر نام ونمود، ریاکاری اور آپسی تفاخر کے لیے ہو کہ اس علاقہ اور محلّہ والوں نے اتنی شاندار مسجد تعمیر کی تو ہم اس سے زیادہ اچھی بنائیں گے، ظاہر ہے کہ ایسی شاہی مسجد کروڑوں کے خرچ سے بھی بنائی جائے تب بھی کوئی فضیلت آخرت میں حاصل نہ ہوگی، بلکہ یہ عمل لائق ملامت اور علاماتِ قیامت میں سے ہے۔

حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَتبَاهىٰ النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ''. (أبوداود، مشكوٰة/ص:۶۹/الفصل الثانی)

یعنی قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ''لوگ مساجد کی تعمیر میں آپس میں فخر کریں گے۔'' اب ایسا ہونے لگا ہے کہ لوگوں کو شاندار مسجد تعمیر کرنے کی فکر تو ہے، مگر شاندار امام اور جاندار نماز وغیرہ سے اسے آباد کرنے کی اتنی فکر نہیں۔ (الا ماشاء اللہ) شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا:

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے، صدیوں میں نمازی بن نہ سکا

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی عمل عامل کی نیت کے فرق سے پاک بھی ہوسکتا ہے اور ناپاک بھی، طیب بھی ہوسکتا ہے خبیث بھی، مثلاً تعمیر مسجد ایک عمل ہے، یہ کارِ خیر اس وقت ہے جب کہ اس کا مدار خلوص وتقویٰ پر ہو، لیکن اگر اس کا مقصد خدانخواستہ تفریق بین المسلمین ہو، جیسا کہ آج کل بعض نادان اپنی علاحدہ مسجد بنا کر دوسروں پر پابندی لگاتے ہیں۔

بقولِ شاعر:

دے دی اذان مسجد سے انہوں نے ''حَيَّ عَلیٰ الصَّلاَةِ''

اور لکھ دیا باہر کہ ''اندر نہ آئے فلاں اور فلاں''

یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف جاسوسی کا مرکز بنانا ہو، تو پھر یہ تعمیر مسجد والا عملِ خیر عملِ شر بن جاتا ہے، اور وہ تعمیر مسجد ضرار بن جاتی ہے۔

اس لیے حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ ضروری نہیں کہ بے ضرورت بھی مسجدیں بنائی جائیں، جب کہ صدقات اور دوسرے مصارفِ مال کے محتاج ہوں اور مساکین پریشان ہوں، جیسا کہ آج کل بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی صدقہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو مسجد ہی میں لگانا چاہتے ہیں، اگرچہ مسجد میں اس کی ضرورت بھی نہ ہو، اس لیے ضرورت کے مواقع (اور اس کے مقاصد) بھی دیکھنے چاہیئے''۔ (آداب المساجد/ص: ۱۵)

تعمیر مسجد کا حق اور شکر:

پھر ہمارا کام مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اب اصل کام شروع ہوتا ہے اور وہ ہے اس تعمیر شدہ مسجد کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز وغیرہ سے آباد کرنا، جو مسجد کا حق اور تعمیر مساجد کا شکر ہے، اگر زمین کی رونق مساجد ہیں، تو مساجد کی رونق اس کے آباد کرنے والے مصلّی ہیں، جن کی شان اور صفت حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ "قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ". (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص:٦٨)

ان کے دل ہر وقت مسجدوں سے معلق رہتے ہیں، ان کے دلوں میں مسجد آباد کرنے کی فکر ہے، مسجدوں سے انہیں دلی تعلق ہوتا ہے، وہ مسجدوں سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ قیس (مجنون) کو بھی لیلیٰ کے مکان سے اتنی محبت نہ تھی، کیوں کہ ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾ (البقرة: ٢٦٥) اہل ایمان اللہ کی محبت میں نہایت سخت ہوتے ہیں۔ حضراتِ صحابہؓ اور صلحاءِ امت کا حال پڑھیں تو یہی نظر آئے گا، ان کا جسم بظاہر بازار، کاروبار، اور گھر بار میں ہوتا، مگر جان و دل مسجدوں میں۔ اسی وجہ سے شارح مشکوٰۃ ملا علی قاریؒ نے فرمایا:

"كُنْ مِمَّنْ يَكُوْنُ فِي السُّوْقِ، وَ قَلْبُهٗ فِي الْمَسْجِدِ، لَا بِالْعَكْسِ". (مرقاة المفاتیح:٢/٥٩١)

"تو بھی ان لوگوں میں سے ہو جا جن کے جسم بازار میں مگر دل (اللہ کی یاد اور) مسجد میں ہوتے ہیں، نہ کہ اس کے برعکس۔" کہ تو مسجد میں ہو اور تیرا دل بازار میں، اور جو گویا "دست بکار، دل بیار" کے مصداق ہوتے ہیں، اس کے برعکس جن کے بدن مسجدوں میں اور دل بازار میں ہوں، ان میں ہرگز شامل نہ ہو۔

افسوس صد افسوس! ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں بھی اللہ تعالیٰ سے غافل رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھول کر دنیا کے تذکروں میں مشغول رہتے ہیں، حالاں کہ مساجد تو مولیٰ کی یاد کے لیے ہیں، اسی لیے ان میں دنیوی بات چیت کرنے کی بڑی سخت ممانعت

آئی ہے، بلکہ یہ بھی علامت قیامت ہے۔

مسجد میں دنیوی باتوں کی ممانعت:

حضرت حسن بصریؒ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''ایک وقت (قیامت سے قبل) ایسا آئے گا کہ لوگ اپنی دنیاداری کی باتیں اپنی مساجد میں کیا کریں گے، لہٰذا تم ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ/ص: ۷۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص بلا ضرورت دنیوی بات مسجد میں کرتا ہے تو ملائکہ اس سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ ''اُسْکُتْ یَا وَلِيَّ اللّٰہِ'' او اللہ کے ولی! خاموش ہو جا، اگر وہ باتوں میں برابر مشغول رہتا ہے تو ملائکہ دوبارہ کہتے ہیں: ''اُسْکُتْ یَا بَغِیْضَ اللّٰہ'' اللہ کے دشمن! چپ ہو جا، اس بار بھی جب وہ دنیوی باتیں بند نہیں کرتا ہے تو اب کی بار ملائکہ کہتے ہیں: ''اُسْکُتْ، عَلَیْكَ لَعْنَةُ اللّٰہِ'' تجھ پر اللہ کی لعنت ہو، خاموش ہو جا۔
(کتاب المدخل لابن ماجہ/ص: ۲/۵۵)

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس پر مسجد میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر کہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوگی؟ اور کیسے اس کی عبادت کامل ہوگی؟ اس لیے کہا گیا ہے:

کرے بات دنیا کی مسجد میں جو — عبادت بھی اس کی کامل نہ ہو
اگر بات کرنی ہی منظور ہو — نکل باہر مسجد سے، جا دور ہو

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ مسجد تو اللہ تعالیٰ کا شاہی دربار ہے، اس میں آنے والا ہر مصلی اللہ تعالیٰ کا شاہی مہمان ہے، مہمان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہرگز ایسا کوئی کام نہ کرے جو میزبان کو ناپسند ہو۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ فرماتے ہیں کہ ''جو مسجد میں بیٹھا وہ گویا اپنے رب کی مجلس میں بیٹھا، اس لیے اس کے ذمہ ہے کہ سوائے کلمۂ خیر کے اور کوئی کلمہ نہ نکالے''۔ (قرطبی، معارف القرآن/ص: ۶/۴۲۸)

عظمت مساجد کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے آداب پوری طرح سے بجالائیں، اور ان کی حرمت کے خلاف کوئی عمل نہ کریں۔

آداب المساجد:

علماءِ امت نے آداب المساجد میں پندرہ چیزوں کا ذکر کیا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مسجد میں پہنچ کر پہلے سلام کرے، البتہ حاضرین نماز اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں تو سلام نہ کرے، اور اگر کوئی مسجد میں موجود نہ ہو تو اس طرح سلام کرے: "اَلسَلَامُ عَلَیۡنَا وَ عَلیٰ عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِیۡنَ".

(۲) مسجد میں داخل ہوکر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے۔ (بیت اللہ میں طواف کرے جب کہ گنجائش ہو، ورنہ تو نماز پڑھے) البتہ مکروہ وقت ہو تو نماز پڑھنے کے بجائے ذکر واذکار میں مشغول ہو جائے۔

(۳) مسجد میں خرید وفروخت نہ کرے۔ (البتہ معتکف بوقت ضرورت سامان لائے بغیر اس سلسلہ کی ضروری بات کرے تو گنجائش ہے)

(۴) مسجد میں (پولس وغیرہ) کسی مجبوری کے تحت کوئی ہتھیار لے کر آئے تو اسے ہرگز نہ نکالے۔

(۵) مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان نہ کرے۔

(۶) مسجد میں آواز بلند نہ کرے۔ (نیز موبائل فون ساتھ نہ لائے، بوقت ضرورت ساتھ لائے تو آواز بند رکھے)

(۷) مسجد میں دنیا کی باتیں ہرگز نہ کرے۔ (البتہ بوقت ضرورت بقدر ضرورت آہستہ سے بات کرلے تو مضائقہ نہیں)

(۸) مسجد میں بیٹھنے کی جگہ کے بارے میں کسی سے نہ جھگڑے۔

(۹) مسجد کی صف میں جہاں زیادہ جگہ نہ ہو وہاں گھس کر تنگی پیدا نہ کرے۔

(۱۰) کسی نمازی کے آگے (بڑی مسجد میں دو صف قریب) سے نہ گزرے۔ (البتہ سترہ رکھا ہو تو گزرنے کی اجازت ہے)

(۱۱) مسجد میں تھوکنے اور ناک صاف کرنے سے پرہیز کرے۔

(۱۲) مسجد میں انگلیاں نہ چٹخائے۔

(۱۳) مسجد میں اپنے بدن (وغیرہ) کے کسی حصہ سے نہ کھیلے۔

(۱۴) مسجد میں نجاست سے پاک صاف رہے، اور کسی چھوٹے بچے یا مجنون (جن کو پاکی ناپاکی کی تمیز نہیں) ساتھ نہ لے جائے۔ (اور خوشبو وغیرہ کا اہتمام وانتظام کرے)

(۱۵) مسجد میں بکثرت ذکر واذکار میں مشغول رہے۔

علامہ قرطبیؒ نے یہ پندرہ آداب لکھنے کے بعد فرمایا کہ ’’جس نے یہ کام کر لیے اس نے مسجد کا حق ادا کر دیا اور مسجد اس کے لیے حرزِ جان اور امان کی جگہ بن گئی‘‘۔

(معارف القرآن: ۶/ ۴۲۸)

حق تعالیٰ ہمیں اپنی یاد سے کامل مناسبت عطا فرما کر آداب المساجد بجالانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۳۰)

کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ مَالِكِ بۡنِ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ مُرۡسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "تَرَكۡتُ فِيۡكُمۡ أَمۡرَيۡنِ، لَنۡ تَضِلُّوۡا مَاتَمَسَّكۡتُمۡ بِهِمَا، كِتَابُ اللّٰهِ، وَسُنَّةُ رَسُوۡلِهٖ". (رواه فی المؤطا، مشکوٰۃ/ص: ۳۱/باب الاعتصام بالکتاب والسنة/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ مرسلاً (جس میں سند سے صحابی کو ساقط کر دیا گیا ہے، لیکن یہاں مرسل بمعنی منقطع ہے؛ کیوں کہ امام مالک تبع تابعی ہیں، لہٰذا یہاں تابعی اور صحابی دونوں متروک ہیں، ایسی حدیث امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر ثقہ راویوں سے منقول ہو تو مقبول ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک دیگر صحیح احادیث سے اس کی تائید ہو تو مقبول ہے۔ مظاہر حق/ص: ۲۷۵) نقل کرتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہارے لیے ایسی دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوں گے، ایک تو اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) دوسری اللہ تعالیٰ کے رسول کی سنت ہے۔

سرچشمۂ ہدایت کتاب اللہ اور رجال اللہ ہیں:

مادی زندگی میں ہر انسان کو جہاں غذا، ہوا، پانی اور روشنی کی ضرورت ہے، وہیں زندگی کی سیدھی، سچی اور صحیح راہ پانے کے لیے رب العالمین کی رہبری کی اس سے زیادہ ضرورت ہے، الٰہی رہنمائی کے بغیر آج تک کوئی راہِ راست نہ پاسکا ہے، نہ پاسکتا ہے اور نہ پاسکے گا، پروردگارِ عالم نے انسان کی اس حقیقی، اصلی، دائمی اور بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے دوسلسلے جاری فرمائے ہیں: (۱) کتاب اللہ۔ (۲) رجال اللہ۔ یہ دونوں ہی ہدایت کے ذریعے اور سرچشمے ہیں، اور دونوں کا اصل موضوع اور مقصد مخلوق کی ہدایت ہے، کتاب اللہ سے مراد تو اللہ تعالیٰ کی مشہور کتابیں تورات، زبور، انجیل اور قرآنِ کریم ہیں، اور رجال اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر چوں کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا کام صرف پیغامِ الٰہی پہنچانا ہی نہ تھا، بلکہ اس کے مطابق عمل کر کے دکھلانا، اور زندگی کے تمام معاملات میں اپنے قول وعمل سے کتابِ الٰہی کی صحیح تشریح و تفسیر کرنا اور لوگوں کو بتلانا کہ زندگی کی پر خطر راہوں میں وہ کس طرح حق وصدق اور عدل و اعتدال کا راستہ اختیار کر کے اسی پر آخری دم تک قائم رہ سکتے ہیں، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر پیغمبر نے اپنے زمانہ میں اپنے فرضِ منصبی کو بحسن و خوبی انجام دیا، اور سعادت مندوں کو راہ یاب کرتے چلے گئے، ان سب کے بعد تا قیامت انسانیت کی ہدایت کے لیے حق تعالیٰ نے اپنی سب سے بڑی کتاب کلام اللہ کا نزول فرمایا، اور سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

اب تا قیامت جو بھی طالبِ ہدایت ہے اس کے لیے کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (المائدة : ١٥-١٦)

''رب العالمین کی طرف سے ایک نورِ عظیم اور کتابِ مبین آئی (یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام اللہ) رب العالمین ان کے ذریعہ ایسے لوگوں کو سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں جو رضائے حق کے طالب ہوں، اور ان کو اپنی خاص توفیق سے کفر و معصیت اور جہالت وضلالت کی ظلمتوں سے نکال کر اپنی اطاعت اور ایمان واعمال کے نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو ہمیشہ راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اب قیامت تک جو بھی ہدایت کا طالب ہوگا اس کے لیے کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہی سے وابستگی ضروری ہوگی، اس کے بغیر ہدایت ممکن نہیں، اس حقیقت کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا:

''تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّةُ رَسُوْلِهٖ''.

لوگو! ہدایت کے طالبو! مرضی مولیٰ کے خواہشمندو! میں دو چیزیں تم میں چھوڑتا ہوں، تم جب تک ان سے وابستہ رہو گے اور ان سے تمہارا رشتہ باقی رہے گا، تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے، ان میں ایک تو اللہ کی کتاب (قرآنِ کریم) یعنی کلام اللہ ہے، دوسری چیزی میری (یعنی اللہ کے رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) سنت ہے۔

سنت کی تعریف:

اور سنت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس مراد لی جاسکتی ہے، چناں چہ شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں ''علومِ حدیث کے ماہرین نے سنت کی درجِ ذیل تعریف فرمائی ہے: ''رسالت مآب نبی کریم ﷺ کا قول، فعل یا تقریر سنت کہلاتی ہے'' تقریر بھی محدثین کی ایک اصطلاح ہے، اس تعریف میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی بات کہی یا کسی خاص فعل کو اختیار کیا، اور اس کا یہ قول یا فعل رسول اللہ ﷺ کے علم میں آیا، تو آپ ﷺ نے واضح الفاظ میں اس کی توثیق یا ناپسندیدگی کا اظہار فرمائے بغیر سکوت

اختیار فرمایا۔ یہ سکوت رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ایک معنوی رضا مندی ہے، اس لیے یہ بھی سنت کی اصطلاح میں داخل ہے، اور چوں کہ سنت کی تینوں جہتیں (یعنی قول، فعل اور تقریر) حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے متعلق ہیں اس لیے حدیث مذکور میں سنت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات مراد لی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ اب مطلب یہ ہوگا جب تک کتاب اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے وابستہ رہو گے، ہدایت پر قائم رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہو گے، ان میں سے کسی ایک سے بھی ہدایت نہیں مل سکتی، دونوں ہی پر عمل ضروری ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دونوں کے احکامات پر عمل ضروری ہے:

کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دونوں ہی کے احکام ہمارے لیے واجب العمل ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کلام اللہ کے احکامات کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے:

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا﴾ (اٰل عمران: ۱۰۳)

اور اللہ کی رسی (احکامِ الٰہی وقرآنی) کو مضبوطی سے تھامے رہو۔

وہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے احکامات کو بھی مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿وَمَاۤ اٰتٰكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا﴾ (الحشر: ۷)

اور رسول تمہیں جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

خواہ وہ اوامر سے متعلق ہو یا نواہی سے، اور خواہ زبانی ہو یا عملی، اس لیے کہ کلام اللہ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق اس سلسلہ میں دو مختلف اصطلاحیں استعمال کی ہیں:

(۱) اطاعت: یعنی بات ماننا، چناں چہ فرمایا:

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (ال عمران:۳۲)

”کہہ دو کہ اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو، پھر بھی اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔“

(۲) اتباع: یعنی پیروی کرنا، چناں چہ فرمایا:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الأعراف:۱۵۸)

”اب تم اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ جو نبی امی ہے اور جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو تا کہ تمہیں ہدایت حاصل ہو۔“

ان میں پہلی اصطلاح یعنی اطاعت کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و ارشادات سے ہے، جب کہ دوسری اصطلاح آپ ﷺ کے افعال اور اعمال سے متعلق ہے، قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دے کر واضح کر دیا کہ آپ ﷺ کے ارشادات و اعمال دونوں ہی واجب العمل ہیں۔

صاحبو! آپ ﷺ کی اطاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی دلیل ہے، اور آپ ﷺ کا اتباع آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی علامت ہے، اور عشق وہ ہے جو معشوق کی منشا کے مطابق ہو، ورنہ تو فسق ہے۔

وحی کی دو قسمیں ہیں، اور دونوں پر عمل ضروری ہے:

پھر نبی ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل دونوں کا تعلق وحی الٰہی سے ہے؛ کیوں کہ کلام اللہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی اللہ کی وحی ہے، فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا﴾ (الشوریٰ : ۷)

''اوراسی طرح ہم نے یہ عربی قرآن آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجا ہے۔''

تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی پیغمبرانہ حیثیت سے جو کام یا کلام کرتے ہیں در حقیقت وہ وحی الٰہی پر مبنی یا وحی الٰہی سے تصدیق شدہ ہوتا ہے، وہ آسمانی وحی کی رہنمائی کے بغیر کچھ نہیں بولتے ،فرمایا:

﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى﴾ (النجم : ۳ ۴ ۰)

''اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے ، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔''

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گر چہ از حلقومِ عبداللہ بود

ان حقائق سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے رحمت عالم ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وحی کی پہلی قسم وہ ہے جو کلام اللہ کی صورت میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔﴿ وَكَذٰلِكَ أَوۡحَيۡنَا﴾......الخ

شریعت کی اصطلاح میں اسے وحی متلو (تلاوت کی جانے والی وحی ،یعنی وہ وحی جو نماز میں تلاوت کی جاسکتی ہے) کہا جاتا ہے، وحی کی یہ قسم آیاتِ کلام اللہ پر مشتمل ہے، اور قرآن میں لفظ بہ لفظ لکھی گئی ہے۔

(۲) وحی کی دوسری قسم وہ ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وقتاً فوقتاً روزمرہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں حق تعالیٰ کی رضا معلوم کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی، اس کے ذریعہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ اصولوں کی تفصیلات ،تشریحات اور تعبیرات بھی سمجھائی جاتی تھیں، شریعت کی اصطلاح میں اسے ''وحی غیر متلو'' کہا جاتا ہے، وحی کی یہ قسم لوگوں تک لفظ بہ لفظ تو نہیں پہنچی، لیکن پہنچانے والوں نے مرادِ نبوی کی مکمل حفاظت کے ساتھ بعد والوں تک پہنچائی، اسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات واعمال کے ذریعہ ظاہر کیا، وحی کی یہ قسم اگر چہ قرآنِ کریم میں داخل نہیں، مگر قرآن و

حدیث سے اس کا ثبوت ضرور ملتا ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى﴾

مختصر یہ کہ وحی کی قسمیں اگرچہ مختلف ہیں، لیکن دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں، ان دونوں پر عمل ضروری ہے، اور دونوں ہی لازم ملزوم ہیں، اسی کو ایک حدیث میں یوں فرمایا ہے:

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْ كَرِبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "أَلَا! إِنِّیْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ". (أبو داؤد، مشکوٰۃ/ص: ۲۹/ باب الاعتصام بالکتاب والسنة / الفصل الثانی)

آگاہ رہو! مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے۔

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں: ”قرآن وحدیث کی بنیاد براہِ راست فرمانِ باری پر ہے، فرق یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں الفاظ ومعانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اور حدیث میں الفاظ اور تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہیں، پس قرآن وحدیث کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے اور واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔“
(قاموس الفقہ/ص:۳۴۳/۱)

کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مناسبت:

پھر کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مناسبت بھی بہت ہے، جیسے کلام اللہ منزل من اللہ ہے، فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الشعراء: ۱۹۲)

”بے شک قرآن رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔“

تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی منزل من اللہ ہیں:

﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۰)

''اے لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں۔''

کلام اللہ بھی بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے ہے، فرمایا:

﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے۔''

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے تشریف لائے، فرمایا:

﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا﴾ (الأعراف : ۱۵۸)

(اے رسول! ان سے) کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

کلام اللہ رحمت ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (بنی إسرائیل:۸۲)

''اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت کا سامان ہے۔''

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی رحمت ہیں، فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (الأنبیاء/پ:۱۷)

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

کلام اللہ کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ﴾ (الحجر : ۹)

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدة : ٦٧)

''اور اللہ تمہیں لوگوں (کی سازشوں) سے بچائے گا۔''

کلام اللہ کا نزول پیر کو ہوا تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور بھی پیر کو ہوا:

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ صَوْمِ الاِثْنَيْنِ، فَقَالَ: "فِيْهِ وُلِدْتُ، وَفِيْهِ أُنْزِلَ عَلَيَّ". (مسلم، مشكوٰة/ص:١٧٩)

حضور ﷺ سے پیر کے دن روزہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اسی دن میں پیدا کیا گیا ہوں اور اسی دن مجھ پر کتابِ ہدایت اترنی شروع ہوئی۔''

کلام اللہ کی زبان عربی ہے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان بھی عربی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلٰثٍ، لِأَنِّيْ عَرَبِيٌّ، وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ، وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة/ص:٥٥٣/الفصل الثالث)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''عرب سے محبت کرو تین باتوں کی وجہ سے، ایک تو میں عرب میں سے ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، اور تیسرے یہ کہ جنتیوں کی زبان عربی ہے۔''

کلام اللہ دعوت ہے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ داعی ہیں، کلام اللہ ہدایت ہے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہادی ہیں، کلام اللہ نصیحت ہے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ناصح ہیں، کلام اللہ ذکر ہے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مذکّر ہیں:

﴿وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل : ٤٤)

''اور (اے پیغمبر ﷺ!) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے نازل فرمایا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کرو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں۔''

کلام اللہ کی تفصیل وتفسیر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان کی تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تفصیل کلام اللہ نے بیان کی۔

علامہ عبدالرؤف مناویؒ لکھتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں آپ ﷺ کے ایک ایک عضو مبارک کا الگ الگ ذکر فرمایا۔ آپ ﷺ کے چہرۂ انور کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ﴾ (البقرة : ١٤٤)

(اے پیغمبر!) ''ہم تمہارے چہرے کے بار بار آسمان کی طرف اٹھنے کو دیکھ رہے ہیں۔''

آنکھوں کے بارے میں ہے:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (طٰہٰ:١٣١)

''اور دنیوی زندگی کی بہار کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔''

زبان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (مریم : ٩٧)

(اے پیغمبر!) ''ہم نے قرآن کو تمہاری زبان میں آسان بنا دیا ہے۔''

ہاتھ اور گردن کا ذکر ایک ساتھ ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلىٰ عُنُقِكَ﴾ (إسرائیل :٢٩)

''اور آپ اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ کر مت رکھو۔''

سینہ اور پشت مبارک کا ذکر سورۂ الم نشرح میں فرمایا:

﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (الانشراح : ١)

(اے پیغمبر!) ''کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا اور ہم نے تم سے تمہارا بوجھ اتار دیا ہے۔''

اور قلب مبارک کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (الشعراء : ۱۹۳)

''امانت دار فرشتہ اسے لے کر اترا ہے آپ کے قلب پر۔

(مناوی شرح الشمائل علی هامش جمع الرسائل/ص: ٤٥، از تراشے/ص:۲۵)

کلام اللہ علم ہے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل ہیں، کلام اللہ صورت ہے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیرت ہیں، سیدہ عائشہؓ نے اسی کو فرمایا:

''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ''. (مظهری/ص: ۲۹/ مسلم)

اور کلام اللہ کا علم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل سے سمجھا گیا۔

جس نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا وہ کلام اللہ کو دیکھ لے:

صاحبو! اس لیے اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس نے اس دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کی آنکھ سے نہیں دیکھا وہ کلام اللہ کو چشمِ بصیرت سے دیکھ لے، اسے قرآن کے آئینہ میں حضور ﷺ کا سراپا نظر آئے گا، خود صحابۂ کرامؓ کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور دیکھ کر کلام اللہ یاد آتا تھا، چناں چہ دوشنبہ کا روز جس میں آپ ﷺ کا وصال ہوا، اس دن صبح کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرۂ مبارکہ کا پردہ اٹھایا، دیکھا تو صحابہ نمازِ فجر کے لیے صف باندھے کھڑے تھے، یہ منظر دیکھ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور خوشی سے دمکنے لگا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت رخِ انور ایسا معلوم ہورہا تھا: ''كَأَنَّهُ وَرَقَةُ مُصْحَفٍ'' جیسے قرآن کا ورق، سبحان اللہ! سیدنا انسؓ نے کتنی صحیح تشبیہ دی، واقعی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے میں وہی کشش تھی جو کلام اللہ میں ہے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو بھی وہی تقدس حاصل تھا جو کلام اللہ کو حاصل ہے۔

ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا صدیق اکبرؓ کی گود میں آرام فرما رہے تھے، اس کی منظر کشی کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا رحل پر قرآن رکھ کر صدیق اکبرؓ اسے پڑھ رہے تھے، اس لیے کہ صدیق اکبرؓ کی گود رحل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مسعود قرآن معلوم ہو رہا تھا۔

پھر ہمیں یہ کلام اللہ تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ملا ہے، فرمایا:

﴿نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ﴾ (محمد : ۲)

جس نے قرآن ہم کو دیا ہے ☆ صاحب ایمان ہم کو کیا ہے
شکر کریں جتنا بھی، ہے کم ☆ صَلّٰی اللّٰه علیه و سلّم

جنہیں کلام اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے مناسبت ہوگئی وہ راہ یاب ہوگئے:

بہر کیف یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہدایت کے دونوں سرچشموں یعنی کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی سنت) میں مناسبت ہے، لہٰذا جس خوش نصیب کو ان دونوں سے مناسبت ہوگی وہ راہ یاب اور کامیاب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ (آل عمران : ۱۰۴)

"اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) خیر کی طرف بلائیں۔"

یہاں خیر سے مراد کیا ہے؟ خود رحمت عالم ﷺ نے اسے واضح فرمایا کہ "الْخَيْرُ هُوَ اتِّبَاعُ الْقُرْآنِ وَ سُنَّتِيْ". (ابن کثیر) اور خیر کی اس سے جامع مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دین وشریعت اس میں آ گیا۔ (معارف القرآن/ص:۱۴۰/ ج:۲)

خلاصہ یہ ہے کہ جو بھی خیر وخوبی اور کامیابی کا خواہاں ہو، اسے چاہیے کہ کلام اللہ اور

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر کے دونوں سے مناسبت پیدا کر لے، تو وہ منزلِ مقصود کو پالے گا۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً سیدنا طفیل بن عمرو دوسیؓ کا واقعہ ہے، جب یہ مکہ میں آئے تو جہلاءِ قریش نے خوب ڈرایا، کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچنے کی تاکید کی، طفیلؓ کہتے ہیں کہ میں اتنا گھبرا گیا کہ کعبۃ اللہ میں جاتے وقت کانوں میں روئی ٹھونس لی، تا کہ کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سن ہی نہ سکوں، لیکن اللہ کی مرضی کچھ اور ہی تھی، جب طفیلؓ حرم میں داخل ہوئے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاوت کرتے ہوئے پایا، بس پھر کیا تھا؟ قرآن سن کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو گئے، اور کیوں نہ ہوتے؟ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اس میں عجیب تاثیر رکھی ہے، بلا شبہ اس قرآن کے جاننے نہ جاننے، چھونے نہ چھونے، اور دیکھنے نہ دیکھنے کا اختیار تو ہے، لیکن ایک مرتبہ جس نے کلام اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت اور حقانیت جان لی پھر کہنا چاہیے کہ نہ ماننا اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہ ماننے سے ہرگز گریز نہیں کر سکتا، جس ہوا میں خوشبو بس چکی ہو اس کے سونگھنے کے بعد کیا کوئی اس خوشبو کا انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی میں سونگھنے کی طاقت ہی نہ ہو، العیاذ باللہ العظیم، قوتِ شامہ جس کی ماؤف اور ختم ہو چکی ہو پھر اس کے حق میں بہتر سے بہتر خوشبو بھی بے معنیٰ ہے، اسی طرح کسی کے قلب میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہو، پھر اس کے حق میں کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بہترین ہدایت بھی بے معنیٰ ہے۔

یاد رکھو! جیسے موج کے لیے ممکن نہیں کہ سمندر سے الگ ہو کر اپنی ہستی باقی رکھ سکے، شاخ کے لیے ممکن نہیں کہ درخت سے ٹوٹ کر اپنی شادابی قائم رکھ سکے، ذرّہ کے لیے ممکن نہیں کہ آفتاب سے بے نیاز ہو کر اندھیرے میں چمک سکے، اسی طرح ہمارے اور ساری دنیا کے انسانوں کے لیے قیامت تک ممکن نہیں کہ کلام اللہ کے دامن اور اسوۂ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر دینی، دنیوی اور اخروی کامیابی حاصل کر سکیں، ہر طالب ہدایت ونجات

کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے ان دونوں روشن چراغوں سے روشنی حاصل کرنا ضروری ولازمی ہے۔

چراغ دین احمد بجھ رہا ہے، دور ہے ابتر
اسی کو گر جلاؤ گے تو ہوگی روشنی گھر گھر

حق تعالیٰ ہمیں حقائق کے سمجھنے اور کتاب وسنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلّٰى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۳۱)

نامِ نبی ﷺ کے فضائل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ جُبَیۡرِ بۡنِ مُطۡعِمٍؓ قَالَ: "سَمِعۡتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوۡلُ:" إِنَّ لِیۡ أَسۡمَاءً، أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحۡمَدُ، وأَنَا الۡمَاحِیۡ الَّذِیۡ یَمۡحُوۡا اللّٰہُ بِیَ الۡکُفۡرَ، وأَنَا الۡحَاشِرُ الَّذِیۡ یُحۡشَرُ النَّاسُ عَلٰی قَدَمَیَّ، وَأَنَا الۡعَاقِبُ، وَالۡعَاقِبُ الَّذِیۡ لَیۡسَ بَعۡدَہٗ نَبِیٌّ".

(متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۵۱۵/ باب أسماء النبی ﷺ وصفاته/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "میرے متعدد نام ہیں (جن میں سے میرا مشہور نام) میں "محمد" اور "احمد" ہوں اور میں "ماحی" ہوں، کہ حق تعالیٰ میرے ذریعہ کفر کو مٹائیں گے، اور میں "حاشر" ہوں کہ لوگوں کو میرے نقش قدم پر اٹھایا اور جمع کیا جائے گا، اور میں "عاقب" ہوں وہ (شخص جو پیچھے آنے والا ہے) جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (اور ظاہر ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں، لہٰذا میرے بعد کوئی نبی نہیں)

حضور ﷺ کا نام مبارک ایک معجزہ:

بلا شبہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم شروع سے اخیر تک خود ایک معجزہ ہے، بلکہ آپ ﷺ کی سیرت کا ہر ہر جزو اپنے اندر ایک اعجاز و امتیاز رکھتا ہے؛ کیوں کہ بشری وانسانی جتنے

بھی کمالات تصور میں آسکتے ہیں وہ سب کے سب کامل اور مکمل طور پر حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مسعود میں اپنی خاص عنایات سے جمع فرمادیے تھے، اسی لیے آپ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو اگر کسی بھی نقطۂ نظر سے تعصب کی عینک نکال کر دیکھا جائے تو بالیقین آپ ﷺ سراپا کرامات وکمالات کا پیکر ہی نظر آئیں گے اور یہ کوئی شعر وشاعری نہیں، حقیقت ہے، جس کا اظہار شاعرِ اسلام سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس طرح کیا:

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَأَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ فیض ترجمان یوں گویا ہوئی:

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ ☆ کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ ☆ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ

آپ ﷺ کے بے شمار محاسن ومحامد قرآن وحدیث میں موجود ہیں، پھر عجیب بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے وہ جملہ فضائل وخصائص گویا نام مبارک میں جمع فرمادیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماءِ محققین نے آپ ﷺ کے نام مبارک کو بھی معجزات میں شمار فرمایا ہے کہ ہزاروں سالوں سے آج تک نام مبارک فضاؤں، خلاؤں، ہواؤں، جنگلوں، صحراؤں سمندروں، شہروں اور وادیوں میں اذانوں، تکبیروں اور نمازوں میں مسلسل گونجتا ہے اور قیامت تک گونجتا ہی رہے گا، اسے ایک معجزہ نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟

حضور ﷺ کے ذاتی اور صفاتی نام:

نام مبارک کے اعجاز وخصوصیات کی مزید تفصیلات اس طرح ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی نام دو ہیں: (۱) محمد (۲) احمد۔

اور صفاتی نام بہت سے ہیں، قرآنِ کریم میں چار مقامات پر نام محمد اور ایک مقام پر

نام احمد زینت بنا ہے، فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ (آل عمران : پ:٤)

’’اور محمد ایک رسول ہی تو ہیں۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (الأحزاب : ٤٠)

’’اور محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔‘‘

تیسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مَحَمَّدٍ﴾ (محمد : ٢)

’’اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے نیک عمل کیے ہیں اور ہر اس بات کو دل سے مانا ہے جو محمد پر نازل کی گئی ہے۔‘‘

چوتھے مقام پر فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ﴾ (الفتح : ٢٩)

’’محمد اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

اور نام احمد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ أَحْمَدُ﴾ (الصف : ٦)

’’اور اس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے۔‘‘

نام احمد کے متعلق علماء نے فرمایا کہ ’’عرب میں آپ ﷺ سے قبل محمد نام کے اور بھی گذرے، مگر احمد بجز آپ ﷺ کے اور کسی کا نام نہیں ہوا‘‘۔ (انوار القرآن/ ج:۱۱/ص:۴۰۶)

پھر یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نام مبارک کا یہ ذکر خطاب کے انداز میں نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے منصب نبوت کی فضیلت،

ختمِ نبوت کی اہمیت اور وفادار و جاںنثار صحابہؓ کی عظمت کے تحت کیا ہے، اور جہاں خطاب کرنا مقصود تھا وہاں شانِ رفعت کو ظاہر کرنے کے لیے صفاتی نام سے ذکر کیا، کہیں "طٰہٰ" فرمایا، کہیں "یٰسٓ" فرمایا، کہیں "یاایھاالنبی" فرمایا، کہیں "یاایھا المزمل" فرمایا، کہیں "یاایھا المدثر" فرمایا، ان کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صفاتی نام بہت ہیں، کیوں کہ صفاتی نام شخصی خوبیوں اور صفتوں کی ترجمانی کرتے ہیں، اور آپ ﷺ کی ذات تو جامع صفات ہے، اس اعتبار سے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر صفت اور وصف کے لیے ایک ایک نام ہو تو کل صفات و اوصاف کی بنا پر صفاتی نام بھی یقیناً بے شمار ہوں گے، مگر حدیث مذکور میں آپ ﷺ نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ذاتی اور کچھ صفاتی ناموں کا ذکر کیا۔

نامِ نبی ﷺ کو اعجازِ لفظی و تاثیرِ معنوی حاصل ہے:

فرمایا: "إِنَّ لِيْ أَسْمَاءً، أَنَا مُحمدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ" میرے متعدد نام ہیں: میں محمد بھی ہوں، احمد بھی ہوں۔ غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ آپ ﷺ کے ذاتی و صفاتی نام محض رسمی نہیں ہیں، کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا، اور احباب و اصحاب نے جس صفت و لقب سے چاہا پکار لیا، نہیں، بلکہ ان ناموں کا آپ ﷺ کی زندگی، اخلاق اور اعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، مثلاً نام احمد و محمد کو لیجیے، ان دونوں ناموں کو اعجازِ لفظی و تاثیرِ معنوی حاصل ہے، دونوں ناموں کا اصل مادہ ایک ہے اور وہ ہے: ''حمد''، عجیب بات یہ ہے کہ ''احمد'' کا پہلا حرف اور محمد کا بھی پہلا حرف ہٹائیں تو ''حمد'' ہی باقی رہ جاتا ہے، ''حمد'' لغت میں حق تعالیٰ کی تعریف و توصیف اور تحمید و تسبیح بیان کرنے کو کہتے ہیں، نیز کسی کے اخلاقِ حمیدہ اوصافِ پسندیدہ اور احوالِ اصلیہ کو محبت، عظمت اور عقیدت کے ساتھ بیان کرنا بھی حمد کہلاتا ہے۔

"مُحَمَّدٌ" حَمَّدَ کا اسم مفعول ہے، بمعنیٰ بہت تعریف کیا ہوا، اور "أَحْمَدُ" اسم تفضیل ہے، بمعنیٰ سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔

ایک طرف بندوں میں اللہ جل شانہ کا بندہ اور پیغمبروں میں اللہ جل شانہ کا پیغمبر

ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ اللہ جل شانہ کی تعریف وتوصیف اور حمد وثنا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''احمد'' ہوئے، تو دوسری طرف اللہ جل شانہ کی ذات پاک کے بعد ساری کائنات کی مخلوق میں سب سے زیادہ تعریف و توصیف اور حمد وثنا رحمت عالم ﷺ کی گئی ہے، اس لیے آپ ''محمد'' ہوئے، یا یوں کہیے کہ اللہ جل شانہ کی جس نے سب سے زیادہ حمد کی وہ ''احمد'' ہے، اور اللہ جل شانہ نے جس کی سب سے زیادہ حمد کی وہ ''محمد'' ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں۔

خدا در انتظارِ حمدِ مانیست ☆ محمد چشم بر راہِ ثنا نیست

خدا حمد آفرین مصطفیٰ بس ☆ محمد حامدِ حمدِ خدا بس

مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد ☆ بہ بیتے ہم قناعت می تواں کرد

محمد! از تو می خواہم خدا را ☆ خدایا! از تو حبِ مصطفیٰ را

یعنی اللہ تعالیٰ ہماری تعریف کے انتظار میں نہیں، نہ حضور ﷺ ثنا کے منتظر ہیں۔

حضور ﷺ کی ثنا کے لیے پیدا کرنے والا کافی ہے، اللہ کی تعریف کے لیے حضور ﷺ کافی ہیں۔

اگر تم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے مناجات کرنا چاہتے ہو تو ایک شعر پر بھی قناعت کر سکتے ہو۔

کہ حضور! آپ سے تو میں اللہ تعالیٰ کو طلب کرتا ہوں، اور اے اللہ! آپ سے حبِّ مصطفیٰ کو۔

''احمد'' وہ ہے جس نے رب السمٰوٰت والارض کی تمام زمین وآسمان والوں سے زیادہ حمد کی اور ''محمد'' وہ ہیں جن کی آسمانوں اور زمینوں میں سب سے زیادہ حمد ہوئی، رحمت عالم ﷺ احمد الحامدین بھی ہیں اور احمد المحمودین بھی، صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اَلْفَ اَلْفِ مَرَّۃٍ وَ بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ.

اسم الٰہی اور نام مصطفیٰ میں مماثلت:

نام نبی کی نسبت شاعر اسلام کا فیصلہ ہے کہ:

وَ شَقَّ لَهٗ مِنَ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ

اللہ جل شانہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وعزت افزائی کے لیے اپنے نام سے آپ ﷺ کا نام نکالا، پس عرش والا محمود ہے تو آپ محمد ہیں، شاید اسی بنا پر عارفین اور محققین نے اللہ جل شانہ کے ذاتی نام اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی نام میں مماثلت ومناسبت بیان فرمائی ہے، مثلاً (۱) ''اللہ'' کے حروف چار ہیں تو ''محمد'' کے حروف بھی چار ہیں۔ (۲) ''اللہ'' کے نام میں تشدید ہے تو ''محمد'' کے نام میں بھی تشدید ہے۔ (۳) ''اللہ'' کے نام میں نقطہ نہیں تو ''محمد'' کے نام میں بھی نقطہ نہیں۔ (۴) ''اللہ'' کے نام میں دو حرف عشرات (ل ل) ہیں، تو ''محمد'' میں بھی دو حرف عشرات (م م) ہیں۔ (۵) ''اللہ'' کا نام لیں تو دونوں ہونٹ علاحدہ ہو جاتے ہیں، ''محمد'' کا نام لیں تو دونوں ہونٹ مل جاتے ہیں، لیکن اللہ کا نام لیتے وقت دونوں ہونٹ کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا خالق اور مخلوق میں فاصلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، جب کہ ''محمد'' کی پہلی میم یہ فاصلہ مٹاتی ہے اور دوسری میم خالق سے ملاتی ہے۔ گویا بتلا دیا کہ یہی مبارک نام ہے جو بندہ کو مولیٰ سے، مخلوق کو خالق سے، عابد کو معبود سے، ساجد کو مسجود سے اور سب کو رب سے ملاتا ہے۔

نامِ محمد کتنا پیارا، ذاتِ گرامی کتنی عالی
اللہ اللہ خلقِ معظم، صلی اللہ علیہ وسلم

نامِ نبی کے اسرار ورموز:

نام نبی اتنا بابرکت ہے کہ اس کا ہر ہر حرف بامعنی ہے۔ عاشقین نے نام نبی کے

اسرار و رموز میں عجیب و غریب نکتے بیان کیے ہیں، مثلاً لفظ ''محمد'' چار حروف کا مجموعہ ہے اور ہر ہر حرف کا مستقل معنی اور مفہوم مراد لیا گیا، چناں چہ:

(۱) ''محمد'' کی میم کا ایک معنی مٹانا مراد لیا ہے۔ اور حدیث بالا میں آپ ﷺ کا صفاتی نام ''ماحی'' ہے، جس کے معنی ہیں مٹانے والا، حق تعالیٰ نے کفر، شرک، بدعت، جہالت، معصیت، فسق و فجور اور ہر قسم کا ظلم و ستم آپ ﷺ کے ذریعہ مٹایا، اسی لیے آپ ﷺ ''ماحی'' ہوئے، جس کی طرف ''محمد'' کی میم سے اشارہ کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

(۲) ''محمد'' کی حا کا ایک معنیٰ حکم الٰہی مراد لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کی ہم کو پہچان کرانے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ہیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا:

﴿مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ﴾ (الحشر:۷)

''اور رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد مصطفیٰ ﷺ تمہیں جو کچھ حکم دیں اسے کرو اور جس سے منع کردیں اس سے بچو، تو حیاتِ ابدی میں کامیابی ملے گی۔ بعض نے حاء سے آپ کا حبیب اللہ ہونا مراد لیا ہے، تو وہ بھی صحیح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، تو ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حبیب اللہ تھے، یہ قرآن کا فیصلہ ہے:

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (آل عِمرَان: ۳۱)

(محبوبم!) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ پیارے! آپ تو ہمارے محبوب ہیں ہی، ہم تو اس کو بھی اپنا محبوب بنالیں گے جو آپ کے نقشِ قدم پر چلے گا، سبحان اللہ۔

حدیث بالا میں آپ کا ایک صفتی نام ''حاشر'' بتلایا، جس کا مفہوم یہی ہے کہ آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلا جائے، ''محمد'' کی حاء سے اس طرف اشارہ کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

(۳) ''محمد'' کی میم ثانی کا ایک معنیٰ مغفرت مراد لیا گیا ہے، قرآنِ کریم نے

آپ ﷺ کی مغفرت کی بشارت کا اعلان کیا ہے:

﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ (الفتح: ۲)

''تا کہ اللہ آپ کی اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کردے۔''

لیکن آپ ﷺ کو اپنی اس مغفرت کے بعد امت کی مغفرت کا غم اور فکر ہر وقت سوار رہتا تھا، کبھی کبھی تو ساری رات امت کی بخشش ومغفرت کی طلب میں گذار دیتے۔

اللہ کے آگے رو رو کر خلوت میں دعائیں بخشش کی
ہم خاک نشینوں کے خاطر راتوں کو عبادت ہوتی ہے

جب حق تعالیٰ نے ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ (الضحیٰ: ۵) میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حساب عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تو حدیث میں ہے کہ آیت کریمہ کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''میں تو اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک اپنی امت (مسلمہ) میں سے ہر شخص کو (مغفرت کے بعد) جنت میں داخل نہیں کرالوں گا۔ (تفسیر عزیزی جدید/ص:۵۰۳)

شفاعت کی تیرے رحمت کدے سے ابتدا ہوگی
اسی پر امتوں کی مغفرت کی انتہا ہوگی

''محمد'' کی دوسری میم سے اسی مغفرت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

(۴) ''محمد'' کے آخری حرف ''دال'' کا ایک معنیٰ دینِ حق کی دعوت ہے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس عظیم مشن ہی میں صرف ہوئی، دینِ حق کو لوگوں تک پہنچانے میں کوئی کمی اور کسر نہیں چھوڑی، کسی کے در پے تو کسی کے دل پر دستک دی، ایک گھڑی اطمینان نہیں، ایک ساعت آرام نہیں، ایک پل چین نہیں، ہر وقت بس ایک ہی فکر اس داعی اعظم کو دامن گیر تھی کہ اللہ تعالیٰ کے بندے دعوت الی اللہ قبول کرلیں، تا کہ انہیں ہدایت مل جائے، حتیٰ کہ دعوتی میدان میں آپ ﷺ کی ذہنی وقلبی کیفیت اور دعوت الی اللہ کی تڑپ

کو دیکھ کر خود حق تعالیٰ نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا:

﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الشعراء : ۳)

''شاید آپ اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جارہے ہیں کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے۔''

کبھی فرمایا:

﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ (الغاشية : ۲۲)

''آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لیے مسلط نہیں کیا گیا۔''

کبھی فرمایا:

﴿ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى ﴾ (طٰهٰ : ۲)

''ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف اٹھائیں۔''

بلا شبہ آپ ﷺ نے دعوت الی اللہ کا حق ادا کر دیا، چناں چہ نامِ محمد (ﷺ) کا آخری حرف ''دال'' اس پر دلالت کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسم بامسمّٰی تھے، اور آپ ﷺ کے اسماءِ طیبہ آپ ﷺ کے کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

نامِ نبی کی عظمت پر واقعہ:

نام نبی کی اسی عظمت کے پیش نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جس طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اسی طرح آپ ﷺ کے نام کو بھی تمام مخلوق کے ناموں پر فوقیت وفضیلت عطا فرمائی ہے، اسی لیے عاشق صادق کہتا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

تاریخ میں منقول ہے کہ بادشاہ ناصرالدین محمود کے ایک خاص مصاحب کا نام

''محمد'' تھا، بادشاہ اسے اس نام سے پکارا کرتا تھا، ایک دن ایسا ہوا کہ بادشاہ نے اسے خلافِ معمول ''محمد'' کے بجائے تاج الدین کہہ کر آواز دی، وہ تعمیلِ حکم میں حاضر ہوگیا، لیکن بعد میں گھر جا کر تین دن تک نہیں آیا، بادشاہ نے بلاوا بھیجا اور تین دن تک غائب رہنے کی وجہ دریافت کی، تو اس نے کہا: ''آپ ہمیشہ مجھے ''محمد'' کے نام سے پکارا کرتے ہیں، لیکن اس دن آپ نے ''تاج الدین'' کہہ کر پکارا، اس سے میں نے سمجھا کہ کہ آپ کے دل میں میرے متعلق کوئی خلش پیدا ہوئی ہے، اس لیے میں تین دن حاضر خدمت نہ ہوسکا'' ناصر الدین نے کہا: ''واللہ! میرے دل میں تمہارے متعلق کسی قسم کی کوئی خلش نہیں، ''تاج الدین'' کے نام سے تو میں نے اس دن اس لیے پکارا تھا کہ اس وقت میرا وضو نہیں تھا، اور مجھے ''محمد'' کا مقدس نام بغیر وضو کے لینا مناسب معلوم نہیں ہوا۔''

(تاریخ فرشتہ/ص:۲۷۶/۱، از کتابوں کی درس گاہ میں/ص:۲۶)

اسی طرح ایک اور واقعہ منقول ہے کہ اورنگ زیب عالم گیرؒ کے ایک خادم کا نام ''محمد حسن'' تھا، عالم گیرؒ اسی نام سے پکارا کرتے تھے، ایک مرتبہ ''حسن'' کہہ کر پکارا تو وہ خادم فوراً وضو کا پانی لے کر حاضر ہوا، کسی نے دریافت کیا کہ تم کو کیسے پتہ چلا کہ بادشاہ کو وضو کی ضرورت ہے؟ تو عرض کیا: ''بادشاہ کی عادت ہے کہ وہ بغیر وضو کے ''محمد'' کا نام نہیں لیتے، آج جب مجھے ''حسن'' کہہ کر پکارا تو میں سمجھ گیا کہ بادشاہ کا وضو نہیں ہے، اس لیے وضو کا پانی لے کر حاضر ہوگیا۔

سبحان اللہ! نام نبی کی کتنی عظمت کی گئی اور اس کا حق بھی یہی ہے، اس لیے کہتے ہیں:

دونوں عالم کا تجھے مطلوب گر آرام ہے
ان کا دامن تھام لے جن کا محمد نام ہے

نامِ نبی کی برکت:

نام نبی کی فضیلت اور برکت سے متعلق ایک عجیب وغریب روایت (مدارج

النبوۃ/ص:۶ ۲۴/۱) میں منقول ہے، حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’قیامت کے دن دو (ایمان والے) شخص دربارِ الٰہی میں پیش کیے جائیں گے، حکم ہوگا: ’’انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے‘‘ اس فیصلہ پر خود ان دونوں کو بہت ہی تعجب ہوگا، عرض کریں گے: ’’ربِ کریم! ہمارے اعمال تو ایسے نہ تھے، پھر یہ انعام واکرام کا معاملہ کس لیے کیا جارہا ہے؟‘‘ حکم ہوگا: ’’جنت میں داخل ہو جاؤ! مجھے اپنی کبریائی کی قسم ہے، میرے جس بندے کا نام محمد اور احمد ہوگا اسے جہنم کی آگ میں (ہمیشہ کے لیے) نہ ڈالوں گا۔‘‘ ......العظمة للّٰه. (از: صدائے محراب/ص:۱۸۲)

سچ ہی کہا ہے:

محشر میں گنہگاروں کے لیے دامن کا سہارا کافی ہے
ارے دامن تو بڑی چیز ہے، مجھ کو تو نامِ محمد کافی ہے

اور صحیح ہے:

خاکِ مدینہ خاکِ شفا ہے ☆ وجہِ سکون ہے ذکر مبارک
نام نبی ہر زخم کا مرہم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
نام ہے ان کا قریہ قریہ ☆ ذکر ہے ان کا عالم عالم
یاد میں ان کی چشم ہے پرنم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
دکھی دلوں کا درماں وہ ہیں ☆ ہم جیسوں کے شافع وہ ہیں
بعد خدا کے وہ ہیں ارحم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
فرش پہ بیٹھے عرش کی باتیں ☆ رب کی ان پر خاص ہے رحمت
رحمت عالم راحت عالم ☆ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کے نام، کام، کلام اور تمام احکام کی عظمت اور ان پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهُ.

(۳۲)
میلاد النبی ﷺ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَـنۡ أَبِیۡ قَـتَادَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ”سُئِلَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ عَنِ صَوۡمِ الۡاِثۡنَیۡنِ، فَقَالَ: ”فِیۡہِ وُلِدۡتُّ، وَفِیۡہِ أُنۡزِلَ عَلَيَّ“. (مسلم، مشکوٰۃ/ص۱۷۹/ باب صیام التطوع/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں پیر ہی کے دن پیدا ہوا ہوں اور پیر ہی کے دن مجھ پر قرآن کا نزول ہوا۔“

باغِ عالم میں عجب تازہ بہار اک آئی:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بڑے بڑے ہادی اور رہبر روئے زمین کے مختلف خطوں اور حصوں میں آئے اور اپنی اپنی ذمہ داری ادا کر کے چلے گئے، اس کے بعد تقریباً پانچ سو سال کی طویل مدت تک انسانیت آسمانی ہدایت سے محروم رہی، جس کا اثر یہ ہوا کہ سطحِ زمین پر آباد انسانیت پر کفر وضلالت اور شرک و جہالت کی مکمل سیاہی اور تاریکی رات کی طرح چھا گئی، پھر یہ کسی ایک ملک کی تخصیص نہیں، بلکہ آفتاب کے نکلنے کی جگہ مشرق اور ڈوبنے کی جگہ مغرب، شمال وجنوب، عرب وعجم، تقریباً کائناتِ انسانی کی ساری فضا پر نفس پرستی، بدی

وبدکاری، بداعتقادی اور بداخلاقی کے گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، باغِ عالم سنسان سا پڑا ہوا تھا، دنیا دوزخ بنی ہوئی تھی۔

﴿وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (آل عمران : ۱۰۳)

''اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔''

یہ تصریحات اس پاک کتاب کی ہیں جو ہر قسم کے مغالطہ، مبالغہ اور افراط وتفریط سے پاک ہے، جس کا ایک ایک حرف صداقت وحقیقت کے اونچے سے اونچے معیار کا نمونہ ہے۔ ایسی ظلمت کے عالم میں نورانیت وروحانیت کا آفتاب اور صداقت و ہدایت کا روشن سورج یعنی آمنہ کا لال اور درِ یتیم کی شکل میں (ایک قول کے مطابق) ۲۲/ اپریل ۵۷۱ء: ۹/ ربیع الاول پیر کو علی الصبح طلوع ہوا، میلاد النبی کا وقت بھی صبح صادق تھا، اور نبی بھی صادق تھا۔
(علامہ سید سلیمان ندویؒ اور محمود پاشا فلکیؒ کی تحقیق، الرحیق المختوم/ص:۸۳)

بعض مفسرین کا قول ہے کہ ارشاد باری: ﴿وَ الضُّحٰى وَ اللَّيْلِ إِذَا سَجٰى﴾ میں ''ضحیٰ'' سے مراد آپ ﷺ کا یومِ میلاد ہے، اور ''لیل'' سے مراد شب معراج ہے۔
(تفسیر عزیزی جدید/ص:۵۰۰)

لائے تشریف جہاں میں وہ رسولوں کے رسول
بن کے جبرئیل امین جن کے رضا کار آئے
باغِ عالم میں عجب تازہ بہار اک آئی
چہچہے کرتے ہوئے طائر گلزار آئے

اور:

ہر سو آثارِ سحر پیدا ہیں، اب رات کا جادو ٹوٹ چکا
ظلمت کے بھیانک ہاتھوں سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا

واقعی آپ ﷺ کے آنے سے دنیا میں ایک بہار اور بے جان دنیا میں جان آگئی، آپ ﷺ تشریف لائے تو دنیا میں قرآن آیا، دین اسلام آیا، صدیق رضی اللہ عنہ آئے، فاروق رضی اللہ عنہ

آئے، ذوالنورینؓ آئے، شیرِ خداؓ آئے، صحابہؓ آئے، تابعینؒ آئے، تبع تابعینؒ آئے، قطبؒ آئے، ابدالؒ آئے، اولیاءِ کرامؒ آئے اور ائمہ عظامؒ آئے، آپ ﷺ کیا آئے باغِ عالم میں ہر سو بہار آئی۔

ربیع الاول کی فضیلت:

صاحبو! رمضان کا مہینہ مقدس اور محترم ہے، اس لیے کہ اللہ جل شانہ کا پیام اس مہینہ میں نازل ہوا تو ربیع الاول کا مہینہ بھی مقدس اور محترم ہے، اس لیے کہ اللہ جل شانہ کے پیغمبر کا ظہور اس مہینہ میں ہوا، ماہِ صیام قابلِ احترام ہے، کیوں کہ اس میں فرقانِ مکتوب (علمی قرآن) کا نزول ہوا، تو ماہِ ربیع الاول بھی لائق احترام ہے، کیوں کہ فرقانِ ناطق (عملی قرآن) کا نزول اس مہینہ میں ہوا، رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی کتاب کلام اللہ کا نزول ہوا، تو ربیع الاول میں اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول ہوا۔

لِهٰذا الشَّهْرِ فِیْ الإِسْلَامِ فَضْلٌ ☆ وَمَنْقَبَةٌ تَفُوْقُ عَلَى الشُّهُوْرِ

رَبِيْعٌ فِیْ رَبِيْعٍ فِیْ رَبِيْعٍ ☆ وَنُوْرٌ فَوْقَ نُوْرٍ فَوْقَ نُوْرٍ

یعنی ربیع الاول کی اسلام میں ایک خاص فضیلت ہے اور ایسی منقبت ہے جو بعض حیثیت سے تمام مہینوں سے بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ حضور ﷺ کا وجودِ با جود (ولادت) خود بہار، پھر ولادت کا مہینہ بھی ربیع، جس کے معنیٰ بہار کے ہیں؛ کیوں کہ اسلام سے قبل جب اِس مہینہ کا نام رکھا گیا تو یہ دن موسم بہار کے تھے۔ موسم کی آمد چوں کہ شمسی کلینڈر سے ہوتی ہے، اس لیے ہجری تقویم میں ہمیشہ بہار کا مہینہ ایک ہی نہیں رہتا، بلکہ مہینے بدلتے رہتے ہیں، لیکن اس مہینہ سے قدرتی طور پر کچھ ایسی یادیں وابستہ ہوگئیں کہ یہ مہینہ واقعی پر بہار بلکہ سدا بہار ہوگیا۔ اسی ماہِ مبارک میں میلاد النبی، ہجرۃ النبی اور وفات النبی ﷺ جیسے اہم واقعات پیش آئے، اِس موسمِ سدا بہار میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بہار آئی کہ

اجڑا ہوا باغِ عالم دوبارہ پھر سرسبز وشاداب ہوگیا، اور جیسے آفتاب کے طلوع ہوتے ہی شب کی سیاہی مٹ جاتی ہے اسی طرح آفتابِ ہدایت کے طلوع ہوتے ہی جہالت وضلالت کی تاریکی مٹ گئی۔ آپ ﷺ کے نور سے سارا عالم منور اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ روشن ہوگیا۔

آمد ان کی نعمت نعمت، ان کا سراپا رحمت رحمت
ہرسو، ہرجا، ہردن، ہردم، صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
جسم مزکی روحِ منور، قلب مجلیٰ نورِ مقطر
حسن سراپا خیر مجسم، صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
طینت جس کی سب سے مطہر، بعثت جس کی سب سے مؤخر
خِلقت جس کی سب پہ مقدم، صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
جس کی ہَر اوَلْ فوجِ سلیماں، جس کے منادی موسیٰ عمراں
جس کے مبشر عیسیٰ مریم، صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

قرآن پاک میں فرمایا:

﴿قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (المائدة: ١٥/ ١٦)

''تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشنی آئی ہے اور ایک ایسی کتاب جو حق کو واضح کر دینے والی ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھلاتا ہے جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، اور انہیں اپنی توفیق سے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔''

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں نور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (کا باطنی نور) مراد ہے۔ (جلالین شریف/ ج:۱/ص:۹۷)

دنیا والو! خوش ہو جاؤ! ربِ رحیم وکریم جو دنیوی اور جسمانی نشو نما اور ہماری زندگی کی تکمیل کے لیے ہر صبح سورج کو چمکاتا ہے، اس نے ہماری روحانی واخروی زندگی کی تسکین کے لیے آفتابِ رسالت کو روشن کیا۔

وُلِدَ الْهُدٰى فَالْكَائِنَاتُ ضِيَآءٌ
وَفَمُ الزَّمَانِ تَبَسُّمٌ وَّ ثَنَاءٌ

میلاد النبی منانے کا نہیں، سیرت النبی ﷺ اپنانے کا حکم ہے:

واقعی میلاد النبی کی خوشی اتنی عظیم ہے کہ اس کے برابر کوئی خوشی نہیں؛ کیوں کہ بقول حضرت تھانویؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تمام دینی ودنیوی نعمتوں کی اصل بنی؛ اس لیے اس کی خوشی فطری چیز ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خوشی دو طرح کی ہے:

(۱) دینی۔ (۲) دنیوی۔ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی دنیوی نہیں، بلکہ دینی ہے؛ لہٰذا ایسے طریقہ سے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی منانا جس کا دینی اور شرعی اعتبار سے ثبوت نہ ہو اس کی اجازت کسی کے لیے نہ ہوگی، مثلاً میلاد النبی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ پیدائش (Birth Day) منانا، جیسا کہ کرسچن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یومِ پیدائش کرسمس ڈے کے نام سے ۲۵/ دسمبر کو مناتے ہیں۔ ہمارے یہاں قطعاً اس کی اجازت نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ حدیث میں نصاریٰ اربابِ خسارہ یعنی عیسائیوں جیسی حرکت کرنے سے منع فرمایا گیا:

عَنْ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَاتُطْرُوْنِیْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهٗ، فَقُوْلُوْا: "عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ". (متفق علیه، مشکوٰة/ص:۴۱۷)

تم میرے ساتھ مبالغہ کا معاملہ نہ کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم کے ساتھ کیا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

اس میں آپ ﷺ نے عیسائیوں والی حرکت سے منع فرمایا، تو اس کے دو مطلب

ہو سکتے ہیں: (۱) جیسے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محبت میں عبدیت سے نکال کر الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا، کہیں تم ایسا نہ کرنا۔ (۲) جیسے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات و ہدایات کو فراموش کر دیا اور ان کی میلاد اور نام پر محض ظاہری مظاہروں پر اکتفاء کیا۔ (جیسے ان کا یومِ پیدائش منانا) کہیں تم بھی میرے ساتھ وہ معاملہ نہ کرنا۔

مگر افسوس! ان کی دیکھا دیکھی بعض مسلمانوں نے بھی میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جشن اور جلوس شروع کر دیے، اب جو لوگ اس بہانے اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں ان سے تو اس وقت کوئی کلام نہیں، عاجز کی گفتگو ان لوگوں سے ہے جو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ہی کے پیشِ نظر یہ سب کچھ کرتے ہیں، انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اکثر محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ بارہ ربیع الاول آپ ﷺ کا یومِ ولادت ہی نہیں بلکہ یومِ وفات بھی ہے، لہٰذا جو لوگ اس دن جشن مناتے ہیں انہیں سو بار سوچنا چاہیے کہ وہ غیر شعوری طور پر حضور ﷺ کی وفات کا تو جشن نہیں مناتے۔ علاوہ ازیں پیغمبرِ اسلام ﷺ کو دوسرے مذاہب کے مقتداؤں اور پیشواؤں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟'' اسلام نے جہاں ہمیں اپنے اکابر کی تعظیم برقرار رکھنے کا حکم دیا وہیں اس اصلی مقصد کی طرف بھی متوجہ کیا جس کے لیے یہ اکابر دنیا میں تشریف لائے، پھر کتاب وسنت سے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعثتِ نبوی کا اصلی مقصد جو ثابت ہے اور جس کا حکم ہے وہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کا نہیں، بلکہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنانے کا ہے۔

میلاد النبی ﷺ کے جشن اور جلوس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ اور اولیاءؒ کے زمانہ میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ انہوں نے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جشن منایا ہو اور جلوس نکالا ہو، حالاں کہ وہ ہم سے زیادہ حضور ﷺ سے محبت کرتے تھے، عشقِ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ ہم سے کامل تھے، تعظیمِ

مصطفیٰ ﷺ ہم سے بڑھ کروہ کرتے تھے، اس کے باوجود کبھی انہوں نے نہ میلا دالنبی کا جشن منایا نہ جلوس نکالا، وجہ یہ ہے کہ بعثت کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۲۳ سال دنیا میں رہے، اس طویل عرصہ میں کوئی مسئلہ اور جزئیہ ایسا نہیں جس کی طرف آپ ﷺ نے مکمل رہبری نہ فرمائی ہو، اگر میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جشن منانا اور جلوس نکالنا شرعی اور دینی معاملہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف ضرور بالضرور رہنمائی فرماتے، لیکن نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں کوئی حکم فرمایا اور نہ صحابہؓ نے ایسا کیا، جب کہ ان کے زمانے میں یہ دن بار بار آیا، چناں چہ سیدنا صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دِن دومرتبہ آیا، سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دِن دس مرتبہ آیا، سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانے میں میلا دالنبی کا دِن بارہ مرتبہ آیا، سیدنا علی مرتضیٰؓ کے زمانے میں میلا دالنبی کا دِن پانچ مرتبہ آیا، تابعینؒ کے زمانے میں آیا، محدثینؒ کے زمانے میں آیا، ائمۂ مجتہدینؒ کے زمانے میں آیا، بزرگانِ دین کے زمانے میں آیا، لیکن انہوں نے نہ جلوس نکالا نہ جشن منایا، اب اگر آج کچھ ناواقف لوگ دین کے نام پر میلا دالنبی ﷺ کا جشن منائیں اور جلوس نکالیں تو اس کی کیوں کر اجازت ہوسکتی ہے؟ قرآن کہتا ہے:

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ اللَّهُ﴾ (الشوریٰ: ۲۱)

”کیا ان کے شرکاء ہیں؟ کہ انہوں نے ان کے لیے دین کی وہ بات مقرر کردی جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔“

جشنِ میلا دالنبی کی ابتداء:

تاریخِ اسلام کا تحقیقی جائزہ لیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ اسلامی تاریخ کی چھ صدیوں تک تو اس کا کوئی وجود اور ثبوت نہیں ملتا، سب سے پہلے ۶۰۴ھ میں موصل (عراق) کے شہر میں مظفر الدین کوکری ابن اریل نے اپنی ملکی سیاست کو محفوظ اور حظِّ نفس (نفس کی خوشی) کا راستہ ہموار کرنے کی غرض سے رعیت کی سادگی اور مذہبی شوق سے

ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانا شروع کیا، اس کے متعلق حضرت احمد ابن محمد مالکیؒ فرماتے ہیں: ''وہ مسرف بادشاہ تھا''۔ ''یَحْتَفِلُ مَوْلِدَ النَّبِیِّ ﷺ فِی الرَّبِیْعِ الْاَوَّلِ، وَهُوَ اَحْدَثَ مِنَ الْمُلُوْكِ هٰذَا الْعَمَلَ''. (القول المعتمد فی عمل المولد)

وہ ربیع الاول میں میلاد النبی مناتا تھا اور بادشاہوں میں وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔ ''وہ ہر سال ان دنوں جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیت المال اور رعایا کے مال سے علامہ ذہبیؒ کے بقول تقریباً تین لاکھ روپئے خرچ کیا کرتا تھا''۔

(از: المنہاج الواضح یعنی راہِ سنت/ص:۱۶۲)

میلاد النبی ﷺ، صحابہؓ اور ہم:

صاحبو! اس اظہارِ حقیقت پر آپ برا نہ مانئے! تاریخ اسلام کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان ان ظاہری رسموں اور رسمی مظاہروں سے کوسوں دور تھے، ان کے یہاں میلاد النبی کے جلوس اور سیرتِ نبی کے جلسوں کا تصور بھی نہ تھا، اس کے باوجود سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان اور زندگی کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئی تھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے اخلاق کا درس حاصل کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاص سے ہر قول اور عمل میں اخلاص سیکھا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایثار اور قربانی سے دین پر مر مٹنے کا جذبہ اور حوصلہ پایا تھا، پوری زندگی ان کی سیرت النبی اور عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بیٹھ جاتے وہیں سیرت النبی کی مجلس سج جاتی تھی، وہ جو کام کرتے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا تھا، ان کے دل و دماغ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت کے جو ایمانی وعرفانی چراغ روشن تھے ان کے آگے آج میلاد النبی کے نام پر ہونے والی روشنیوں کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میلاد النبی کا جلوس اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلسہ ان کے لیے کوئی قصۂ پارینہ (پرانا قصہ) ہرگز

نہ تھا، کہ اس کی یاد منا منا کر اسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہوتی، ان کی ہر ادا سے سیرت وسنت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مگر اب کیا کیجیے گا؟ یہ نفسِ انسانی کی پرانی خصلت رہی ہے کہ جب کسی حقیقت کو اختیار کرنا اس کی آرام طلب طبیعت پر بار ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، تو چند رسمی مظاہروں میں پناہ لینے کے بعد اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے کر اس کو مطمئن کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس طرزِ عمل سے دل کو یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ ظاہری جلوس میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے نمائشی طریقے ہی حقیقت کے عین مطابق ہیں، اس کے علاوہ عملی وایمانی کارناموں کی ضرورت نہیں۔

چناں چہ اس وقت بہت سے لوگ غفلت میں ڈوب کر بزعم خود محبت سمجھ کر سیرت النبی اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں یہ اسی کا ایک حصہ اور اسی سوچ کی واضح تصویر ہے، حالاں کہ سیرت النبی اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی روح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں، بلکہ اس کے ساتھ کھلا مذاق ہے، اس لیے ہمارا اصل کام جشن میلاد النبی کے ان رسمی مظاہروں کے بجائے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف توجہ دینا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک مہینہ اور اس میں بھی شروع کے ۱۲ دن یا خاص بارہ ربیع الاول میں ''میلاد النبی ﷺ'' یا سیرت النبی ﷺ کے عنوان پر محفل منعقد کر کے فارغ ہو جانے کے بجائے اپنی پوری زندگی اور زندگی کے ہر شعبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کے سانچے میں ڈھالنا ہے، ضرورت ہے تو اسی کی ہے، نہ چراغوں کی، نہ جھنڈیوں کی، نہ سجاوٹ، نہ بناوٹ، نہ حلوے، نہ جلوے، نہ جلوس، نہ فضول، ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنی خوشی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی پر قربان کر دیں اور اپنے کردار کو اتنا عمدہ کریں کہ لوگ دیکھ کر پکار اٹھیں کہ اگر محمد ﷺ کو ماننے والے ایسے ہیں تو خود محمد ﷺ کیسے ہوں گے۔

میلاد النبی کو تماشا نہ بنائیں:

اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی خوشی ظاہر کرنے کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا خیال کریں، آپ ﷺ کا مکمل اتباع کریں، ہمارے آقا ﷺ عموماً پیر کے دن روزہ رکھتے، جیسا کہ حدیث مذکور میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”فِيْهِ وُلِدْتُ، وَفِيْهِ أُنْزِلَ عَلَيَّ“ محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں: ”اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو پیر کے دن (کبھی کبھی یا اکثر) روزہ رکھتے تھے تو اس کا ایک محرک تو وہ تھا جس کا اوپر کی حدیث میں ذکر آیا، یعنی یہ کہ اس دن اعمال کی ایک پیشی ہوتی ہے اور آپ ﷺ چاہتے تھے کہ اس پیشی کے دن آپ ﷺ روزہ کی حالت میں ہوں، اور دوسرا محرک اللہ تعالیٰ کی ان دو نعمتوں (یعنی جب آپ ﷺ کی ولادت ہوئی جس میں آپ ﷺ کا جمال ظاہر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت جس میں آپ ﷺ کا کمال ظاہر ہوا) کے شکر کا جذبہ بھی تھا، جو آپ ﷺ کو پیر ہی کے دن عطا ہوئیں اور جو ساری دنیا کے لیے بھی نعمت اور رحمت ہیں۔ (معارف الحدیث/ص: ۱۷۶/۴)

اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ زندگی کے ہر شعبہ میں نہیں اپنا سکتے تو کم از کم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہوا اور ہوس کا بازار لگا کر اور نہایت قبیح و غیر شرعی امور کو انجام دے کر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق تو نہ اڑائیں اور میلاد النبی کو تماشا تو نہ بنائیں۔ قرآنِ پاک نے جن بدنصیبوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا﴾ (الأنعام: ٧٠)

”اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔“

تو مفسرین کو اس جگہ ”دین“ کے معنی متعین کرنے میں دقت پیش آئی کہ بھلا دین کو بھی کوئی قوم لہو و لعب یا مشغلۂ تفریح بنا سکتی ہے، لیکن غیروں کے تہواروں کے علاوہ افسوس

آج میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ کے موقع پر ہم اپنے گرد وپیش میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کے بعد اس آیت کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی، کیوں کہ اب یہ ہولی اور دیوالی جو برادرانِ وطن کے نزدیک مقدس سمجھے جانے والے تہوار ہیں ان کو محض ناچ گانا اور عیاشی، فحش کاری و بدکاری، پٹاخہ بازی اور روشنی کا مستقل مشغلہ بنا لینا، نیز عیسائیوں کے نزدیک مقدس سمجھنے جانے والے تہوار کرسمس کو شراب نوشیوں، بدمستیوں اور بے حیائیوں کے ساتھ منانا دین و مذہب کو لہوولعب اور مشغلۂ تفریح بنانا نہیں تو اور کیا ہے؟ ان حقائق کی وضاحت کے بعد اب عبرت کے ساتھ ہمارے اہل جلوس وجشن پورے خلوص سے جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر ہونے والی خرافات، بدعات اور منکرات میں غور کرلیں کہ کہیں وہ خود بھی اس وعید شدید کے تحت تو نہیں آجاتے؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد ﷺ کا تمہیں پاس نہیں

یاد رکھو! جس طرح ذکر رسول ﷺ کو عام کرنا ضروری ہے، اسی طرح فکر رسول ﷺ کو بھی عام کرنا ضروری ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں پیغامِ مصطفیٰ ﷺ سمجھ کر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۳۳)

معراج النبی ﷺ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَنَسٍ رضؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِالۡبُرَاقِ لَيۡلَةَ أُسۡرِيَ بِهٖ مُلۡجَمًا مُسۡرَجًا، فَاسۡتَصۡعَبَ عَلَيۡهِ، فَقَالَ لَهٗ جِبۡرَئِيۡلُ: "أَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ تَفۡعَلُ هٰذَا ؟ فَمَا رَكِبَكَ أَحَدٌ أَكۡرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُ"، قَالَ: فَارۡفَضَّ عَرَقًا". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۵٤۰/ باب فی المعجزات/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ شب معراج میں رحمتِ عالم ﷺ کی سواری کے لیے براق لایا گیا جس پر لگام چڑھی ہوئی اور زین کسی ہوئی تھی (جب آپ ﷺ اس پر سوار ہونے لگے) تو وہ شوخیاں کرنے لگا، (جس کی وجہ سے اس پر سوار ہونا دشوار ہوگیا) اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے براق کو مخاطب کر کے کہا کہ "حضرت محمد ﷺ کے ساتھ تو یہ شوخیاں کرتا ہے؟ یہ وہ ذاتِ پاک ہے کہ اللہ کی نظر میں ان سے زیادہ مکرم اور کوئی نہیں جو تجھ پر سوار ہوا ہو۔" (حضور ﷺ نے) فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یہ بات سن کر براق پسینہ پسینہ ہوگیا۔

کیا شان ہے پیارے نبی ☆ حق نے عطا کی سروری
معراج سے دی برتری ☆ بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ
ظلمات تھیں جب کفر کی ☆ شرک و ضلالت بت گری
ایمان کی روح پھونک دی ☆ کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
اسلام کی دعوت بھی دی ☆ تکلیف بھی اس نے سہی
جس نے دعا دشمن کو دی ☆ حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
اک دھوم دنیا میں مچی ☆ آواز یہ آنے لگی:
پڑھ لو درود امتی! ☆ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ

معراج کے لغوی معنیٰ:

اللہ جل شانہ نے اپنی تمام مخلوق میں جو عروج، عظمت اور کرامت انسانوں کو عطا فرمائی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی، پھر تمام انسانوں میں جو عروج، عظمت وکرامت اپنے نبیوں کو عطا فرمائی وہ طبقاتِ انسانی میں کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی، پھر تمام انبیاء ورسل علیہم السلام میں جو عروج، عظمت اور کرامت اپنے آخری رسول، محبوبِ کل، ہادیٔ سبل، ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی وہ کل ملا کر بھی حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے حصہ میں نہیں آئی۔

حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی عظمت شان اور علوّ مکان کے بیان واعلان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی نمایاں صفات، خصوصیات، اعزازات ومعجزات سے نوازا، اور ہر ایک سے آپ کی رفعت، فوقیت وفضیلت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان میں سے معراج النبی آپ ﷺ کی ایسی انوکھی اور انفرادی خصوصیت ہے جس سے چار دانگ عالم میں آپ ﷺ کی عظمت وافضلیت کا ڈنکا بج گیا، اس لیے کہ ایسی عظیم الشان معراجِ جسمانی کا اعزاز آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور پیغمبر کو نصیب نہیں ہوا۔

ویسے لفظ ''معراج''، ''عروج'' سے ہے، جس کے لغوی معنیٰ سیڑھی اور بلندی کے ہیں اور چوں کہ حق تعالیٰ نے شب معراج میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمالِ عروج پر پہنچانے، شانِ عظمت وکرامت کو ظاہر کرنے، انتہائی بلند مقامات سے نوازنے اور اپنا قربِ خاص عطا کرنے کے لیے جنتی سیڑھی کے ذریعہ فرشِ زمیں سے بلند کر کے عرشِ بریں پر پہنچایا، تاکہ خلقِ خدا کو معلوم ہو جائے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا مرتبہ ومقام ساری مخلوق میں اتنا ہی اونچا ہے جتنا فرشِ زمیں سے عرشِ بریں اونچا ہے، اس عروج کی مناسبت سے بھی اِس واقعہ کو معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

معراج کا پس منظر:

اس حقیقت کا انکشاف ایک نظر معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پس منظر پر ڈالنے سے بھی ہوتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ کا مرتبہ ومقام اتنا اونچا ہونے کے باوجود دعوت وتبلیغ کے سفر میں لوگوں کی طرف سے جن سخت حالات اور شدائد ومصائب سے آپ ﷺ کو گزرنا پڑا، کسی اور نبی ورسول کو اتنے شدید حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اعلانِ نبوت کے بعد تکالیف وآزمائش کا سلسلہ شروع ہو کر دن بدن بڑھتا ہی گیا، اسی دوران باپ کی طرح شفقت ومحبت کا معاملہ کرنے والے اور آپ ﷺ کے پشت پناہ، شفیق چچا خواجہ ابوطالب وفات پاگئے، پھر چند ہی دنوں میں قدم قدم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر طرح دلداری کرنے والی، ہر موقع پر دلاسہ دینے والی، اور ہر موڑ پر فراخدلی سے مالی مدد کرنے والی بیوی، سکونِ زندگی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

پھر جب اِن ظاہری اور قوی سہارے ٹوٹ جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین، معاندین وحاسدین کے حوصلے اور بڑھ گئے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں سے مایوس ہو کر بڑی امیدیں قائم کر کے طائف کا ارادہ فرمایا، لیکن اہل طائف نے ظلم وزیادتی اور وحشت وبربریت کا ایسا ثبوت پیش کیا جس سے آپ ﷺ کی آزردگی وشکستگی

اور بھی بڑھ گئی۔

چوں کہ حق اور دعوتِ حق کی ابتداء ہمیشہ ناکامی وناگواری سے ہوتی ہے، لیکن انتہاء ہمیشہ کامیابی پر ہوتی ہے، اس لیے عین اس وقت جب کہ محبت ورحمت کے پیکرِ اعظم ﷺ کے ساتھ انسانیت سوز اور درندگی سے بھرپور حرکتوں کی انتہاء ہوچکی اور کعبہ وعرشِ الٰہی سے زیادہ مقدس آپ ﷺ کا قلب غموں اور زخموں سے چور چور ہوگیا، تو آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر رحمت کا مرہم رکھنے اور آپ ﷺ کے مقام ومرتبہ سے دنیا والوں کو آگاہ کرنے کے لیے معراج کا سفر کرایا گیا، تاکہ فرشِ زمیں والوں کو پتہ چل جائے کہ میرا محمد مصطفیٰ ﷺ بے سہارا نہیں، اللہ تعالیٰ عرشِ بریں پر اس کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

معراج النبی ﷺ کی ابتداء:

معراج النبی ﷺ کا یہ واقعہ مکی زندگی کے اخیری دور میں ہجرت سے پہلے اور مشہور قول کے مطابق ۲۷/ رجب پیر کی رات اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ شعب ابی طالب کے قریب واقع اپنی چچازاد بہن اُمّ ہانیؓ بنت ابی طالب کے مکان میں نیم خوابی کی حالت میں تھے، اچانک گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام ربِ جلیل کی طرف سے اپنے خلیل کو بلانے کے لیے نازل ہوئے، یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ معراج النبی کا واقعہ شروع سے اخیر تک تمام کا تمام اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ اور محمد مصطفیٰ ﷺ کا عظیم معجزہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ربِ کریم نے معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کو لفظ ’’سبحان‘‘ سے شروع فرمایا، تاکہ جو لوگ اسرارِ الٰہی سے دور اور عظمت خداوندی سے بے نور ہیں وہ جان لیں کہ معجزہ صرف انسانی عقل وفہم کے لیے ایک انوکھا اور عجوبہ ہے، ورنہ خداوند قدوس کی قدرت کے سامنے کوئی چیز ناممکن قطعاً نہیں ہے۔ وہ مالکِ کن فیکون ہے اور ساری قدرت کا کارخانہ اسی کے اشارہ پر چلتا ہے، سبحان اس کی شان ہے، وہ ہر عجز سے منزہ ہے، لہٰذا معراج النبی ﷺ کے واقعہ کو عقل وخرد کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے خداوند قدوس کی قدرت اور

طاقت کے آئینہ میں دیکھئے گا! تا کہ کوئی اشکال باقی نہ رہے۔اس لیے فرمایا ''سبحان'' اشکال ہوگیا آسان، کامل ہوگیا ایمان اور راضی ہوگیا رحمٰن۔

الغرض حضرت جبرئیل علیہ السلام میکائیل علیہ السلام کے ساتھ چھت کھول کر دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ خوابِ راحت سے بیدار کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک پر اپنے پر بچھا دیے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی، تو آنے کا انداز بھی نرالا اور جگانے کا انداز بھی انوکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جگا کر مسجد حرام لائے اور حطیم اور حجرِ اسود کے درمیان بیر زمزم کے قریب لٹا کر سینۂ اقدس کو کھولا اور قلب مبارک کو نکال کر زمزم سے دھویا، پھر علم وحکمت سے بھر کر دوبارہ اپنی جگہ رکھ کر سینۂ مبارک بند کر دیا گیا، اور دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت لگا دی گئی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی حسی اور ظاہری علامت ہے۔

صاحبو! آج کل میڈیکل سائنس کی اصطلاح میں بائی پاس سرجری (دل کا آپریشن) جو مخصوص بیماری کے پیش نظر کیا جاتا ہے، میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ عمل تو آج کل کامیاب ہوا، ربِ کریم نے آج سے پندرہ سو سال پہلے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ کر دکھایا، فرق اتنا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خدائی بائی پاس سرجری روحانی تھا، کسی بیماری کے پیش نظر نہیں تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مختلف حصوں میں وقفے وقفے کے ساتھ شقِ صدر (الٰہی بائی پاس آپریشن) چار مرتبہ ہوتا رہا، تا کہ قلب نبوت معصیت وغفلت کی آلودگی سے پاک اور نورِ الٰہی سے منور ومزین ہو جائے۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری:

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت کی سواری براق پر سوار کیے گئے، بعض حضرات نے معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری براق کو ''برق'' یعنی بجلی سے تشبیہ دی ہے، جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی (۸۶) ہزار فی سیکنڈ ہے، اسی لیے کہا گیا کہ دنیا میں سب سے تیز رفتار بجلی ہے، پھر

براق تو جنتی سواری تھی اور جنت کی ہر چیز حیرت انگیز ہے، اس لیے معراج النبی ﷺ کی سواری کی تیز رفتاری بھی نہایت ہی حیرت انگیز تھی، اس کا ہر قدم منتہائے نظر پر پڑتا تھا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہوئے تو وہ کچھ شوخی کرنے لگا، جیسا کہ حدیث مذکور میں بیان کیا گیا۔ محدثین اور حضرات شارحین نے فرمایا کہ براق کا شوخی کرنا فخر اور ناز کی بنا پر تھا، وہ اس خوشی میں اچھل رہا تھا کہ حضور ﷺ کی سواری کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے، لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ اس کی اچھل کود (آپ ﷺ کے مقام سے ناواقفی و) نادانی کے طور پر ہے، لہٰذا براق کو متنبہ کیا، اب جب براق کو جبرئیل علیہ السلام کے گمان کا احساس ہوا تو مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ (مظاہر حق جدید/ص:۱۴۸/ ۷)

معراج النبی ﷺ کی اس سواری پر آپ ﷺ کے دائیں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور بائیں حضرت میکائیل علیہ السلام تھے، ساتھ ہی ملائکہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رہنمائی میں بڑی شان سے سفر معراج النبی شروع ہوا، دورانِ سفر سب سے پہلے (۱) مدینہ طیبہ، بعد ازاں (۲) وادی سینا (جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے کلام کیا) اس کے بعد (۳) مدین (جہاں حضرت شعیب علیہ السلام کا مسکن اور مکان تھا) اور پھر (۴) بیت اللحم (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش) ان مقامات مقدسہ پر نمازِ نفل ادا فرمائی۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ''اس سے معلوم ہوا کہ مقاماتِ مقدسہ میں نماز پڑھنا موجبِ برکت ہے، بشرطیکہ اس مقام سے کسی مخلوق کی تعظیم مقصود نہ ہو۔'' اور پھر عجائباتِ سفر کا مشاہدہ کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ پہنچے۔

معراج النبی ﷺ کی پہلی منزل:

یہ معراج النبی ﷺ کی پہلی منزل ہے، بعض روایتوں میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کے استقبال اور اکرام کے لیے حضراتِ انبیاء و رسل علیہم السلام کی مقدس روحوں کو مثالی جسم میں جمع فرما دیا، کچھ دیر کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اذان

دی، حضرت میکائیل علیہ السلام نے اقامت کہی، اور نماز کے لیے صفیں بن گئیں، تو انتظار ہونے لگا کہ آج انبیاء وملائکہ علیہم السلام کے مجمع کی امامت کون کرائے گا؟ لیکن ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ امامت انبیاء وملائکہ علیہم السلام جس کا حق اور حصہ تھا اسی کو ملا، یعنی آپ ﷺ کو، اور بھلا حضور ﷺ کی موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہوتے ہوئے کوئی کیسے امامت کرا سکتا ہے؟

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ آج اگر مساجد کے ائمہ کو حق امامت حاصل ہے تو اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر نہیں (یہ ہمارے معبود اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے) ورنہ اماموں کو حق امامت حاصل نہ ہوتا، کیوں کہ جب معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر مسجد اقصیٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھے تو ان کی موجودگی میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو امامت کی اجازت نہ ملی، تو چودہویں صدی کے امام کو کیسے مل سکتی ہے؟ معلوم ہوا کہ ہر جگہ موجود صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک ہے، جو معبودِ کامل ہے، اور حضور ﷺ عبد کامل ہیں، اور عبد و معبود کا تعلق جب انتہاء کو پہنچ جائے تو وہ عبدہٗ بن جاتا ہے۔ اسی کو علامہ اقبال کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا:

''عبد'' دیگر ''عبدہٗ'' چیزے دگر ☆ او سراپا انتظار ایں منتظر

بہر کیف! جب صفیں درست ہوئیں تو حضرت روح الامین علیہ السلام نے سید الاولین والآخرین، قائد المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑ کر آگے کیا اور بزبانِ حال کہا:

آفاقہا گردیدہ ام ☆ مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام ☆ لیکن تو چیزے دیگری

حضور! میں پوری دنیا میں گھوما، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک گیا، زمین و آسمان کا چکر کاٹا، لیکن آپ جیسی شان والا کسی کو نہ پایا، لہٰذا تشریف لائیے، نماز

پڑھائیے! تب آپ ﷺ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت کرائی اور انبیاء علیہم السلام نے آپ ﷺ کی اقتداء میں دو رکعات نمازِ نفل ادا فرمائی۔ (ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے معراج میں جاتے وقت بھی بیت المقدس میں دو رکعات نماز (تحیۃ المسجد) پڑھی اور لوٹتے وقت بھی دو رکعات نماز (فجر) پڑھی تھی۔
از: الکوثری شرح ترمذی/ ج:۱/ص:۲۹۲)

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارواحِ انبیاء علیہم السلام سے ملاقات فرمائی اور سب نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔ یہاں معراج کا پہلا حصہ اور یہ عظیم الشان روحانی کانفرنس ختم ہو کر آگے کی کاروائی شروع ہوئی۔

معراج النبی ﷺ کی دوسری منزل:

اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر یعنی معراج النبی ﷺ کی دوسری منزل تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچانے کے لیے ایک آسمانی، خدائی اور جنتی سیڑھی کا انتظام کیا گیا۔

صاحبو! دورِ حاضر میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے آج جو تیز رفتار لفٹیں اور خود کار زینے ایجاد کیے ہیں، جن کے ذریعہ ہم اور آپ آسانی سے اوپر نیچے آجا سکتے ہیں، خداوند کریم نے اب سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا انتظام کیا تھا، رحمۃ للعالمین ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام اور ملائکہ المقربین کی معیت میں بڑی شان سے براق پر سوار ہونے کی حالت میں اس سیڑھی کے ذریعہ آسمانوں پر عروج وصعود فرمایا۔ (تشریف لے گئے) آسمانِ اول کے دروازے پر پہنچ کر جبرئیل علیہ السلام نے آسمانی قوانین وضوابط کے مطابق اجازت طلب کی، اجازت ملنے کے بعد جیسے ہی آپ ﷺ آسمانِ اول پر پہنچے تو وہاں کے تمام فرشتوں میں ایک خوشی کا سماں بندھ گیا، ہر ایک نے مرحبا مرحبا کہا اور نہایت تعظیم وتکریم کا معاملہ کیا، پھر ساتوں آسمان پر ایسا ہی ہوا۔ پہلے آسمان سے ساتویں آسمان تک چند مخصوص انبیاء علیہم السلام سے آپ ﷺ کی ملاقاتیں کروائی گئیں،

جن میں علماءِ سیر کے بقول ان انبیاء علیہم السلام کو پیش آنے والے حالات کی طرف اشارہ تھا کہ آپ کو بھی ان جیسے حالات بعد میں پیش آئیں گے۔ چناں چہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کروائی، تو اس میں ہجرت کی طرف اشارہ تھا، کہ جس طرح سیدنا آدم علیہ السلام نے شیطان کی وجہ سے آسمان اور جنت سے زمین کی طرف ہجرت فرمائی اسی طرح آپ بھی شیطان کی مادی اولاد کی وجہ سے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ و یحیٰ علیہما السلام سے ملاقات کروائی، اس کا راز یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمانے کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تشریف لائے، ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی نبی نہیں تھا، تو ان کے اور حضور ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی نہ ہوگا، خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام قربِ قیامت سے قبل جب دجال کے قتل کے لیے آسمان سے نازل ہوں گے تو امتی بن کر نازل ہوں گے، اور اخیری زمانے میں اس امت کے ایک مجدد ہونے کی حیثیت سے شریعت محمدیہ کے احکام کو جاری فرمائیں گے، نیز قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی تمام اولین و آخرین کو لے کر شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شفاعت کبریٰ کی درخواست کریں گے، ان وجوہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کروائی۔ اور حضرت یحیٰ علیہ السلام سے ملاقات میں یہودیوں سے تکالیف پہنچائے جانے کی طرف اشارہ تھا کہ جس طرح یہودِ بے بہبود نے حضرت یحیٰ علیہ السلام کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، مدینہ منورہ کے یہود بھی آپ کے درپئے آزار ہوں گے، آپ کے قتل کے لیے طرح طرح کے مکر اور حیلے کریں گے، مگر جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودِ بے بہبود کے شر سے محفوظ رکھا اسی طرح آپ کو بھی محفوظ رکھے گا:

﴿وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدة : ٦٧)

”اور اللہ تمہیں لوگوں (کی سازشوں) سے بچائے گا۔“

تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کروائی، اس میں اشارہ اس طرف تھا کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جس طرح انہیں تکلیفیں پہنچائیں اسی طرح برادرانِ وطن بھی آپ کو تکلیفیں پہنچائیں گے، اور بالآخر یوسف علیہ السلام کی طرح آپ بھی غالب آئیں گے اور ان سے درگذر فرمائیں گے، اور فتح مکہ کے دن ایسا ہی ہوا، حضور ﷺ نے اپنے برادرانِ وطن کو اسی خطاب سے مخاطب کیا جس سے سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو مخاطب کیا تھا:

﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ﴾ (یوسف: ۹۲)

''آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہوگی، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپ کو بھی حضرت ادریس کی طرح رفعت اور علو مرتبت سے نوازا جائے گا۔

پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات میں یہ راز تھا کہ کہ جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود سامری اور اس کے ہمنوا لوگ گوسالہ پرستی سے باز نہ آئے اور بالآخر ہلاک ہوئے، اسی طرح مشرکینِ مکہ اور بت پرست بھی بالآخر ہلاک ہوں گے، چناں چہ جنگ بدر میں یہی ہوا کہ قریش کے ستر سردار مارے گئے اور ستر قید کیے گئے۔

چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح وہ ملک شام کی طرف جہاد کے لیے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی اسی طرح آپ بھی ملک شام کی طرف جہاد کے لیے نکلیں گے اور حق تعالیٰ آپ کو فتح عطا فرمائیں گے، پھر ایسا ہی ہوا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام میں غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح دی۔ اس کے بعد ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کا نکتہ

یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی تعمیر فرمائی، پھر بحکم الٰہی حج کا اعلان کیا، تو قیامت تک جس کے مقدر میں جتنی مرتبہ حج کرنا لکھا ہے اس نے اتنی مرتبہ اس کے جواب میں لبیک کہا۔ اس آخری ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپ بھی آخری عمر میں حجۃ الوداع فرمائیں گے۔ (مستفاد از: سیرۃ مصطفیٰ)

سدرۃ المنتہیٰ اور بارگاہِ خدا:

اس کے بعد جبرئیل امین علیہ السلام رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر سدرۃ المنتہیٰ پر گئے، یہاں آپ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو دوبارہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰی﴾ (النجم: ۱۳)

”تحقیق کہ آپ نے جبرئیل کو دوسری دفعہ نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔“

مفسرین نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو غارِ حراء میں آغازِ نبوت کے وقت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا، اور دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ میں جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو ہیں۔
(تحفۃ القاری/ص:۱۷۶/ج:۲)

یہ سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ یہ ایک بیری کا درخت ہے، جس کے قریب ہی جنت ہے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی﴾ (النجم: ۱۴-۱۵)

”اس بیر کے درخت کے پاس جس کا نام سدرہ ہے، اس کے پاس جنت الماٰویٰ ہے۔“

یہی وہ مقام ہے کہ فرشِ زمین سے جو چیز اوپر جاتی ہے یہاں پہنچ کر منتہی ہو جاتی ہے، یعنی روک لی جاتی ہے، پھر یہاں سے اوپر اٹھائی جاتی ہے، اسی طرح عرشِ بریں (ملاء اعلیٰ) سے جو چیز نیچے اترتی ہے وہ بھی یہاں آ کر منتہی ہو جاتی ہے، پھر نیچے اتاری جاتی ہے، اس لیے اسکا نام سدرۃ المنتہیٰ ہے، گویا یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ عالم خلق اور عالم امر کے درمیان

ایک سنگم یا بارڈر رہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پہنچ بھی یہیں تک ہے، اس لیے وہ سفرِ معراج میں اِس بارگاہِ الٰہی کے بارڈر پر رک گئے، آگے رفیق سفر بننے سے عذر پیش کیا:

سدرۃ منزل روح الامیں کی ☆ ان کی منزل عرشِ بریں کی
ان کا تصدق کوثر و زمزم ☆ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
فرشِ سے ہے تا عرش اُجالا ☆ ذرّہ ذرّہ نور کا ہالہ
بزم شیاطین درہم برہم ☆ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
اعظم اکرم اشرف اطہر ☆ عرشِ معلیٰ سے بھی فزُوں تر
خواب گہِ سرکار دو عالم ☆ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
سب ہے اُن ہی قدموں کی بدولت ☆ دنیا عقبیٰ دوزخ جنت
خندۂ گل اور گریۂ شبنم ☆ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بصد ادب یہ عرض کیا حضور! سدرۃ المنتہیٰ آپ کے عروج کی ابتداء اور میرے عروج کی انتہاء ہے، اس سے آگے بڑھنے کی مجھے اجازت نہیں، اگر میں بال برابر بھی آگے بڑھا تو تجلیاتِ ربانی میرے پروں کو جلا کر خاکستر کردے گی:

اگر یک سر موئے برتر پرم ☆ فروغِ تجلی بسوزد پرم

اللہ اکبر کبیرا! خطیب برصغیر حضرت شاہ سید عطاء اللہ بخاریؒ نے اس موقع پر عشق رسول ﷺ میں مست ہو کر عجیب بات ارشاد فرمائی کہ ''سفر معراج النبی ﷺ میں نانا جان کے ساتھ میں ہوتا تو جبرئیل علیہ السلام سے بھی کہہ دیتا کہ ''محمد کا ساتھ کیوں چھوڑتا ہے؟ کہ ان کا ساتھ دینے والے جلا نہیں کرتے، جِلا (روشنی) پاتے ہیں!''

بہر کیف! حضور ﷺ کے پاس سفر معراج میں جو آسمانی پاسپورٹ تھا اس کا ویزا تو منزلِ مقصود تک تھا، اس لیے آپ ﷺ آگے بڑھ گئے اور بارگاہِ الٰہی میں پہنچ گئے، اور دیدارِ الٰہی وکلامِ ربانی سے مشرف ہو گئے، دنیا والے چاند تک پہنچے، تو ہمارے آقا ﷺ چاند کے خالق و مالک کے دربار تک پہنچے، جس کی شہادت خود قرآن نے دی:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى﴾ (النجم : ۸-۹)

''پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر قریب آگیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک۔''

دربارِ الٰہی میں محمد مصطفیٰ ﷺ اپنے جسم اور روح کے ساتھ مولیٰ سے اتنے قریب ہو گئے جتنے دو کمانوں کے سرے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے درمیان کوئی پردہ نہ رہا۔

جمہور صحابہؓ وتابعین، فقہاء اور علماءِ محققین کے بقول بارگاہِ الٰہی میں حضور ﷺ نے اپنے پروردگار کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، ہمارے نزدیک یہی راجح اور حق ہے۔ واللہ اعلم۔

بارگاہِ الوہیت میں اظہارِ عجز اور نذرانۂ عقیدت:

رحمتِ عالم ﷺ نے اس موقع پر اظہارِ عجز کے ساتھ نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کیا اور گویا اس طرح سلامی دی: ''اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰةُ وَالطَّيِّبَاتُ'' تمام قولی عبادتیں خواہ وہ ذکر ہو یا تلاوت، وعظ ہو یا نصیحت اور تمام جسمانی عبادتیں خواہ وہ نماز ہو یا روزہ اور تمام مالی عبادتیں خواہ وہ زکوٰۃ ہو یا صدقہ، میرے مولیٰ! میری اور میری امت کی ساری عبادتیں تیرے ہی لیے ہیں کہ عبادت کے لائق تو ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی عظمت بیان کرنا، اس کی الوہیت کے گیت گانا ایک ایسا عمل ہے کہ دربارِ صمدیت میں اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ اور نذرانہ نہیں، خداوند کریم کو نبی کریم ﷺ کے یہ تین تحفے اس قدر پسند آئے کہ جواباً پروردگارِ عالم کی جانب سے بھی تین چیزیں عنایت ہوئیں، ارشاد ہوا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ''۔

''میرے پیارے! تجھ پر سلام، رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں (اور اتنا ہی نہیں، جو تیری نورانی صورت، پاکیزہ سیرت اور کامل شریعت سے وابستہ ہوگا اس پر بھی سلام، رحمتیں اور برکتیں نازل کی جائیں گی)''

سرکارِ دوعالم ﷺ نے پروردگارِ عالم کی رحمت کو جب اس قدر پرجوش پایا تو اپنی امت عاصی کو یاد فرمایا اور عرض کیا: "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ" الٰہ العالمین! آپ کا سلام ہم سب پر اور جنابِ باری کے نیک بندوں پر ہو، سبحان اللہ! حضور ﷺ کی امت عاصی سے شفقت تو دیکھئے کہ سلام پہلے اپنے اوپر صیغۂ جمع سے کیا، پھر نیک بندوں کو الگ ذکر کیا، اس طرح حضور ﷺ نے صیغۂ جمع میں ہم گنہگار امتیوں کو شامل کر کے ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے سلام کا مستحق بنالیا، ورنہ کہاں ہم اور کہاں اللہ پاک کا سلام! اس شفیق وخلیق اور خدا کے خلیل سے امید یہی ہے کہ جس طرح معراج میں ہم گنہگاروں کو یاد رکھا، محشر میں بھی یاد رکھیں گے اور حق تعالیٰ آپ ﷺ کے طفیل ہمیں حیاتِ طیبہ نصیب فرمائیں گے۔

اس کے بعد (عہد ایمان کی تجدید کے طور پر علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے) مزید عرض کیا: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" محقق اسلام حضرت مولانا منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ "نماز میں اس مکالمہ کو شب معراج کی یادگار کے طور پر جوں کا توں لے لیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ أَیُّهَا النَّبِیُّ" میں خطاب کی ضمیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔" (معارف الحدیث/ص:۳/۲۹۳)

الحاصل! بارگاہِ الٰہی میں تحائف وعطیات کے تبادلہ کے بعد احد اور احمد کے درمیان بہت سی راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، قرآن نے صرف اتنا کہہ دیا:

﴿فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَآ أَوْحٰى﴾ (النجم: ۱۰)

"پھر پروردگار نے اپنے بندے پر جو چاہی وہ وحی نازل فرمائی۔" یہ محبوب اور محبّ کے درمیان راز ہے، کوئی محبوب اپنے محبّ کی ملاقات کی باتیں دوسرے کو نہیں بتایا کرتا، قرآن نے بھی اسی طرح اجمال کے ساتھ اس کا تذکرہ کر دیا۔

معراج النبی ﷺ کے عطیات:

علماء نے فرمایا ہے کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم و

حکمت، معارف وحقائق، اورانوار وبرکات کے جو عطا یا اور عظیم ترین خزانے ملے وہ تو بے شمار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تو مرکز عنایات ربانی تھی، لیکن خاص امت کے تعلق سے جو عطیات اور انعامات دیے گئے وہ تین ہیں:

(۱) "أُعْطِيَ الصَلوَاتِ الْخَمْسَ" پانچ نمازیں۔

(۲) "وَأُعْطِيَ خَواتِيْمَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ" سورۂ بقرہ کی آخری (دو) آیتیں۔

(۳) "وَغُفِرَ لِمَنْ لَّا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ مِنْ أُمَّتِهِ شَيْئًا" شرک نہ کرنے والے کی مغفرت۔

(مسلم، مشکوٰۃ/ص:۵۲۹/باب في المعراج/الفصل الأول)

معراج النبی ﷺ کے موقع پر حق تعالیٰ نے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار نعمتوں، عنایتوں اور خزانوں سے مالا مال فرمایا وہیں آپ ﷺ کی امت کو بھی اپنی رحمتوں، عنایتوں اور خزانوں سے نوازنے کے لیے یہ تین عظیم الشان عطیات دیے، ان میں سے نماز ایک ایسا عطیہ ہے کہ فرشتوں کی عبادتوں کا خلاصہ اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اسی لیے صوفیۂ کرام نے نماز کو معراج المومنین فرمایا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ خشوع، خضوع اور اللہ تعالیٰ کے استحضار کے سبب جس نماز میں روح اور حقیقت پیدا ہو جائے اس نماز سے نمازی کی پرواز عرشِ الٰہی اور دربارِ الٰہی تک ہو جاتی ہے، اس نمازی کا جسم بلاشبہ اپنی (محمدی یا اور کوئی) مسجد میں ہوتا ہے، مگر اس کی روح گویا دربارِ الٰہی میں ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی کہنے والے نے کہا:

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا

میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز کا اختتام سلام پر ہوتا ہے تو اس میں ایک راز یہ ہے کہ سلام کا ایک موقع وہ ہوتا ہے جب کوئی کہیں باہر سے آئے، چوں کہ حقیقی نمازی کی روح آسمانی وروحانی دنیا میں گئی تھی، اب نماز کے اختتام پر واپس آئی، لہٰذا اس نے سلام کیا، اس طرح نماز جو تحفۂ معراج ہے اسی کو مومن کی معراج کہہ دیا۔ (واللہ اعلم)

معراج النبی ﷺ کا دوسرا عطیہ خواتیم سورۂ بقرہ ہے، ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ

سے مانگنے کا طریقہ اور اس کے وسیع خزانوں سے لینے کا سلیقہ سکھایا گیا ہے، حتیٰ کہ درخواست کا مضمون بھی خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا، گویا حق تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں دعا کا مضمون بیان فرما کر ان کے پڑھنے والوں کے حق میں قبولیت کا پروانہ عطا کر دیا۔

صاحبو! کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہے؟ ایسا خالق و مالک جو بتائے کہ میرے پرستارو! مجھے اس انداز و الفاظ سے پکارو گے تو میں تمہاری دعا اور پکار کو قبول کرلوں گا، اس کے علاوہ کوئی نہیں، اور ہر گز نہیں، دینے والی ذات اسی کی ہے، جس کو جو کچھ ملا اسی کے در سے ملا، لہٰذا اسی سے مانگو جس نے اس طرح مانگنا سکھایا:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَ اعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ﴾

"اے ہمارے رب! ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرما، اور اے ہمارے رب! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا کہ آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، اور اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ لاد دیئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو، اور ہماری خطاؤں سے در گذر فرمایئے، ہمیں بخش دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے، آپ ہی ہمارے حامی و ناصر ہیں، اس لیے کافر لوگوں کے معاملہ میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔"

ان دو آیتوں میں تمام دعاؤں کے بعد رحم کی اپیل ہے، اور وہ رحیم ہے، اس لیے ضرور ہی قبول کرلے گا۔

معراج النبی ﷺ کے موقع پر تیسرا عطیہ امت محمدیہ کی مغفرت کا وعدہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے بغیر عذاب کے بخش دیں گے، خواہ وہ مرتکب کبائر ہو یا صغائر، لیکن شرط یہ ہے کہ شرک نہ کرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ دل اور عقیدے کے مریض، بیمار ذہنیت کے بعض لوگ معراج النبی ﷺ کی وجہ سے احد اور احمد کو ایک سمجھنے لگ جائیں گے، اسی لیے پہلے ہی باخبر کر دیا کہ خبردار! میری ذات اور

(مخصوص) صفات میں کسی کو بھی کسی طرح ذرّہ برابر بھی شریک مت کرنا، ورنہ میری مغفرت سے محروم رہ جاؤ گے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ ﴾ (النسآء : ١١٦)

''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔''

معلوم ہوا کہ مشرک شب قدر اور شب برأت ہی میں مغفرت سے محروم نہیں رہتا، وہ محروم القسمت ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے، وہ شب معراج کی برکات وانوارات سے بھی محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ شرک غداری ہے، جو نا قابل معافی جرم ہے، گناہ معاف ہو سکتے ہیں، غداریاں معاف نہیں ہو سکتیں۔ (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا آمِیْنَ)

المختصر! معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر دربارِ الٰہی سے حضور اکرم ﷺ امت کے لیے یہ تین عظیم الشان انعامات وعطیات لے کر واپس لوٹے اور اس طرح معراج النبی ﷺ سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک اور روشن باب کھل گیا۔ حق تعالیٰ اس سے ہمارے دلوں کو بھی روشن فرمادے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

معراج کی شب یہ دھوم مچی ، وہ عرش پہ آنے والے ہیں
مشتاقِ زیارت آجائیں، وہ جلوہ دکھانے والے ہیں
جبرئیل نے یہ حوروں سے کہا: دم بھر میں وہ آنے والے ہیں
جی بھر کے زیارت کرلینا، ہم ساتھ میں لانے والے ہیں
معراج کی شب خالق نے کہا: جبرئیل ادب سے رہنا ذرا
تو شان ان کی کیا جانے، مہمان جو آنے والے ہیں
پردہ کو اٹھا کر حق نے کہا: محبوب! ذرا اندر آجا
امت کے لیے ہم تم کو پیغام سنانے والے ہیں
جب طور پہ موسیٰؑ نے ارنی کہا تو عرش سے آئی فوراً ندا:
بے ہوش نہ ہوجانا موسیٰ، ہم پردہ اٹھانے والے ہیں

(۳۴)

شبِ برأت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ عَـائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَـالَـتۡ: "فَقَدۡتُّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَيۡلَةً، فَإِذَا هُوَ بِالۡبَقِيۡعِ، فَقَالَ: "أَكُنۡتِ تَخَافِيۡنَ أَنۡ يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡكِ وَرَسُوۡلُهٗ ؟" قُلۡتُ: " يَارَسولَ اللّٰه! إِنِّيۡ ظَنَنۡتُ أَنَّكَ أَتَيۡتَ بَعۡضَ نِسَائِكَ" فَقَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنۡزِلُ لَيۡلَةَ النِّصۡفِ مِنۡ شَعۡبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنۡيَا، فَيَغۡفِرُ لِأَكۡثَرَ مِنۡ عَدَدِ شَعۡرِ غَنَمِ كَلۡبٍ". (رواه الترمذى وابن ماجه، وزاد رزين "مِمَّنۡ اسۡتَحَقَّ النَّارَ" وقال الترمذى سمعت محمدا يعنى البخارى يُضَعِّفُ هذا الحديث، مشكوٰة/ص:١١٤/ باب قيام شهر رمضان/الفصل الثانى)

ترجمہ: حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گم پایا (یعنی اپنے بستر پر نہ پایا تو میں تو آپ کی تلاش میں نکلی) کیا دیکھتی ہوں کہ آپ (جنت) البقیع میں (استغفار میں مشغول) ہیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عائشہ! کیا تمہیں خوف ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری حق تلفی کریں گے؟" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! (بات دراصل یہ ہے کہ) مجھے یہ گمان ہوا کہ آپ اپنی بیویوں میں سے کسی کے پاس گئے ہوں گے" اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ پندرہویں شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا پر (اپنی رحمت کے ساتھ) نزول فرماتے ہیں اور (قبیلۂ) کلب کی بکریوں

کے بالوں کی تعداد سے زیادہ (ان لوگوں کی جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب دوزخ کے مستحق ہو چکے ہیں) مغفرت فرماتے ہیں''۔(تو یہ تجلیاتِ باری اور رحمت ربی کی رات ہے اس لیے میں (جنت)البقیع میں چلا گیا،تا کہ جا کر اپنی امت کے گناہ گار اور مستحق نار کے لیے دعا اور استغفار کروں)

شبِ برأت کی وجہ تسمیہ :

رب کریم نے اپنے فضل و کرم سے زندگی کے تمام ہی لیل ونہار اور اوقات ولمحات کو رحمت و برکت والا بنایا ہے، زمانے کا کوئی لمحہ بھی منحوس نہیں بنایا، وہ تو انسان خود ہی کسی وقت اپنے خالق و مالک کو ناراض کر کے ان اوقات اور لمحات کو منحوس بنا دیتا ہے، ورنہ اس کی جانب سے ہر وقت اس کے سبھی بندوں اور بندیوں کے لیے رحمتوں، برکتوں، بخششوں، نعمتوں، نوازشوں، انعاموں اور عنایتوں کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے،لیکن ان میں کچھ اوقات ولمحات اور دن ،رات ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں کے ساتھ خاص ہیں ،اور کہنا چاہیے کہ گناہ گاروں کے لیے ریز رو ہیں؛ کیوں کہ ان میں رب العالمین کی رحمتوں کے بادل گناہ گاروں کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں، پھر جب گنہگار استغفار کے ذریعہ اس کے سایہ تلے آجاتے ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش برستی ہے اور ان کے سبھی گناہوں کو دھو کر انہیں پاک وصاف کر دیتی ہے۔

قرآن وحدیث میں ایسے مختلف مواقع کا ذکر ملتا ہے جن میں سے ایک موقع شب برأت یعنی نصف شعبان کی رات بھی ہے۔عوام اسے ''شب برات'' کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''برات (بارات اور شادی) کی رات'' جب انہوں نے ''برأت'' کو برات'' کر دیا تو اس رات میں کچھ کرنا دھرنا تو ختم ہو گیا، اور پٹاخے، چراغاں اور طرح طرح کے خرافات شروع ہو گئے، ورنہ برأت کے معنیٰ آزادی، رہائی اور نجات پانے کے آتے ہیں ،ربِ کریم اپنے فضل وکرم سے اس میں مسلمان گنہگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو معاف

کر کے عذابِ جہنم سے رہائی، آزادی اور نجات عطا فرماتے ہیں، اس مناسبت سے اسے شب برأت کہا جاتا ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس لیے شب برأت کہا جاتا ہے کہ بدقسمت تو اس رات میں بدعات، خرافات اور کھیل کود میں مبتلا رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بری ہوتے ہیں، اور خوش قسمت عبادت، عاجزی اور دعا و استغفار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب سے بری ہو جاتے ہیں۔

شب برأت کے متعلق سیدہ عائشہؓ کی روایت:

حدیث مذکور میں سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہؓ کی باری کے موقع پر ان کے حجرے میں آرام فرماتے تھے، ام المومنین فرماتی ہیں کہ رات کے کسی حصہ میں میری آنکھ کھلی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود نہ پایا، تو گھبرا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی اور ازواجِ مطہرات کے حجروں میں تلاش کرتی ہوئی مدینہ طیبہ کے قبرستان (جنت) البقیع میں پہنچی، جو قریب ہی ہے، دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی بخشش کے لیے دعا مانگ رہے تھے، فراغت کے بعد آپ ﷺ نے پوچھا: ”عائشہ! جانتی بھی ہو آج کونسی رات ہے؟ فرمایا کہ پندرہویں شعبان (شب برأت ہے جس میں) ربِ کریم قبیلۂ بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ گنہگاروں (مسلمانوں) کی مغفرت فرماتے ہیں۔“ (اس قبیلہ میں بکریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے آپ ﷺ نے مثالاً بیان کر کے فرمایا) کہ یہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے فیوض و برکات، انوارات و تجلیات، انعامات و نوازشات اور مغفرت و رحمت طلب کرنے کا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ ایسے مبارک اور مقدس وقت میں اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو کر امت کے گنہگاروں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگوں۔

اللہ کے آگے رو رو کر خلوت میں دعائیں بخشش کی
ہم خاک نشینوں کے خاطر، راتوں کو عبادت ہوتی ہے

شبِ برأت کی خصوصیت:

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے اس رات کی فضیلت میں گویا چار چاند لگ گئے اور عام راتوں کے مقابلہ میں اس کی قدر وعظمت اور منزلت وخصوصیت اور بڑھ گئی، چناں چہ علماء نے کتاب وسنت کی روشنی میں اجمالی طور پر اس کی دو خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے (خصوصی) فیصلے کی رات۔ (۲) اللہ تعالیٰ کے (خصوصی) فضل کی رات۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خصوصی فیصلوں کی بات ہے تو اس سلسلہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شب برأت میں اہم ترین امور کے فیصلے جو علم الٰہی اور تقدیر الٰہی میں پہلے ہی سے طے شدہ تھے ان کی تنفیذ جن فرشتوں کے واسطہ سے ہوتی ہے (حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام) اس رات میں خدائی بجیٹ ان کے سپرد کیا جاتا ہے، مثلاً کون کون اس سال میں پیدا ہوں گے؟ کون کون مریں گے؟ کون اچھے عمل کریں گے اور کون برے عمل کریں گے؟ کن کو کس قدر رزق دیا جائے گا؟ وغیرہ۔ (مشکوٰۃ/ص: ۱۱۵)

اس کی تائید اُس ارشادِ باری سے ہوتی ہے جس میں فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾

(الدخان: ۳-٤)

"بلا شبہ ہم نے قرآن کو مبارک رات میں نازل کیا، بے شک ہم (تمہیں انجامِ بد سے شفقت سے آگاہ کرنے اور) ڈرانے والے ہیں، (اور جس مبارک رات میں رب العالمین نے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا) اسی رات کو ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بعض مفسرین مثلاً حضرت عکرمہؒ وغیرہ نے فرمایا: "لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ" سے مراد شب برأت ہے۔ (معارف ص: ۵۸۷/۷)

اب جہاں تک قرآن کے رمضان اور شب قدر میں نازل ہونے کی بات ہے، تو اس کے متعلق بعض علماء نے فرمایا کہ نزولِ قرآن کے تین درجات ہیں۔

(۱) نزولِ قرآن کا فیصلہ۔ (۲) نزولِ قرآن کی ابتداء۔ (۳) نزولِ قرآن کی تکمیل۔ شب برأت میں نزولِ قرآن کا فیصلہ ہوا کہ اس دفعہ رمضان میں جو شب قدر آئے گی اس میں قرآن نازل کیا جائے گا، شب برأت میں یہ تجویز پاس ہوگئی، اس کے بعد شب قدر میں اس کی تنفیذ ہوکر لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نزول ہوا، وہاں سے بتدریج موقع بموقع ۲۳ سال کے طویل عرصہ میں مکمل نازل کیا گیا۔ (واللہ اعلم)۔

غرض آیت قرآنی میں "لیلة مبارکة" سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک شب برأت ہے۔ (جیسا کہ) حدیث سے بھی شب برأت کا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی رات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس کی ایک عظیم خصوصیت ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ فیصلہ کی اس رات میں اللہ کا ذکر اور آخرت کی فکر کرتے ہوئے خوب دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ یہ رات اس طرح گذاریں کہ ربِ کریم خوش ہوکر کرم کردے اور ہمارے حق میں خیر کا فیصلہ فرمادے۔ آمین۔

اکثر حضرات صحابہؓ بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعودؓ سے اس رات کے لیے بطورِ خاص یہ دعا منقول ہے:

" اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ كَتَبْتَنَا أَشْقِيَاءَ فَامْحُهُ، وَاكْتُبْنَا سُعَدَاءَ، وَ إِنْ كُنْتَ كَتَبْتَنَا سُعَدَاءَ فَأَثْبِتْنَا، فَإِنَّكَ تَمْحُوْ مَا تَشَاءُ وَ تُثْبِتُ، وَعِنْدَكَ أُمُّ الْكِتَابِ".

(مرقاة المفاتيح / ص: ۳/۲۵)

الٰہ العالمین! اگر تو نے ہمیں (تقدیر معلق میں) بدبخت لکھ دیا ہے تو تو اسے مٹا دے اور ہمیں نیک بخت لکھ دے، اور اگر تو نے ہمیں نیک بخت لکھا ہے تو اسے نہ مٹانا بلکہ برقرار رکھنا (تو ہی ہے تقدیر کا قاضی) بلاشبہ تو جسے چاہے مٹائے اور جس کو چاہے ثابت رکھے، تیرے ہی پاس ہے ام الکتاب (لوح محفوظ)۔ بہتر ہے کہ ہم بھی اس رات میں بکثرت یہ

دعا کریں۔

شبِ برأت میں اللہ تعالیٰ کی پکار:

اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شب برأت میں (بھی شب قدر کی طرح) شروع سے اخیر تک ربِ کریم کی خصوصی رحمت نازل ہوتی ہے، چناں چہ ابن ماجہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَن عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا، وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ إِلىٰ السَّمآءِ الدُّنْيَا، فَيَقُوْلُ: "أَلَا مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهٗ، أَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهٗ، أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهٗ، أَلَا كَذَا، أَلَا كَذَا، حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ". (مشكوٰة/ ص:١١٥/ الفصل الثالث / حديث قدسی نمبر : ٦)

اس حدیث قدسی میں فرمایا: ''جب شب برأت ہو تو (بہتر یہی ہے کہ تم) اس کی رات میں قیام (یعنی عبادت) کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو؛ کیوں کہ اس رات میں غروبِ آفتاب ہی سے (یعنی عام راتوں کی طرح آخرِ رات میں نہیں بلکہ شروع رات میں) حق تعالیٰ آسمانِ دنیا پر (اپنی رحمت کا) نزول فرماتے ہیں اور (بار بار) یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ہے کوئی مغفرت چاہنے والا؟ کہ میں اس کی مغفرت کردوں، اور ہے کوئی رزق کا طلب گار؟ کہ میں اسے رزق دوں، اور ہے کوئی مبتلائے مصیبت؟ کہ میں اسے عافیت دوں، اور ہے کوئی ایسا اور ویسا...... یہ آواز صبح تک آتی ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ اس رات میں شروع ہی سے ربِ کریم اپنی رحمت کو عام فرما کر آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں، اور گویا اس کی رحمت گنہگاروں کے دروازوں پر آ کر دستک دیتی ہے کہ گنہگارو! آؤ میری رحمت تمہاری منتظر ہے، کیا چاہتے ہو؟ آج تمہاری ہر جائز مراد پوری کی جائے گی:

﴿قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن : ٦٠)

تمہارا رب تمہیں دینے کے لیے آج شروع ہی سے بلاتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ مجھ سے مانگنے والوں کو سب کچھ دیا جائے گا اور کچھ نہیں لیا جائے گا۔

آتی ہے ندا پیہم جو مانگنے والا ہو
ہاتھ اپنے عقیدت سے آگے میرے پھیلائے
جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو
وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے
جو رزق کا طالب ہو میں رزق اسے دوں گا
جو طالب جنت ہو، جنت کی طلب لائے
وہ مائلِ توبہ ہو، میں مائلِ بخشش ہوں
میں رحم سے بخشوں گا، وہ شرم سے پچھتائے
وہ کشتِ طلب بوئے، میں بارشِ رحمت ہوں
میں دیکھ نہیں سکتا کھیتی کوئی مرجھائے

میرے بندو! آؤ جلدی کرو میرے دربار کی طرف دوڑ لگاؤ۔ ﴿فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ﴾ (الذاریات : ۵۰) پر عمل کرو، آج تمہارا روٹھا ہوا مولیٰ تم سے راضی ہونا چاہتا ہے۔ اب جو بندہ شرمندہ ہو کر سر جھکا کر آنسو بہا کر ہاتھ اٹھا کر آئے گا تو مجھے غضب ناک نہیں، مہربان پائے گا، وہ میری طرف ایک ہاتھ متوجہ ہوگا تو میری رحمت اس کی طرف دو ہاتھ متوجہ ہوگی، وہ چل کر آئے گا تو میری رحمت دوڑ کر اس کا استقبال کرے گی، خواہ وہ کوئی ہو، میں معافی مانگنے والوں کو محروم نہیں کرتا، بلکہ میں تو معمولی بہانوں سے بھی معاف کر دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا ایک عجیب واقعہ:

چناں چہ اس کی عنایت اور مغفرت کا ایک عجیب واقعہ منقول ہے، حضرت عبد الوہاب ثقفیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جنازہ دیکھا جس کو تین مرد اور ایک عورت نے

اٹھایا تھا، میں نے فوراً عورت کی جگہ لے لی، اور جنازہ کو قبرستان پہنچا کر دفن کردیا، بعد میں اس عورت سے (پس پردہ) معاملہ دریافت کیا، تو اس نے کہا کہ ''مرحوم میرا بیٹا تھا، لیکن یہ مخنث (ہیجڑا) تھا اس لیے پاس پڑوس کے سبھی لوگ اسے نہایت حقیر سمجھتے تھے، جس کی وجہ سے اس کے مرنے کے بعد بھی کسی نے کفن اور کندھا دینا پسند نہ کیا''۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے اس رات خواب میں سفید لباس میں ملبوس ایک شخص دیکھا جس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا، اس نے آکر میرا شکریہ ادا کیا اور کہا: ''میں وہی ہوں جسے آج تم نے دفن کیا، اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت اس لیے فرمادی کہ لوگوں نے مجھے حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا۔'' (رسالہ قشیریہ/ص:۲۲۱، از: کتابوں کی درس گاہ میں/ص:۶۵)

حدیث قدسی ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: "إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی کَتَبَ کِتَابًا قَبْلَ أَنْ یَّخْلُقَ الْخَلْقَ: "إِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ"، فَهُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ". (متفق علیه، مشکوٰة/ص:٥٠٦/ باب بدأ الخلق و ذکر الأنبیاء/ الفصل الأول، حدیث قدسی نمبر: ۷)

بلا شبہ اللہ جل شانہ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے یہ تحریر لکھی دی ہے کہ ''میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔'' یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے بندوں کے ساتھ رحمت وعنایت ہی کا معاملہ کرتا ہے، جیسا کہ خود بھی ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ عَذَابِیْ أُصِیْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾
(الأعراف:١٥٦)

''اپنا عذاب تو میں اسی پر نازل کرتا ہوں جس کو عذاب دینا تقاضائے حکمت ہوتا ہے، رہی بات میری رحمت کی تو وہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے''۔ دنیا میں تو ہر کسی کو اس سے

فائدہ ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی تو اسی رحمت کا ایک حصہ ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں کو معاف کرنے کے لیے مواقع اور بہانے عطا کرتا ہے۔

شب برأت میں محروم القسمت:

چناں چہ شب برأت اللہ تعالیٰ کی طرف سے گنہگاروں کے لیے ایک مہلت اور بہترین موقع ہے، ایک گولڈن چانس ہے، اگر بندہ اسے غنیمت جان کر سچی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت گنہگاروں کی منتظر رہتی ہے، اگر اس میں آتش بازی کے بجائے آہ وزاری کی جائے، معافی مانگی جائے تو یہ رات باعث سعادت ہوگی، ورنہ باعث شقاوت ہوگی۔

حدیث میں چند ایسے محروم القسمت لوگوں کا ذکر آتا ہے جن کی اس رات بھی مغفرت نہیں ہوتی، جب تک وہ سبھی توبہ نہ کرلیں، ان میں ایک (۱) مشرک۔ (۲) کینہ رکھنے والا۔ (۳) قاتل۔ (مشکوٰۃ/ص: ۱۱۵) (۴) قطع رحمی کرنے والا۔ (۵) والدین کا نافرمان۔ (۶) شراب کا عادی۔ (۷) زنا کا عادی۔ (۸) ٹخنوں کے نیچے پاجامہ لٹکانے والا مرد۔ (۹) خودکشی کرنے والا۔ (۱۰) غیب کی باتیں بتلانے والا۔ نیز کاہن اور نجومی۔ (الترغیب و الترہیب: ۳/۳۰۴، بحوالہ بیہقی، ومظاہر حق جدید: ۱/۹۵۹)

یہ وہ محروم القسمت لوگ ہیں جو شب برأت و شب نجات میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ روایتوں پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس رات تمام صغائر تو معاف کردیے جاتے ہیں، البتہ کبائر کی معافی کے لیے سچی توبہ شرط ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو محض اپنے فضل وکرم سے معاف کردے تو اور بات ہے۔

روایاتِ شبِ برأت کی حقیقت:

رہی بات شب برأت کی فضیلت میں وارد ہونے والی روایات میں ضعف کی، تو اس سے بھی اس کی فضیلت میں ان شاء اللہ کوئی فرق نہیں آئے گا، اس لیے کہ اولاً یہ بات

ذہن میں رہنی چاہیے کہ ضعیف روایات موضوعات کے ہم پلہ نہیں ہوتیں۔ پھر عقائد واحکام اور حلال وحرام کے علاوہ اعمال کے فضائل میں کچھ شرائط کے ساتھ ضعیف احادیث کا اعتبار تقریباً سبھی نے کیا ہے، بشرطیکہ ضعف راوی کے سوءِ حفظ کی وجہ سے ہو، علاوہ ازیں محققین اور محدثین کا اصول ہے کہ اگر ضعیف روایات مختلف سندوں سے منقول ہوں تو حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ کر قابل استدلال ہو جاتی ہیں، اس لیے علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ''حدیث ضعیف جب کہ موضوع نہ ہو تو اس سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے''۔

(فتح القدیر: ۲/۹۵/ کتاب الجنائز)

چوں کہ شب برأت کی فضیلت جمہور کے نزدیک مسلم ہے، بلکہ اس کی فضیلت سے فائدہ اٹھانے کا اہتمام بھی ثابت ہے، جیسا کہ ابن حاج مکیؒ (''مدخل'' ص: ۲۴۸ میں) تحریر فرماتے ہیں کہ ''سلف صالحین اس رات کی تعظیم کرتے اور اس کے لیے پہلے سے تیاریاں کرتے تھے''۔ علامہ حصکفیؒ نے مندوبات ومستحبات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''عیدین اور نصف شعبان کی رات میں جاگنا مستحب ہے۔'' (شامی/ص: ۴۶۹/۲)

اس لیے مافی الباب روایت میں کچھ اسنادی ضعف ہے، تو وہ مؤید بالتعامل ہونے کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے، پھر تلقی بالقبول کی وجہ سے ضعیف روایت بھی قابل قبول ہو گئی، اتنی بات ضرور ہے کہ شب برأت میں عبادت کا کوئی خاص طریقہ یا اجتماعی طور پر عبادت ثابت نہیں۔ نیز شبِ برأت کا شب قدر کی طرح اہتمام بھی ثابت نہیں، اس میں انفرادی طور پر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام فرمایا، اجتماعی طور پر نہیں، شب قدر میں تو خصوصی طور پر ازواجِ مطہرات کو بیدار فرمانے کا اہتمام فرماتے تھے، جب کہ شب برأت میں سیدہ عائشہؓ پاس میں تھیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیدار کرنے کا اہتمام نہیں فرمایا۔

شبِ برأت کے اعمال واحکام:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اس رات میں مطلقاً عبادت کرنا اور دن میں روزہ رکھنا

بھی مستحب ہوگا، البتہ سنت یہ ہے کہ ہر ماہ کے ایامِ بیض کی طرح شعبان میں بھی اللہ تعالیٰ توفیق دیں تو ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخ میں روزہ رکھا جائے، اس کے علاوہ عبادات کا کوئی مخصوص طریقہ منقول نہیں ہے، لہٰذا جو عبادت آسان ہو انفرادی طور پر اس کو کرے، بہتر ہے کہ مغرب کے بعد مسجد میں ہو تو اعتکاف کی نیت کر کے صلوٰۃ الاوابین پڑھے، اس کے بعد تلاوتِ کلام اللہ اور ذکر کر لے، تاکہ "اُتْلُ مَـآ اُوْحِيَ ......الخ" میں جو تلاوت، نماز اور ذکر کی ترغیب آئی ہے اس پر عمل ہوجائے، پھر رات بھر جاگ کر عبادت کر سکتے ہوں تو فبہا، ورنہ نمازِ عشاء باجماعت پڑھ کر شروع حصہ میں کچھ آرام کر کے آخری حصہ میں اخیر تک ذکر واذکار اور دعا و مناجات میں مشغول رہے، جس کے ذمہ قضا باقی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قضا کا اہتمام کرے، اسی کے ساتھ اس رات اپنے لیے اور مرحوموں کے لیے دعاءِ مغفرت کرے، موقع ہو تو قبرستان جا کر مرحومین کے لیے ایصال ثواب اور دعاءِ مغفرت کرے، اگر چہ اس کا بھی اہتمام والتزام ثابت نہیں، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شب برأت میں قبرستان جانا اس رات کی خصوصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ عام معمول کی وجہ سے تھا، ورنہ آپ ﷺ کے ساتھ حضرات صحابۂ کرامؓ بھی ہوتے۔

بہرکیف! شب برأت کی فضیلت سے فائدہ اٹھانے کا یہی مطلب ہے کہ شریعت وسنت کے مطابق اس رات کو گذاریں، جہالت و بدعت کے ساتھ نہیں، جیسا کہ جہلاء کے یہاں ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر:

آئی ہے شب برأت بڑی دھوم دھام سے
زندوں نے حلوا کھایا مردوں کے نام سے

حق تعالیٰ ہمیں اپنی توفیق خاص سے اپنی رحمت وعنایت کے مواقع عطا فرما کر مغفرت وکامل رضا عطا فرمائے، آمین۔

جَزَی اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهۡلُهٗ.

(۳۵)

فضائلِ نمازِ تہجد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ أُمَامَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: "عَلَیۡکُمۡ بِقِیَامِ اللَّیۡلِ، فَإِنَّہٗ دَأۡبُ الصَّالِحِیۡنَ قَبۡلَکُمۡ، وَھُوَ قُرۡبَۃٌ لَّکُمۡ إِلٰی رَبِّکُمۡ، وَمَکۡفَرَۃٌ لِلسَّیِّئَاتِ، وَمَنۡھَاۃٌ عَنِ الۡإِثۡمِ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۱۰۹/ باب التحریض علیٰ قیام اللیل/ الفصل الثانی)

ترجمہ: **حضرت ابو اُمامہ** رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ **رحمت عالم** صلی اللہ علیہ وسلم نے **ارشاد فرمایا:** "تم ضرور قیامِ لیل کیا کرو (نمازِ تہجد پڑھا کرو) کیونکہ وہ تم سے پہلے صالحین کا شیوہ، شعار اور طریقہ رہا ہے، اور قربِ الٰہی کا تمہارے لیے خاص وسیلہ ہے، اور وہ برائیوں کو مٹانے والی اور معاصی سے محفوظ رکھنے والی چیز ہے۔"

نمازِ تہجد خواص کی عبادت ہے:

خالق کائنات نے اپنی خاص حکمت کے تحت دن کو روشن اور رات کو پر سکون بنایا، رات کے سناٹے میں جیسا سکون عموماً آرام میں اور خصوصاً عبادت میں ملتا ہے ویسا کسی دوسرے وقت میں نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ رات کی تنہائی میں عوام تو خوابِ غفلت میں مست ہوتے ہیں، مگر خواص یادِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں، بلکہ یہ لوگ رات کا ایسا انتظار کرتے ہیں جیسا دولہا شب زفاف کا۔ پھر رات آنے پر ان کی حالت وہ ہوتی ہے جس کو شاعر کے ایک

شعر میں یہ عاجز نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ یوں عرض کرتا ہے:

شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے الٰہی تیری یاد میں جلنے کے لیے

قرآنِ کریم نے ان ہی کی شان میں فرمایا:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (السجدة : ١٦)

''ان کے پہلو اس وقت (رات میں جو لوگوں کے سونے کا خاص وقت ہے) ان کی خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں۔'' یعنی میٹھی نیند اور نرم بستروں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام کرتے ہیں اور نمازِ تہجد پڑھتے ہیں۔

ایک اور مقام پر عباد الرحمٰن کی پہچان کراتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ (الفرقان : ٦٤)

''وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کی حالت میں رات گذارتے ہیں۔''

حدیث پاک میں بھی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

يَبِيْتُ يُجَافِيْ جَنْبُهٗ عَنْ فِرَاشِهٖ إِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْمُشْرِكِيْنَ الْمَضَاجِعُ

(بخاری: ١/١٥٥)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات اس حال میں گذارتے کہ پہلو بستر سے جدا ہوتا، جب کہ مشرکوں کے بستر ان کے بوجھ سے گرانبار ہو چکے ہوتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ تہجد خواص کی عبادت ہے، جیسا کہ حدیث مذکور سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نمازِ تہجد کی چار خصوصیتیں:

مزید اس حدیث میں نمازِ تہجد کی چار خصوصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں:

(۱) ”دَأبُ الصَّالِحِینَ قَبۡلَکُمۡ“ نمازِ تہجد کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دورِ قدیم سے صلحاء کا شعار، طریقہ اور ان کی عبادت رہی ہے۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک تو یہ کہ جب امم سابقہ کے اولیاء اور صلحاء نمازِ تہجد کا اہتمام کرتے تھے تو تمہیں بطریق اولیٰ اس کا اہتمام کرنا چاہیے، کیوں کہ تم تو خیر الامم ہو۔ دوسرا: اس طرف اشارہ ہے کہ نمازِ تہجد صالحین کا شیوہ ہے، جو اس کا اہتمام نہیں کرتا وہ صالحین (کاملین) میں سے نہیں۔

صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کا کمالِ بزرگی تک پہنچنا نمازِ تہجد کے بغیر مشکل ہے، شاید اسی بنا پر کہا گیا:

عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو یا غزالیؔ
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
(اقبال)

حدیث میں بھی ہے:

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ”أَشۡرَافُ أُمَّتِیۡ حَمَلَةُ الۡقُرۡآنِ، وَ أَصۡحَابُ اللَّیۡلِ“. (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوۃ/ص: ۱۱۰)

”میری امت کے شرفاء حاملین قرآن (قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے) اور تہجد گزار لوگ ہیں۔“

(۲) ”وَهُوَ قُرۡبَةٌ لَّکُمۡ إِلیٰ رَبِّکُمۡ“ نمازِ تہجد کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ قربِ الٰہی کا وسیلہ ہے، اس سے ربِ کریم کی قربت و محبت نصیب ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے:

عَنۡ عَمۡرِو بۡنِ عَبَسَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ”أَقۡرَبُ مَایَکُوۡنُ الرَّبُّ مِنَ الۡعَبۡدِ فِیۡ جَوۡفِ اللَّیۡلِ الۡاٰخِرِ، فَإِنِ اسۡتَطَعۡتَ أَنۡ تَکُوۡنَ مِمَّنۡ یَّذۡکُرُ اللّٰہَ فِیۡ تِلۡكَ السَّاعَةِ فَکُنۡ“. (رواہ الترمذی، مشکوۃ/ ص: ۱۰۹)

’’اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے، لہٰذا تم بھی اس وقت اس کے یاد کرنے والوں میں ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ۔‘‘ کہ اس وقت تہجد اور ذکر اللہ کے ذریعہ اس کا قرب بآسانی حاصل ہوسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک بندہ کے لیے اس سے بڑی کوئی سعادت ہرگز نہیں ہوسکتی، کیوں کہ ساری شریعت، عبادات اور طاعات سے مقصود معبودِ حقیقی کی قربت و محبت ہی تو ہے، جو نمازِ تہجد سے بآسانی حاصل ہوتی ہے، چناں چہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

”فِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى الْحَدِيثِ الْقُدُسِيِّ: "لَايَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ، حَتّٰى أُحِبَّهٗ“. (مرقاة المفاتيح/ص:١٤٨/ ٣)

اِس میں اُس حدیث قدسی کی طرف اشارہ ہے جس میں رب العالمین نے فرمایا کہ ’’بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں‘‘۔

اور نوافل میں افضل ترین نمازِ تہجد ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ” أَفْضَلُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الْمَفْرُوْضَةِ صَلٰوةٌ فِیْ جَوْفِ اللَّيْلِ“. (رواه أحمد، مشكوٰة/ ص: ١١٠/ الفصل الثالث)

’’فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل تہجد کی نماز ہے۔‘‘

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت اور قربت کے حصول کا یہ اہم ترین ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ’’صوفیہ اور عشاق کے لیے تہجد مثل براق کے ہے، جیسے شب معراج میں حضور ﷺ براق کے ذریعہ آن کی آن میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے، ایسے ہی صوفیہ بھی تہجد کے ذریعہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں‘‘۔

ایک حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں سے اللہ رب العزت محبت کرتے ہیں اور ان سے خوش ہوتے ہیں:

(۱) وہ شخص جو باغیوں کی جماعت سے رضائے الٰہی کے خاطر جہاد کرتا ہے، پھر یا تو وہ شہید ہو جاتا ہے یا حق تعالیٰ اس کی مدد نصرت اور کفایت فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے کہ میرے اس بندے کو دیکھو، میرے لیے کیسے صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا۔

(۲) وہ شخص جس کی کوئی خوبصورت بیوی اور نرم نرم عمدہ بستر ہو، اور وہ رات میں نمازِ تہجد کے لیے اٹھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اس بندے نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا اور مجھے یاد کیا، اگر چاہتا تو آرام کرتا''۔

(۳) وہ شخص جو قافلہ کے ساتھ سفر میں ہو، اہل قافلہ رات دیر تک جاگتے رہے، پھر سو گئے، لیکن یہ شخص رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر خاموشی سے عبادت میں لگ گیا۔(المعجم الکبیر للطبرانی و الترغیب و الترھیب /ص:٤٢٩)

دیکھئے! اس روایت میں جن تین خوش نصیب انسانوں کو محبوبِ الٰہی ہونے کی ضمانت دی گئی ہے ان میں سے دو تو وہ ہیں جو راتوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے ہیں اور اس کی عبادت سے رات کو زندہ رکھنے والے (تہجد گزار) ہیں۔

(از ندائے شاہی/ص:۳۲/ستمبر ۲۰۰۸ء)

اس لیے فرمایا: ''وَهُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ إِلىٰ رَبِّكُمْ''.

(۳) نمازِ تہجد کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ '' مَكْفَرَةٌ لِلسَّيِّئَاتِ '' کفارۂ سیئات کا ذریعہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ أَقِمِ الصَّلوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرىٰ لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ (الھود : ١١٤)

نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، اور نمازِ تہجد بہت بڑی نیکی ہے، اس سے حق تعالیٰ گناہوں کو مٹاتے ہیں، جیسے موسم پت جھڑ میں تیز وتند ہوا درخت سے سوکھے پتوں کو گرا دیتی ہے اسی طرح نمازِ تہجد گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔

(۴) ''وَمَنُهـاَةٌ عَنِ الإِثُمِ'' اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچاتی ہے، اور ترکِ معاصی سے تہجد کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اور تہجد سے حفظ معاصی کی توفیق ملتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ سے کسی کے متعلق یہ شکایت کی گئی کہ فلاں آدمی رات کو تہجد تو پڑھتا ہے، مگر دن میں چوری کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّـهٗ سَيَنُهَـاهُ''. عنقریب اس کو تہجد کی نماز برائی سے روک دے گی۔ (رواہ أحمد، مشکوٰۃ/ص: ۱۱۰)

کیوں کہ نماز کی یہی خاصیت ہے کہ اگر اسے صحیح طریقہ پر قائم کیا جائے تو وہ نمازی کو برائی سے روکتی ہے۔ غرض نماز اور تہجد سے حفظ معاصی کی توفیق ملتی ہے۔

چناں چہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوکر کہنے لگا: ''حضرت! تہجد کی توفیق نہیں ملتی، کوئی ترتیب بتلائیں۔'' تو آپؒ نے فرمایا: ''دن میں معاصی سے اجتناب کرو تو رات میں تہجد کی توفیق نصیب ہوگی۔'' (ماخوذ از: ''تصفیۃ القلوب''/ص:۱۰۸)

معلوم ہوا کہ ترکِ معاصی اور توفیق تہجد لازم ملزوم ہیں۔

نمازِ تہجد کی اہمیت وفضیلت:

بہر حال! نمازِ تہجد اہم ترین عبادت اور عظیم ترین دولت ہے، اس کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ شانہ نے رحمت عالم ﷺ کو اس کا حکم دینے کے ساتھ آپ ﷺ کو اس کی ادائیگی پر مقامِ محمود کی بشارت سنائی، چناں چہ فرمایا:

﴿وَمِنَ اللَّيُلِ فَتَهَجَّدُ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى أَنُ يَّبُعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحُمُوُدًا﴾ (بنی إسرائیل : ۷۹)

''اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو، جو آپ کے لیے ایک اضافی (وخصوصی)

عبادت ہے، امید ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود تک پہنچائے گا۔''

اور ''مقامِ محمود'' عالم آخرت اور جنت میں اعلیٰ ترین اور بلند ترین مقام ہے، محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقامِ محمود اور نمازِ تہجد میں کوئی خاص نسبت اور تعلق ہے، اس لیے جو امتی نمازِ تہجد سے شغف رکھے گا ان شاء اللہ مقامِ محمود میں کسی درجہ کی حضور ﷺ کی رفاقت اس کو بھی نصیب ہوگی''۔

(معارف الحدیث/ص:۳۴۷/۳)

ایک حدیث میں ہے کہ جنت میں ایسے صاف شفاف بالا خانے ہیں کہ باہر سے ان کا اندرون نظر آئے گا اور اندر سے باہر کا حصہ نظر آئے گا، اور یہ بالا خانے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کیے ہیں جن کی یہ صفات ہوں:

"أَلَانَ الْكَلَامَ، وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَتَابَعَ الصِّيَامَ، وَصَلّٰى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ".

(ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۰۹)

(۱) جو لوگوں سے نرمی کے ساتھ گفتگو کریں۔ (۲) غریبوں کو کھلائیں۔ (۳) نفلی روزے رکھیں۔ (۴) تہجد پڑھیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "يُحْشَرُ النَّاسُ فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُنَادِيْ مُنَادٍ، فَيَقُوْلُ:" أَيْنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ، فَيَقُوْمُوْنَ، وَهُمْ قَلِيْلٌ، فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ، ثُمَّ يُؤْمَرُ لِسَائِرِ النَّاسِ إِلَى الْحِسَابِ". (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة/ص:٤٨٧)

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''لوگوں کو قیامت کے دن ایک میدان میں جمع کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا ایک منادی اعلان کرتے ہوئے کہے گا کہ ''کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو خواب گاہوں سے الگ رہتے تھے'' (مراد، صلوٰۃ الاوابین پڑھنے والے یا پھر نمازِ

عشاء وفجر باجماعت پابندی سے پڑھنے والے، یا تہجد گزار ہیں) وہ لوگ کھڑے ہوں گے جو کم ہوں گے پھر بلاحساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے، پھر بقیہ تمام لوگوں کو حساب کی طرف جانے کا حکم ہوگا۔" معلوم ہوا کہ تہجد کا صلہ بلاحساب جنت کا داخلہ ہے۔

جب یہی بات ہے تو اب مقامِ محمود، بلا حساب وکتاب داخلۂ جنت اور اس کی نعمتوں اور حوروں کا طلبگار کیوں سوئے؟ منقول ہے کہ شیخ مظہر سعدی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے شوق میں برابر ساٹھ سال تک روتے رہے تھے، ایک شب انہوں نے خواب میں دیکھا کہ گویا نہر کا ایک کنارہ مشک خالص سے بہہ رہا ہے، اس کے دونوں کناروں پر لؤلؤ کے درخت ہیں جو سونے کی شاخوں کے ساتھ لہلہا رہے ہیں، اتنے میں چند لڑکیاں حسن و جمال میں یکتا بن ٹھن کر آئیں اور پکار پکار کر یہ الفاظ گانے لگیں:

"سُبْحَانَ الْمُسَبَّحِ بِكُلِّ لِسَانٍ، سُبْحَانَ الْمَوْجُوْدِ بِكُلِّ مَكَانٍ، سُبْحَانَ الدَّائِمِ فِيْ كُلِّ زَمَانٍ، سُبْحَانَهٗ سُبْحَانَهٗ". (تذكرة القرطبى: ٢/٤٨)

"پاک ہے وہ ذات جس کی ہر زبان پاکی بیان کرتی ہے، پاک ہے وہ ذات جو ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے وہ ذات جو ہر زمانے میں رہنے والی ہے، پاک ہے وہ، پاک ہے وہ۔"

شیخ نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ

ذَرَأَنَـــا إِلٰـــهُ النَّـــاسِ رَبُّ مُـحَـمَّـدٍ
لِـقَـوْمٍ عَـلـىٰ الْأَقْـدَامِ بِـالـلَّيْلِ يَقُوْمُ

"ہمیں لوگوں کے معبود اور حضرت محمد ﷺ کے رب نے ان لوگوں کے لیے پیدا کیا جو رات کو (اپنے پروردگار کے سامنے عبادت اور تہجد کے لیے) قدموں پر کھڑے رہتے ہیں۔" (جنت کے حسین مناظر: ۴۵۱)

اس واقعہ سے بھی نمازِ تہجد کی بڑی اہمیت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے حصول کے لیے ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے، بلکہ اس کے حصول کے لیے ہر قسم کے اسباب اختیار کرنے چاہییں۔

نمازِ تہجد کے اسبابِ ظاہری و باطنی:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ’’نمازِ تہجد اور شب بیداری کے لیے چار ظاہری اور چار باطنی اسباب ہیں: (اسباب ظاہری میں)

(۱) پہلا سبب قلت طعام ہے، کیوں کہ زیادہ کھانا زیادہ پانی پینے کا سبب ہوتا ہے، اور زیادہ پانی پینے سے نیند کا غلبہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے قیامِ لیل (نماز تہجد پڑھنا) دشوار ہوجاتا ہے، اسی بنا پر بعض مشائخ کا معمول رہا کہ وہ دسترخوان پر اپنے مریدوں کو کھڑے ہوکر فرماتے: ”لَا تَاْكُلُوْا كَثِيْرًا، فَتَشْرَبُوْا كَثِيْرًا، فَتَرْقُدُوْا كَثِيْرًا، فَتَحْسَرُوْا عِنْدَ الْمَوْتِ كَثِيْرًا“. زیادہ نہ کھاؤ، کہ یہ زیادہ پانی پینے کا سبب ہوگا، پھر اس کی وجہ سے نیند زیادہ آئے گی۔ (اور رات کی عبادت نہ ہوگی تو) جس سے موت کے وقت حسرت زیادہ ہوگی۔

(۲) دن میں کثرتِ مشاغل اور دشوار امور میں تخفیف کرنا، کیوں کہ جب تھکان زیادہ ہوگی تو نیند کا غلبہ ہوگا، پھر قیامِ لیل بھی دشوار ہوگا۔

(۳) دن میں قیلولہ کرنا۔ (دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر لیٹ جانا قیلولہ کہلاتا ہے، جو سنت ہے، اس مسنون عمل کے لیے سونا ہی ضروری نہیں، صرف لیٹ جانا بھی کافی ہے) یہ قیامِ لیل میں معاون ہوتا ہے، اس لیے صحابہؓ اور صلحاء اس کا خاص اہتمام کرتے تھے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کو معلوم ہوا کہ ان کا ایک عامل دن میں قیلولہ نہیں کرتا، تو آپؓ نے اس کو ایک خط لکھا جس کا مضمون اس طرح تھا: ”أَمَّـا بَعْدُ، فَقِلْ! فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَقِيلُ“. یعنی قیلولہ کرو! کیوں کہ شیطان قیلولہ نہیں کرتا۔

(مختصر قیام اللیل للمروزی/ باب الاستعانۃ بقائلۃ النہار علی قیام اللیل)

(۴) دن میں خصوصی طور پر معاصی سے اجتناب کرنا۔ کیوں کہ قیامِ لیل بڑی

شرف وفضیلت کی چیز ہے جس کا گنہگار اہل نہیں، اس لیے جو دن میں گناہوں سے نہیں بچتا اسے رات میں تہجد کی توفیق نہیں ہوتی۔

نمازِ تہجد کے باطنی اسبابِ اربعہ یہ ہیں:

(۱) قلب کو کینہ، بدعت اور دنیوی ہموم وافکار سے محفوظ رکھنا، کہ بیمار جسم میں ہمت نہیں ہوتی تو بیمار دل کو بھی توفیق نہیں ہوتی۔

(۲) خوفِ آخرت اور عذابِ جہنم کے ہولناک مناظر کا تصور کرنا۔ یہ بھی انسان کو نیند سے روکتا ہے، حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ ''جہنم کے تصور نے عابدین کی نیند اڑادی''۔

(۳) نمازِ تہجد کے فضائل میں جو آیات، احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں ان کو پڑھے اور سوچے، تاکہ اس عمل کے اجروثواب کے حصول کا شوق پیدا ہو۔

(۴) نمازِ تہجد کا اہتمام کرنے والا اس بات کا یقین پیدا کرے کہ اس نمازِ تہجد میں جو کچھ قرآن کی تلاوت کرتا ہوں حق تعالیٰ خود اس کو سنتے ہیں، گویا میں اس طرح حق تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہوں، جو بہت ہی عظیم شرف وفضل کی بات ہے۔

(مستفاد از: ''اکابر کا مقامِ عبادت/ص: ۱۱۸ تا ۱۲۱)

صاحبو! حق یہ ہے کہ جسے توفیق تہجد نصیب ہو جائے اس کا دن تو روشن اور نورانی ہوتا ہی ہے، رات بھی روشن اور منور ہوتی ہے، اور وہ خود بھی آسمان کی مخلوق فرشتوں کو زمین پر ایسا روشن نظر آتا ہے جیسے زمین والوں کو آسمان کے ستارے روشن نظر آتے ہیں۔

اس لیے تہجد کا اہتمام خود کرنا چاہیے، مگر اب چوں کہ ضعف کا زمانہ ہے، لوگوں سے اٹھا نہیں جاتا، اس لیے کم ازکم نمازِ عشاء کے بعد وتر سے پہلے ہی چند یا پھر صرف دو ہی رکعتیں تہجد کی نیت سے پڑھ لیں، ان شاء اللہ اس سے بھی تہجد کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

حق تعالیٰ ہمیں تہجد کی توفیق پابندی کے ساتھ نصیب فرمائے، آمین۔

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَا ھُوَ أَھْلُہٗ.

(۳۶)

فضائل جمعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡ لُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: خَیۡرُ یَوۡمٍ طَلَعَتۡ عَلَیۡہِ الشَّمۡسُ یَوۡمُ الۡجُمُعَۃِ، فِیۡہِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِیۡہِ أُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ، وَفِیۡہِ أُخۡرِجَ مِنۡھَا، وَلَا تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ إِلَّا فِیۡ یَوۡمِ الۡجُمُعَۃِ". (مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۱۱۹/ باب الجمعۃ/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان سارے دنوں میں سے جن میں آفتاب نکلتا ہے (یعنی ہفتہ کے سارے دنوں میں) سب سے بہتر جمعہ کا دن ہے، جمعہ ہی کے دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے، جمعہ ہی کے دن آپ جنت میں داخل کیے گئے، اور جمعہ ہی کے دن جنت سے باہر کر کے اس دنیا میں بھیجے گئے، (جہاں ان سے نسل انسانی کا سلسلہ چلا) اور قیامت بھی خاص جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔

جمعہ میں جامعیت کی شان ہے:

حکومتی سطح پر اسبابِ ظاہری میں سب سے بڑی طاقت اور قوت جمعیت اور اجتماعیت تسلیم کی جاتی ہے، اسی لیے جب کسی وقت ایک ہی صف میں نماز کے لیے (اور میدانِ عرفات میں) شاہ و گدا، حاکم و محکوم، امیر و مامور، عربی و عجمی، حبشی و رومی، عامی و نامی،

سب کے سب اکٹھے ہو جائیں تو اس جمعیت اور اجتماعیت کے نتیجے میں جہاں ایک طرف انسانی برادری کا ایک تصور قائم ہو کر احترامِ آدمیت کا درس ملتا ہے، وہیں دوسری طرف اس کی برکت سے عظیم الشان امور و کارنامے بھی بآسانی و بخوبی انجام دیے جاسکتے ہیں، جو انفرادی صورت میں ممکن نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے ہر وہ چیز جس میں جمعیت اور اجتماعیت کی شان ہو اس کی عظمت و اہمیت اور نعمت و فضیلت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔

اس اصول کے پیش نظر اگر غور کیا جائے تو جمعہ کی عظیم الشان فضیلت ظاہر ہوتی ہے، کیوں کہ جمعہ "جَـمْـعٌ" سے بنا، اور جامعیت کی شان جمعہ میں موجود ہے، وہ اس طرح کہ روزانہ پانچ وقت کی نماز میں تو ایک محدود حلقہ یعنی ایک ہی محلّہ کے مسلمان جمع ہو کر مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، لیکن جمعہ کے دن پورے شہر اور اس کے مختلف محلوں کے مسلمان کسی بڑی مسجد میں جمع ہو کر جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں، جس سے اجتماع کی ایک صورت ہو جاتی ہے۔

یاد رکھو! شریعت میں نمازِ جمعہ کا جو حکم ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہر یا آج کل ایک بستی میں حتیٰ الوسع ایک ہی جگہ نماز جمعہ ادا کرنی چاہیے، ہاں اگر ایسی کوئی مسجد شہر یا بستی میں موجود نہ ہو جس میں سارے نمازی آسکیں تو پھر حسب ضرورت شہر کی اور بھی مناسب مساجد کو نمازِ جمعہ کے لیے تجویز کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا لحاظ بھی ضرور رہے کہ علاقے کے ایک حلقہ میں حتی الامکان جمعہ ایک ہی مسجد میں ہو، یہ طریقہ کہ ہر محلّہ کی ہر چھوٹی مسجد میں الگ الگ جمعہ ہو، یہ مقصد شریعت کے خلاف ہے۔ اس سے جمعہ میں جامعیت کی شان باقی نہیں رہتی۔

جمعہ میں ہے جامعیت کی شان
کاش ہمیں بھی ہو جائے اس کی پہچان

اس کے علاوہ بھی جمعہ میں متعدد وجوہات سے جامعیت کا مفہوم پایا جاتا ہے، وہ

اس طرح کہ اللہ رب العزت کی طرف سے اس کائنات میں تکوینی اور تشریعی اعتبار سے جتنے بھی بڑے بڑے امور رونما ہوئے وہ سب کے سب جمعہ ہی میں ظاہر ہوئے۔

جمعہ کی وجہ تسمیہ:

اس لیے علماء نے جمعہ کی وجہ تسمیہ میں مختلف توجیہات اور وجوہات بیان کی ہیں، مثلاً:

(۱) تخلیق انسانی کا سامان جمعہ ہی کے دِن جمع کیا گیا، حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی وہ جمعہ ہی کے دِن جمع کی گئی، حدیث میں ہے:

"لِأَنَّ فِيُهَا طُبِعَتُ طِيُنَةُ أَبِيُكَ آدَمَ". (روه أحمد، مشكوٰة/ص : ۱۲۱/ باب الجمعة/الفصل الثالث)

"اس لیے کہ اس میں تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی مٹی جمع کر کے خمیر بنایا گیا۔"

چوں کہ تخلیق آدم کا سامان جمعہ ہی کے دِن جمع کیا گیا اس وجہ سے اس دن کو جمعہ کہتے ہیں۔

(۲) بعض کا کہنا ہے کہ جمعہ "اجتماع" سے نکلا ہے، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کے قالب اور قلب کو اس دن جمع کیا گیا، یہ دونوں چالیس سال کی جدائی کے بعد آپس میں جمع ہوئے تھے، اس لیے اس کا نام جمعہ ہوا۔ (مسائل جمعہ/ص: ۲۷)

(۳) حضرت آدم علیہ السلام کے تخلیقی مادہ کو جمع کرنے کے بعد جمعہ ہی کے دِن ان کی تخلیق کی تکمیل ہوئی، جس کا ذکر حدیث مذکور میں ہے: "فِيُهِ خُلِقَ آدَمُ" انسانِ اول سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی، جس کے بعد نسل انسانی کا سلسلہ چلا، یعنی انسانیت کی زندگی کا پہلا دن جمعہ ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام جو سارے انسانوں کے جامع اور کاروانِ انسانیت کے فردِ اول ہیں، انہیں جمعہ کی آخری گھڑی میں پیدا کیا گیا، اور حدیث میں جو فرمایا کہ "جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو دعا مانگی جائے وہ یقیناً قبول

ہوتی ہے‘‘۔ بعض علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ گھڑی ہے جس میں سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی۔

جمعہ کے فضائل:

الغرض! جمعہ میں جامعیت کی شان ہونے کے سبب بھی یہ ایک عظیم الشان دن ہے، جمعہ کی اس عظمت شان کی وجہ سے اسے سید الایام فرمایا گیا۔ ویسے تو تمام ہی دن رات اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں، لہٰذا ہر کوئی بندہ ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت واذکار سے منور بنا سکتا ہے، لیکن ہفتہ کے دنوں میں جمعہ کے دن اور رات کی خاص فضیلت ہے، جمعہ کا دن نورانی ہے تو رات روشن ہے۔

”لَيُلَةُ الْجُمُعَةِ لَيُلَةٌ أَغَرُّ، وَيَوُمُ الْجُمُعَةِ يَوُمٌ أَزُهَرُ“. (رواه البيهقى فى الدعوات الكبير، مشكوٰة/ص: ۱۲۱)

نیز مذکور حدیث میں فرمایا کہ سب سے بہترین دن جمعہ کا ہے:

”خيرُ يَوُمٍ طَلَعَتُ عَلَيُهِ الشَّمُسُ يَوُمُ الْجُمُعَةِ“.

دوسری حدیث میں ہے:

عَنُ أَبِىُ لُبَابَةَ بُنِ عَبُدِ الْمُنُذِرِؓ قَالَ: قَالَ النَّبِىُّ ﷺ: ”إِنَّ يَوُمَ الْجُمُعَةِ سَيِّدُ الْأَيَّامِ وَأَعُظَمُهَا عِنُدَ اللّٰهِ، وَهُوَ أَعُظَمُ عِنُدَ اللّٰهِ مِنُ يَوُمِ الْأَضُحٰى وَيَوُمِ الْفِطُرِ“.

(رواه ابن ماجه، مشكوٰة/ص: ۱۲۰/ الفصل الثالث)

جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے، حق تعالیٰ کے نزدیک ہفتہ کے تمام دنوں میں سب سے عظیم ہے، اور عید الاضحیٰ وعید الفطر سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عظمت ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ ”جمعہ ہفتہ کی عید ہے۔“ اور عید کا دن خوشی کا ہوتا ہے تو جمعہ کا دن بھی خالق کی خوشنودی حاصل کرنے کا دن ہے، اسی وجہ سے اس دِن مخلوق پر خاص انعام ہوتا ہے، اس دن انتقال کرنے والے کے لیے بڑی بشارتیں حدیث میں آئی ہیں، ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ إِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ". (رواه أحمد والترمذی، مشكوٰة /ص: ۱۲۱/ باب الجمعة/ الفصل الثالث)

"جو مسلمان جمعہ کے دن یا رات (جمعرات کا دن ختم ہوکر جو رات آتی ہے اس) میں انتقال کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو عذابِ قبر سے محفوظ رکھتے ہیں، یعنی سوال و جواب اور عذاب سب سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

علماءِ محدثین کے قول کے مطابق اس حدیث کے اگرچہ مطلق و مقید دونوں ہونے کا احتمال ہے، لیکن شراحِ حدیث فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو مطلق رکھنا اللہ تعالیٰ کے فضل پر نظر رکھتے ہوئے اولیٰ ہے۔ پھر ملا علی قاریؒ نے تو مرقات میں دیگر روایات کو لاکر یہ ثابت کیا کہ جمعہ کے دن یا رات میں مرنے والا قیامت میں حساب سے بھی محفوظ رہے گا اور اس حالت میں حاضر ہوگا کہ اس کی پشت پر شہیدوں کی مہر لگی ہوگی۔ (رزقنا اللّٰہ بمنه و فضله) (مرقات، از مواہب ربانیہ/ ص: ۳۷، مظاہر حق جدید: ۱/۱۰۰۳)

کیوں کہ آخرت کی منازل میں پہلی منزل قبر ہے، اس کا سہولت سے طے ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ ان شاء اللہ آئندہ تمام مراحل سے وہ بآسانی گذر جائے گا۔

صاحبو! جیسے حق تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام میں ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء بنایا، فرشتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سید الملائکہ بنایا، کتابوں میں قرآنِ کریم کو سید الکتب بنایا اور مہینوں میں رمضان المبارک کو سید الشہور بنایا اسی طرح ہفتہ کے دنوں میں جمعہ کو سید الایام اور افضل الایام بنایا۔

جمعہ کی خصوصیتیں:

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا دن عام دنوں کی طرح نہیں، بلکہ اس کی بہت سی فضیلتیں اور خصوصیتیں ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں جمعہ کی پانچ خصوصیتوں کا ذکر ملتا ہے:

(۱) ”خَلَقَ اللّٰهُ فِيهِ آدَمَ“.

اس مقدس دن میں کاروانِ انسانی کے پہلے فرد سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے پیدا فرمایا، تو یہ انسانی زندگی کا پہلا دن ہوا، پھر اس دن اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت میں داخل فرمایا، اس اعتبار سے جنتی زندگی کا بھی یہ پہلا دن ہوا، جس کی تفصیل گذر چکی۔

(۲) وَ أَهْبَطَ اللّٰهُ فِيهِ آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ“.

اس مقدس دن میں کاروانِ انسانی کے پہلے فرد سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے جنت سے زمین پر اتارا، لہٰذا دنیوی زندگی کا بھی پہلا دن جمعہ ہے، بظاہر ان کا جنت سے نکلنا اور دنیا میں اترنا کوئی بڑا کارنامہ معلوم نہیں ہوتا جسے فضیلت وخصوصیت کے مقام پر ذکر کیا جائے، لیکن کون نہیں جانتا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر نہ اتارا جاتا تو یہ بزمِ جہاں کیسے قائم ہوتی؟ حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقدس سلسلہ کیسے جاری ہوتا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا شرف ہمیں کیسے حاصل ہوتا؟ انسانوں میں پوشیدہ کمالات واخلاق کیوں کر نمایاں ہوتے؟ یہ سب حق تعالیٰ کو منظور تھا اس لیے جب دنیا کا گھر سیدنا آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے رہنے کے لیے تیار ہوگیا، زمین کا فرش اور آسمان کی چھت تیار ہوگئی، چاند، سورج اور ستاروں کی روشنی کا انتظام ہوگیا، سمندر، نہریں اور زمین میں دوسری تمام ضروریات وزینت کی چیزیں تیار ہوگئیں، تو اب جس کے لیے انتظام اور اہتمام کیا گیا تھا اس آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن جنت سے زمین کی طرف اتارا گیا، گویا جمعہ اس دنیا کا پہلا دن تھا اور اسی مقدس دن میں اس عارضی دنیا کا افتتاح سیدنا آدم علیہ السلام کے دست مبارک سے ہوا۔

(۳) ”وَفِيهِ تَوَفَّى اللّٰهُ آدَمَ“.

اس مقدس دن میں کاروانِ انسانی کے پہلے فرد سیدنا آدم علیہ السلام کا دنیوی سفر

بحسن وخوبی مکمل ہو گیا۔ یعنی ان کی وفات ہوئی، اور موت چوں کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا سبب ہے، اس اعتبار سے بھی یہ دن مبارک ہوا۔ تو جمعہ ہی کے دن ان کی وفات اور عارضی دنیا سے اصلی گھر کے لیے واپسی ہوئی۔

جمعہ کے دن کی مقبول گھڑی:

(٤) ”وَفِيهِ سَاعَةٌ لَا يَسْأَلُ الْعَبْدُ فِيهَا شَيْئًا إِلَّا أَعْطَاهُ، مَا لَمْ يَسْأَلْ حَرَامًا“.

”اس مقدس دن میں ایک نہایت مختصر گھڑی ایسی ہے کہ اس میں ہر دعا قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ دعا اور سوال حرام کے متعلق نہ ہو۔“ وہ خصوصی گھڑی جس میں دعا قبول ہوتی ہے اسے متعین نہیں کیا گیا بلکہ مخفی رکھا گیا، جس طرح راتوں میں شب قدر اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں اسم اعظم کو چھپا رکھا ہے، بظاہر اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ (قیمتی ہیرے دکھائے نہیں جاتے، ان کو تلاش کرنا پڑتا ہے، شب قدر، اسم اعظم اور جمعہ کی ساعت اجابت بھی قیمتی ہیرے کے مانند ہیں، ان کو پانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے) تاکہ اس مقدس دن میں مسلمانوں کا اکثر وقت دعا اور توجہ الی اللہ میں گذرے، تاہم شارحین حدیث نے جمعہ کی ساعت قبولیت کے متعلق مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔

صاحب مظاہر حق نے ۳۵/ اقوال ذکر فرمائے ہیں۔ (۱/۹۹۷) لیکن یہ سب ظنی و تخمینی ہیں، قطعی ویقینی نہیں، البتہ ان میں دو قول ایسے ہیں جن کا ذکر صراحۃً یا اشارۃً بعض احادیث میں بھی ملتا ہے۔

پہلا قول یہ ہے کہ جس وقت امام خطبۂ جمعہ کے لیے منبر پر جائے تب سے نماز جمعہ ختم ہونے تک کا وقت قبولیت کا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عصر کے بعد سے لے کر غروبِ آفتاب تک کا وقت قبولیت کا ہے۔ حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ النعمان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی قول کو پسند فرمایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں یہ دونوں اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا خیال یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ”ان دونوں باتوں کا مقصد بھی حتمی تعین نہیں ہے، بلکہ ظنی تحدید ہے، منشا صرف یہ ہے کہ خطبہ اور نماز کا وقت چوں کہ بندگانِ خدا کی توجہ الی اللہ اور عبادت ودعا کا خاص وقت ہے، اس لیے اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ساعت اسی وقت میں ہو، اور اسی طرح چوں کہ عصر کے بعد سے غروب تک کا وقت نزولِ ملائکہ کا وقت ہے، اور وہ پورے دن کا گویا نچوڑ ہے، اس لیے اس وقت بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ساعت غالباً اس مبارک وقفہ میں ہو“۔

ایک حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”اِلْتَمِسُوْا السَّاعَةَ الَّتِيْ تُرجٰى فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ إِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ“. (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۱۲۰/الفصل الثانی)

”جمعہ کے دن اس ساعت کو جس میں دعا کی قبولیت کی امید ہے عصر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک تلاش کرو“۔ اسی وجہ سے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور تمام اہل بیت رضی اللہ عنہم خصوصاً (اور حضرات صحابہؓ عموماً) اپنے خادموں کو متعین کرتے کہ وہ جمعہ کے دن آخری گھڑی کا خیال رکھیں اور سب کو یاد دلائیں، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دعا میں مشغول ہوجائیں۔ (مظاہر حق جدید: ۱/۹۹۷)

اس لیے بہت سے اکابر جمعہ کے ان دونوں اوقات میں خصوصاً عصر سے مغرب تک مسجد سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا اور بات چیت کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ بہ نیت اعتکاف نماز یا ذکر ودعا اور توجہ الی اللہ میں مصروف رہتے اور فرماتے تھے کہ ”اسی وقت میں بہت کچھ ملتا ہے“، ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔

(۵) ”وَفِيْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ“. (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص: ۱۲۰/ کتاب الصلوٰۃ/ باب الجمعۃ/ الفصل الثالث)

''اسی مقدس دن میں قیامت قائم ہوگی''۔ اس لیے دنیا کا آخری دن بھی جمعہ ہے، کہ قیامت اسی کے بعد قائم ہوگی (مراد نفخۂ اولیٰ ہے) جس میں نیکوں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور بدلہ دخولِ جنت کی شکل میں ملے گا، اور جس میں اولین وآخرین کو جمع کیا جائے گا''۔

فقیہ النفس حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ''قیامت کا برپا ہونا خواہ کفار کے حق میں برا ہو، مگر مومنین کے حق میں خیر ہے؛ کیوں کہ جب قیامت برپا ہوگی تبھی مومنین کو جنت ملے گی، تو گویا مومنین جنت میں جمعہ کے دن جائیں گے۔ (از: ''تحفۃ الالمعی: ۲/۳۵۰)

جب قیامت قائم ہوگی تو قبروں میں جو کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں انسان دفن ہوئے ہیں انہیں میدانِ محشر میں جمعہ کے دِن جمع کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس میں جامعیت کی خصوصی شان ہے، اس طرح جمعہ دنیا کا پہلا اور آخری دن ہے، اور یہ بھی اس کی عجیب خصوصیت ہے۔

فضائلِ اعمال میں سب سے زیادہ فضیلت والی صحیح حدیث:

بہر حال جمعہ کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اس اہم اور شاندار ہفتہ واری اجتماعی نماز کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا گیا اور امت مسلمہ کے لیے نمازِ جمعہ کی حاضری اختیاری نہیں بلکہ لازمی قرار دی گئی، تاکہ مسلمانوں کا یہ مقدس ہفتہ واری اجتماع توجہ الی اللہ اور ذکر ودعا کی باطنی وروحانی برکات کے علاوہ ظاہری حیثیت سے بھی بارونق، پاکیزہ، پربہار اور اجتماعیت کی ایک بہترین مثال ہو جائے۔ احادیث مبارکہ میں نمازِ جمعہ کے بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں، ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ''جو شخص جمعہ کے دن نہلائے (بیوی کو اس سے صحبت کرکے) اور خود بھی نہائے، پھر سویرے جلدی نمازِ جمعہ کے لیے پیدل جائے اور امام کے قریب بیٹھ کر توجہ سے خطبہ سنے (اور کوئی بے ہودہ بات زبان سے نہ نکالے) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطُوَةٍ عَمَلُ سَنَةٍ، أَجْرُ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا". (مشكوٰة : ١٢٢)

"ایسے شخص کو ہر قدم پر ایک سال کے روزے اور قیامِ لیل (نماز تہجد) کا ثواب ملتا ہے"۔ اس پر حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ "اگر ایک قدم پر ایک روزہ اور ایک رات کی تہجد کا ثواب ملتا تب بھی ظاہر ہے کہ بہت تھا، چہ جائے کہ ایک سال کے روزوں اور تہجدوں کا ثواب! اس لیے میں کہتا ہوں کہ "فضائل اعمال میں کوئی صحیح حدیث اس سے زیادہ فضیلت والی میرے علم میں نہیں"۔

(الدر المنضود شرح ابوداود ص:۴۴۷، از: "مظاہر العلوم" /ص:۳۴/ جولائی ۲۰۰۳ء)

یعنی اسکا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن ان چھ اعمال کا اہتمام کرے: (۱) غسل جمعہ۔ (۲) مسجد میں جلد (وقت ہوتے ہی) جانا۔ (۳) پیدل جانا۔ (الا یہ کہ کسی کو خاص عذر ہو) (۴) امام کے قریب بیٹھنا۔ (۵) خطبہ غور سے سننا۔ (۶) کوئی لغو کام نہ کرنا۔ تو اس کو ہر قدم کے بدلے میں ایک سال کے نفل روزے رکھنے اور ایک سال قیام (نفل نماز) کا ثواب ملے گا۔ (مشکوٰۃ /ص:۱۲۲)

ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ میں فرمایا کہ "نفلی عبادت میں فضیلت کے اعتبار سے اس سے زیادہ فضیلت کی کوئی صحیح روایت میری نظر سے نہیں گذری"۔ (مرقاۃ:۳/۲۵۶)

ترکِ جمعہ کی وعید:

اس کے برخلاف جو شخص جمعہ ترک کردے اس کے لیے سخت وعید بھی ہے:

عَنْ أَبِي الْجَعْدِ الضَّمْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا، طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهِ". (رواه أبوداود، مشكوٰة/ص:١٢١)

"جس نے محض سستی سے تین جمعہ ترک کیے اس کے دل پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ،

كُتِبَ مُنَافِقًا...... الخ (رواه الشافعي، مشكوٰة/ص:۱۲۱)

''جس نے بلا عذر کے ایک (یا تین) جمعہ کو چھوڑ دیا اسے ہمیشہ کے لیے منافق (عملی) لکھ دیا جائے گا''۔

ان حدیثوں میں جمعہ کی جو غیر معمولی اہمیت وفضیلت بیان فرمائی گئی اور اس کے ترک پر جو وعیدیں سنائی گئیں وہ کسی تشریح وتوضیح کی محتاج نہیں، لیکن افسوس کہ آج بعض ناواقف مسلمانوں کو جمعہ کے دن کی اہمیت کا احساس تک نہیں۔

اس کو کسی شاعر نے یوں کہا ہے:

افسوس! کہ جمعہ سے کوئی واقف بھی نہیں ہے ترکیب تو دیکھو زمانے کے چلن کی

مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے گرجا میں تو کرنیل وکمشنر بھی ہیں موجود

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جنہوں نے یوم السبت (یعنی سنیچر) جو ان کا مقدس دن تھا اس) کی بے حرمتی کی تو قرآن کہتا ہے کہ ان کی شکلوں کو مسخ کر دیا گیا ،کہیں ایسا نہ ہو کہ امت محمدیہ میں جو لوگ جمعہ کی بے حرمتی کرتے ہیں ان کے دلوں کو مسخ کر کے مہر لگا دی جائے ،جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔لہٰذا بنی اسرائیل کے انجامِ بد سے ڈر کر اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیے۔قرآن کہتا ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوآ إِذَا نُـودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الجمعة : ۹)

''اے ایمان والو! جب نمازِ جمعہ کے لیے تمہیں بلایا جائے تو جلدی کرو ذکر اللہ کی طرف ،اور خرید وفروخت چھوڑ دو! یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جان لیتے۔''

ربِ کریم ہمیں ان سب منکرات ومعاصی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے جن کے نتیجے میں بندہ ربِ کریم کی نظر کرم سے گر جاتا ہے اور اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ (اللّٰهم احفظنا) آمین.

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهُ.

(۳۷)

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ اور اس کی برکات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الۡيَمَنِ، فَقَالَ: "إِنَّكَ تَأۡتِيۡ قَوۡمًا أَهۡلَ كِتَابٍ، فَادۡعُهُمۡ إِلٰى شَهَادَةِ أَنۡ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوۡلُ اللّٰهِ، فَإِنۡ هُمۡ أَطَاعُوۡا لِذَالِكَ فَأَعۡلِمۡهُمۡ أَنَّ اللّٰهَ قَدۡ فَرَضَ عَلَيۡهِمۡ خَمۡسَ صَلَوَاتٍ فِيۡ الۡيَوۡمِ وَاللَّيۡلَةِ، فَإِنۡ هُمۡ أَطَاعُوۡا لِذَالِكَ فَأَعۡلِمۡهُمۡ أَنَّ اللّٰهَ قَدۡ فَرَضَ عَلَيۡهِمۡ صَدَقَةً تُؤۡخَذُ مِنۡ أَغۡنِيَائِهِمۡ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمۡ، فَإِنۡ هُمۡ أَطَاعُوۡ لِذَالِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمۡوَالِهِمۡ، وَاتَّقِ دَعۡوَةَ الۡمَظۡلُوۡمِ، فَإِنَّهٗ لَيۡسَ بَيۡنَهَا وَبَيۡنَ اللّٰهِ حِجَابٌ". (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ١٥٥/ كتاب الزكوٰة/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف (امیر یا قاضی بنا کر) بھیجا تو (رخصت کرتے ہوئے ان سے) فرمایا کہ "تم ایک اہل کتاب قوم (یعنی یہود ونصاریٰ) کے پاس پہنچو گے تو (سب سے پہلے) ان کو اس (حقیقت) کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

عبادت کے لائق نہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، پھر اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو تم ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، پھر اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور ان ہی کے فقراء کو دی جائے گی، پھر اگر وہ اس کو مان لیں تو زکوٰۃ کی وصول یابی کے سلسلہ میں چھانٹ چھانٹ کر ان کے نفیس اموال لینے سے پرہیز کرنا، (بلکہ ان سے اوسط درجہ کا مال وصول کرنا، اور اس بارے میں کوئی ظلم و زیادتی کسی پر نہ کرنا) اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیوں کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی روک نہیں ہے۔"

دو باتیں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ:

مجموعی طور پر دو باتیں اسلام کے پیغامات، اس کی تمام تعلیمات، احکامات اور ہدایات کا خلاصہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت۔ (۲) خلق خدا کی اعانت۔ سارے اسلامی اعمال اور افعال و احکام میں یہ دو باتیں قدرِ مشترک پائی جاتی ہیں، اور غور کیا جائے تو یہی دونوں باتیں انسان کے عمدہ ترین اور بہترین اوصاف میں سے ہیں۔

ان اوصاف سے محروم رہنے والا صحیح معنی میں انسان نہیں، بلکہ وہ حیوان سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ ایک انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی اپنے خالق اور حقیقی مالک کو نہ جانے اور نہ مانے، جس کا رزق کھائے اسی کا نہ گائے؟ اس کی اطاعت اور عبادت نہ کرے، اسی طرح ایک انسان جو انس سے ماخوذ ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر اپنی طرح کے انسانوں کے لیے انسیت و محبت نہ ہو، ان کی حاجت، ضرورت اور غربت میں بھی ان کی خدمت، اعانت اور نصرت (جو درحقیقت عبادت ہی ہے اس) کا اس میں جذبہ اور حوصلہ نہ ہو، وہ صورۃً انسان ہو تو ہو، حقیقۃً وہ انسان ہے ہی نہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ (الأعراف: ۱۷۹)

''وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

ربِ کریم نے انسان کو انسانیت کا جامہ پہنانے اور ایمانی وانسانی کردار ادا کرنے کے لیے بہت سے احکام وفرائض کا پابند بنایا، جن میں ایک حکم زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کی حقیقت یہ ہے کہ ہر سال اپنی جائز دولت اور کمائی میں سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ایک خاص (چالیسواں) حصہ اس کے ضرورت مند بندوں پر خرچ کیا جائے، قرآنِ کریم نے متقیوں اور سعادت مندوں کی یہی پہچان بیان فرمائی:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (البقرة : ۳)

''اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے (ہماری خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔''

مقاصدِ زکوٰۃ:

اس سے ایک طرف تو حکم الٰہی کی اطاعت ہوتی ہے تو دوسری طرف خلقِ خدا کی اعانت ونصرت ہوتی ہے، مقاصد زکوٰۃ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی دو ہیں: (۱) اسلام کی بلندی اور اس کی دعوت واشاعت کے نظام کو تقویت پہنچانا۔ (۲) ضرورت مندوں کی اعانت۔ قرآن نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف ذکر کیے ہیں: فقیر، مسکین، عاملین، مؤلفۃ القلوب، غلام، مقروض، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا اور مسافر۔ (سورۂ توبہ: ۱۰) ان میں سے پانچ تو وہ ہیں جن کی بنیاد محتاجی پر ہے، تو اس سے ثابت ہوا کہ اسلام فلاحِ انسانی کے لیے زکوٰۃ کا نظام پیش کرتا ہے، اسی لیے بعض وجوہ سے صدقات وزکوٰۃ جیسی مالی عبادات کو بدنی عبادات سے افضل قرار دیا گیا ہے، چناں چہ آپ دیکھئے کہ قرآن وحدیث میں ایک نیکی کا اجر دس گنا اور نماز باجماعت کا ۲۵ یا ۲۷ گنا اجر بتلایا گیا، لیکن انفاق یعنی راہِ خدا میں خلق خدا پر خرچ کرنے کا اجر وثواب قرآن میں سات سو گنا بیان ہوا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت مہربان ہو جائے تو اس سے بھی زیادہ اجر ہے۔

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِئَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (البقرة : ٢٦١)

’’جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیاں اگائے (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں (یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے سات سو گنا اجر ملتا ہے) اور اللہ جس کے لیے چاہتے ہیں ثواب میں کئی گنا اضافہ کردیتے ہیں۔‘‘

اسلام میں انفاق کی اہمیت وفضیلت:

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں انفاق کی بڑی اہمیت وفضیلت ہے، قرآنِ کریم میں بیاسی مقامات پر اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتاءِ زکوٰۃ کا اس طرح حکم آیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں کا مقام اور درجہ قریب قریب برابر ہے۔ (مظاہر حق جدید:۲/۱۹۱)

اور یہ دونوں عبادتیں ہمیشہ آسمانی شریعتوں کے خاص ارکان اور شعائر رہی ہیں، ہاں ان کے حدود وتفصیلی احکامات اور تعیینات میں فرق رہا ہے، ورنہ نماز اور زکوٰۃ ہر شریعت میں فرض تھی، ہماری شریعت میں بھی ایمان اور نماز کے بعد زکوٰۃ کو خاص اہمیت حاصل ہے، شاید اسی بنا پر حدیث مذکور میں ایمان ونماز کے بعد زکوٰۃ کا حکم فرمایا۔

سن ہجری ۹ یا ۱۰ میں نبی کریم ﷺ نے جب سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی اور قاضی بنا کر بھیجا تو آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کا ایک حکیمانہ اصول تعلیم فرماتے ہوئے کہا: ’’دیکھو! اسلام کے سارے احکامات ومطالبات ایک ساتھ مخاطبین کے سامنے نہ رکھے جائیں، اس صورت میں انہیں اسلام بہت کٹھن اور ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس ہوگا، اس لیے پہلے ان کے سامنے اسلام کی بنیاد یعنی توحید ورسالت کی شہادت رکھی جائے، جس کو ہر معقولیت پسند، سلیم الفطرت اور نیک طینت انسان آسانی سے ماننے پر آمادہ ہوسکتا ہے، پھر جب وہ اس بنیادی اور فطری بات کو مان لیں تو ان کے سامنے فریضۂ نماز رکھا

جائے، جوایک جانی، جسمانی اور زبانی عبادتِ الٰہی کا نہایت حسین اور بہترین گلدستہ ہے، اور جب وہ اس کو بھی قبول کرلیں تو اب ان کے سامنے فریضۂ زکوٰۃ رکھا جائے، جو ایک مالی عبادت ہے اور قوم کے مال داروں سے ایک مقرر حساب اور قاعدے سے انصاف کے ساتھ وصول کرکے ان ہی کے غریبوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کی جائے گی۔

اس موقع پر یاد رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد دراصل دعوتِ اسلام کے اصول اور حکیمانہ طریقہ کی تعلیم دینا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے صرف تین بنیادی ارکان کا ذکر فرمایا، سب کا نہیں۔ (معارف الحدیث: ۴/۲۷)

علاوہ ازیں اس میں بھی شک نہیں کہ اسلام کے ارکان وفرائض میں نماز وزکوٰۃ کو خاص اہمیت ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں بھی ان دونوں پر خاص زور دیا گیا ہے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو بندہ نماز وزکوٰۃ کا خاص اہتمام کرے گا اس کے لیے ان شاء اللہ ان کی برکت سے بقیہ دین پر عمل کرنا بھی آسان ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں گے۔ شاید اسی لیے فرمایا: ”إِنَّ تَمَامَ إِسْلَامِكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا زَكٰوةَ أَمْوَالِكُمْ“ ”تمہارے اسلام کی تکمیل یہ ہے کہ تم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو۔“ اور قرآن کہتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرة: ۲۷۷)

”جو لوگ ایمان لائیں اور عملِ صالح کریں (بالخصوص) نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ اپنے رب کے پاس اجر اور فضیلت کے مستحق ہوں گے، نہ ان کے لیے کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔“

ایک حدیث میں ہے، حضرت عمرو بن مرہ الجہنیؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رحمت عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا جو قبیلۂ قضاعہ سے تعلق رکھتا تھا، عرض کیا کہ ”حضور! میں اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں، نمازِ پنج گانہ ادا کرتا

ہوں، رمضان کے روزے رکھتا ہوں، تراویح پڑھتا ہوں اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں (میرے لیے کیا ارشاد ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"مَنْ مَاتَ عَلٰى هٰذَا كَانَ مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ" (بزار، ابن حزيمة، ابن حبان)

"جو اس حالت میں فوت ہوا وہ صدیقین وشہداء میں لکھا جائے گا۔"

اسلام میں زکوٰۃ کی افادیت کے تین پہلو:

بہر حال اسلام میں انفاق کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے اس کی افادیت ثابت ہے، چناں چہ محققین نے زکوٰۃ کی افادیت کے تین پہلو بیان کیے ہیں:

(۱) عبادت: زکوٰۃ مالی عبادت ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کے حکم اور ہدایت کے مطابق خرچ کرنا عبادت و بندگی ہے اور بندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی اور نیازمندی کا اظہار ہے، بندہ نماز میں جس طرح جسم و جان اور زبان کے ذریعہ اپنی بندگی، عاجزی اور نیازمندی کا اظہار و اعلان کرتا ہے، اسی طرح زکوٰۃ کے ذریعہ وہ مالی عبادت اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرکے اس بات کا عملی ثبوت دیتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، وہی اس کا مالک ہے اور وہ خود اپنے مال کا منیجر ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

ایں امانت چند روزہ نزدِ ما ست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست

ہر مسلمان کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے پاس جو کچھ دولت ونعمت ہے اس کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس نے محض اپنے کرم سے وہ دولت اور نعمت ہماری ملکیت میں دے کر بطورِ نیابت تصرف کا حق دے رکھا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی اس کا مالک ہے اور وہ ہم سے ہمارا نہیں بلکہ اپنا دیا ہوا مال ہم سے مانگ رہا ہے اور وہ بھی ہمارے ہی

ضرورت مند بھائیوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے، تو پھر ہمیں بھی دینے اور خرچ کرنے میں کوئی تنگی اور بوجھ محسوس نہ کرنا چاہیے۔

اسی لیے زکوٰۃ ادا کرنے والے کا یقین ہوتا ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال سے خدا کی راہ میں خرچ کرنا اس کی رضا کا سبب ہے، اور زکوٰۃ خدا کی رضا ہی کے خاطر دی جاتی ہے، لہٰذا اس کا شمار عبادات میں اسی پہلو سے ہوتا ہے۔

(۲) خدمت: زکوٰۃ انسانوں کی خدمت ہے؛ کیوں کہ اس سے نہ جانے کتنے ضرورت مندوں کی کتنی ہی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اسلام میں زکوٰۃ کی افادیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ خلقِ خدا اور ضرورت مندوں کی اعانت و خدمت ہوتی ہے، اس اعتبار سے زکوٰۃ میں خدمت اور اخلاق کا نہایت اہم پہلو ہے۔ حکم ہے کہ:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ (التوبة : ۱۰۳)

(محبوبم!) لوگوں کے اموال سے زکوٰۃ صدقہ وصول کیجیے!

اس کے بعد اس مال کا کیا کیا جائے؟ تو اسے حدیث میں فرمایا کہ "تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ" زکوٰۃ جو اسلامی اور فطری حکم ہے اس کا نظام یہ ہے کہ مسلمانوں کے مالداروں سے قانونِ اسلامی کے مطابق لی جائے اور مسلمانوں کے حقداروں غریبوں، محتاجوں اور ضروت مندوں میں تقسیم کی جائے اور الحمد للہ! یہی ہوتا ہے زکوٰۃ کے معاملہ میں، جب کہ سودی معاملہ میں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ اس میں غریبوں اور ضرورت مندوں سے لے کر مالداروں اور سرمایہ داروں کو دیا جاتا ہے۔ اس سے نظامِ زکوٰۃ کا فطری اور سودی نظام کا غیر فطری ہونا واضح ہوتا ہے۔

سرمایہ داری اور سودی نظام میں یہ ہوتا ہے کہ روپیہ جمع کیا جاتا ہے، پھر اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جاتا ہے، تاکہ سود اور حرام کی گندی نالیوں کے ذریعہ آس پاس کے مجبور لوگوں کا روپیہ سمیٹ کر اپنی جھیل میں جمع کر لیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ غیر فطری نظام ہے،

اس کے برخلاف اسلام کا فطری حکم یہ ہے کہ روپیہ اولاً تو بلا وجہ جمع ہی کیوں کیا جائے؟ اور اگر کسی جائز یا نیک مقصد کے لیے جمع کیا بھی گیا تو اپنے اس مال و دولت کے تالاب سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں، تاکہ آس پاس کے مجبور لوگوں کے سوکھے کھیت ہرے بھرے ہوں، اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے، زکوٰۃ کا شمار خلقِ خدا کی خدمت اور اعانت میں اسی پہلو سے ہوتا ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ اسلام کا پیش کردہ نظامِ زکوٰۃ اگر قائم ہو جائے اور ہر صاحب نصاب اپنے پورے مال کی زکوٰۃ امانتداری کے ساتھ ادا کرنے لگے تو اس کی برکت سے دنیا میں غربت کا خاتمہ ہو جائے۔

(۳) طہارت و برکت: زکوٰۃ دل اور دولت کی طہارت اور مال و دولت میں برکت کا سبب ہے۔ اس لیے کہ مال کی حرص و ہوس انسان کو متعدد اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، زکوٰۃ وصدقات اس کا مؤثر ترین علاج ہے، اس سے نفس کی تطہیر ہوگی، شاید زکوٰۃ کو اسی مناسبت سے زکوٰۃ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں بڑھنا اور پاک کرنا، اور زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ادا کرنے سے دل بخل و حرص جیسی بیماریوں سے اور جسم گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور مال میں برکت اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

زکوٰۃ سے دل و دولت کی طہارت:

ارشادِ ربانی ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِم صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (التوبة : ۱۰۳)

(محبوبم!) ان لوگوں کے اموال میں سے زکوٰۃ وصدقہ وصول کرلو جس کے ذریعہ تم انہیں پاک کرو گے اور ان کے لیے باعث برکت بنو گے۔ یہاں زکوٰۃ کی دو خاصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں: (۱) ''تطہیر''۔ اس سے مراد دل کے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ ہے۔ (۲) ''برکت''۔ مراد مال و اعمال اور اجر و ثواب میں برکت کا سبب ہے۔

لیکن اس جگہ یاد رکھئے کہ زکوٰۃ کا اصلی فائدہ تو دل کی طہارت ہے، دولت کی طہارت کا فائدہ تو ضمنی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر بالفرض کسی جگہ کوئی مصرفِ زکوٰۃ نہ بھی ہو تو اس سے فریضۂ زکوٰۃ ساقط نہ ہوگا، خوب اچھی طرح سمجھ لو! یہ تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ ایک ہی عمل سے دونوں فائدے حاصل کروا دیے، حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (التوبة: ۳۵-۳۷)

’’وہ لوگ جو سونا اور چاندی (مال و دولت وغیرہ) بطورِ ذخیرہ کے جمع کرتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے، تو اے پیغمبر! آپ ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے، (یہ عذاب ان کو اس دن ہوگا) جس دن ان کی جمع کردہ دولت کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ذریعہ ان کے ماتھے (پیشانیاں)، ان کے پہلو (کروٹیں) اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے (تمہاری وہ دولت اور خزانہ) جس کو تم جمع کرتے تھے، اب مزہ چکھو اپنی دولت اندوزی کا۔‘‘

اگرچہ یہ آیت کریمہ براہِ راست ان اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جو بخل کی وجہ سے مال جمع کرتے رہتے تھے اور اس کے شرعی حقوق ادا نہیں کرتے تھے، لیکن آیت کے الفاظ عام ہیں، لہٰذا ان کا اطلاق ان مسلمانوں پر بھی ہوسکتا ہے جو مال و دولت جمع تو کرتے ہیں لیکن مال کے جو حقوق زکوٰۃ وغیرہ کی شکل میں ان پر عائد ہیں وہ ادا نہیں کرتے۔

اس آیت مبارکہ کے نازل ہونے کے بعد حضرات صحابہؓ نے اس کے ظاہری الفاظ و انداز سے یہی سمجھا کہ اس کا مطلب اور مطالبہ یہ ہے کہ اپنی کمائی میں سے کچھ بھی جمع نہ کیا جائے، بلکہ جو کچھ بھی ہو سب کا سب راہِ خدا میں خلقِ خدا کے لیے خرچ کر دیا جائے، ظاہر

ہے کہ یہ بات صدیق اکبرؓ جیسے سچے اور سخی کے لیے تو آسان ہوسکتی ہے، لیکن مراوشما کے لیے تو دشوار ہوگی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ساری امت پر احسان فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اصل میں اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مال ودولت جمع کرنا جانتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرنا نہیں جانتے، یعنی جو صرف مالدار ہیں، دلدار نہیں، ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَفْرُضِ الزَّكوٰةَ إِلَّا لِيُطَيِّبَ مَا بَقِيَ مِنْ أَمْوَالِكُمْ". (أبو داود، مشكوٰة/ص:١٥٦/ كتاب الزكوٰة/ الفصل الثانی)

''اللہ رب العزت نے زکوٰۃ اس لیے ہی تو فرض فرمائی کہ اس کی ادائیگی سے تمہارا بقیہ مال پاک ہوجائے''۔ اور جب زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال پاک ہوجائے گا تو اس کے بعد بقیہ مال کے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

الغرض! زکوٰۃ عبادت ہے، زکوٰۃ خلق خدا کی خدمت ہے اور زکوٰۃ دل ودولت کی طہارت وبرکت کا ذریعہ ہے، جیسا کہ ارشادِ باری: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ سے طہارت اور ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ﴾ سے برکت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے فوائد وفضائل ہیں۔

آدابِ زکوٰۃ:

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب اس مبارک عبادت وعمل کو اس کے اصول و آداب کے ساتھ انجام دیا جائے۔ فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ نے اس سلسلہ میں (قاموس الفقہ ج:۴، ص:۹۶ تا ۹۹ میں) جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) زکوٰۃ کی ادائیگی کا پہلا ادب یہ ہے کہ اپنے حلال مال میں سے بہترین مال کا انتخاب کرے، یہی جذبہ اللہ تعالیٰ کو محبوب اور اس کے دربار میں مقبول ہے، فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آل عمران:۹۲) ورنہ کم از کم درمیانی درجہ کا مال

دے، جس کا حدیث مذکور میں ذکر ہے۔ افسوس! آج بہت سی جگہوں پر پرانے، استعمال شدہ کپڑے، بچے ہوئے کھانے، پڑے ہوئے پھل پھول، گھن لگے اناج اور بے کار و ناقابل استعمال اشیاء ہی فقیروں، محتاجوں، مستحقوں، بیواؤں اور یتیموں کے حصہ میں آتی ہیں، یہ اخلاقی گراوٹ دراصل یہود جیسی خساست کا مظہر ہے، اس سے احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۲) زکوٰۃ کی ادائیگی کا دوسرا ادب یہ ہے کہ اس سے ریا اور نمائش مقصود نہ ہو ﴿كَالَّذِىْ يُنفِقُ مَالَهٗ رِئَاءَ النَّاسِ﴾ (البقرة : ٢٦٤) کا مصداق نہ بنے۔

مطلب یہ ہے کہ ممکن حد تک زکوٰۃ و صدقات پوشیدہ طریقہ پر مستحق کی نہیں بلکہ اپنی ضرورت سمجھ کر بخوشی اس طرح چھپا کر دے کہ کانوں کان خبر نہ ہو؛ تاکہ ریا اور نمائش کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے، اس سے جن لوگوں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے ان کی آبروریزی نہیں ہوتی اور غیرت مند مستحقوں کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی، ہاں اگر کہیں علانیہ زکوٰۃ دینا مصلحت ہو اور اس میں کسی طرح کا نقصان نہ ہو، تو ایسے وقت اظہار و اعلان کے ساتھ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۳) زکوٰۃ کی ادائیگی کا تیسرا ادب یہ ہے کہ بہترین مصرف کا انتخاب کرے۔ یوں تو قرآنِ کریم میں جن آٹھ مصارف (فقراء، مساکین عاملین وغیرہ) کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی بھی مستحق کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ ان میں اکثر مصارف کی بنیاد محتاجی پر ہے، لیکن اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ لینے والا جتنا زیادہ مستحق ہوگا زکوٰۃ دینے والا اُتنا ہی زیادہ اجر کا حقدار ہوگا۔

حضرت امام غزالیؒ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو مستحق ہونے پر زکوٰۃ و صدقات میں اولیت دینی چاہیے:

الاتقیاء: حدیث میں ہے کہ ''متقی کا کھاؤ اور اسی کو کھلاؤ''۔

علماء: جو دینی علوم و مشاغل کی وجہ سے کسب معاش نہ کر پاتے ہوں، ظاہر ہے

کہ دینی علوم کی مشغولیت افضل ترین واعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، تو ان کی نصرت اس عبادت میں بہترین اوراعلیٰ درجہ کی نصرت ہے۔

اقرباء: حدیث کے مطابق ان پر خرچ کرنے کا اجر وثواب دوگنا ہے۔ بالخصوص جو رشتہ دار غیور اور خود دار ہوں، کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے ہوں، ان کی حاجت مندی ان کی زبان سے ظاہر نہ ہوتی ہو، بلکہ ان کے چہرے فقر وکسمپرسی کے گواہ ہوں، یہی ہیں وہ مستحق جن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دینے کا حکم ہے: ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (البقرة :۲۷۳)

(۴) زکوٰۃ کی ادائیگی کا چوتھا ادب یہ ہے کہ زکوٰۃ دے کر نہ احسان جتائیں اور نہ دینے والوں کے ساتھ اذیت وتوہین آمیز سلوک کریں۔ قرآن کہتا ہے: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْأَذٰى﴾ (البقرة : ٢٦٤) ''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔'' بسا اوقات اس سے زکوٰۃ کا اجر وثواب باطل اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ہمارے اکابر کا حال یہ تھا کہ زکوٰۃ ادا کر کے احسان جتلانا تو کجا، بلکہ زکوٰۃ لینے والوں کو وہ اپنا محسن سمجھتے تھے۔

زکوٰۃ سے مال ودولت کی حفاظت:

الغرض! قرآن اور حدیث سے ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ اس کے آداب کی رعایت کے ساتھ ادا کی جائے تو دل اور دولت کی طہارت و پاکی کا ذریعہ ہے، ایک اور (مرسل) روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ مال ودولت کی حفاظت کا ذریعہ ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" حَصِّنُوْا أَمْوَالَكُمْ بِالزَّكوٰةِ وَدَاوُوْا (مَرْضَاكُمْ) بَالصَّدَقَةِ، وَاسْتَقْبِلُوْا أَمْوَاجَ الْبَلَاءِ بَالدُّعَاءِ وَالتَّضَرُّعِ". (رواه أبو داود فی مراسيله، المتجر الرابح /ص:۱۳۷، از ندائے شاہی/ص:۵۹، جولائی ۲۰۰۸ء)

''اپنے مال کی حفاظت کر و زکوٰۃ ادا کر کے، اپنے مریضوں کا علاج کر و صدقہ کے

ذریعہ اور بلاؤں کا مقابلہ کرو دعا اور گریہ وزاری کے ذریعہ۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ گویا زکوٰۃ مسلمانوں کے لیے انشورنس کے مانند ہے، ایک مسلمان اپنی زکوٰۃ دے کر گویا اللہ تعالیٰ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ جاری کرا لیتا ہے، اب اس کے مال کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے حفاظت ہوگی۔

ہے طہارت وحفاظت کی بشارت ایسی دولت کے لیے
خرچ ہوتی ہے جو عبادت اور خدمت کے لیے

ہمارے دادا جان حضرت الحاج حافظ نور محمد شاہ بھائی صاحبؒ کے متعلق والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد صدیق شاہ بھائی صاحب بڑودوی جامعی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ’’آپؒ نے پوری زندگی کبھی بینک میں کھاتہ نہیں کھلوایا، اول تو اس کی نوبت نہ آتی کہ سب کچھ خرچ ہو جاتا اور جو بچ جاتا وہ اپنی پرانی صندوق میں رکھ دیتے، اور فرماتے تھے: ’’میں چوں کہ الحمد للہ! زکوٰۃ پوری پوری ادا کرتا ہوں اس لیے اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ نکال دی جائے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے۔‘‘

ایک حیرت انگیز واقعہ:

افسوس کہ آج اس سلسلہ میں ہمارا یقین کمزور ہو گیا، ورنہ ایک زمانے میں تو غیر بھی اس پر یقین رکھتے تھے، چناں چہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ حضرت شیخؒ نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ’’ضلع سہارنپور میں ’’بھٹ‘‘ سے آگے انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں، جن میں مسلمان ملازموں کے ذریعہ ان کے کاروبار ہوا کرتے تھے، خود وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے، اور کبھی کبھی معاینہ کرنے آجاتے، ایک دفعہ جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں، (کہتے ہیں کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا قلیل بھی کثیر ہے، مرض، فقر، عداوت اور آگ) تو آگ بھڑک کر عظیم نقصان کا باعث ہوگئی، ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز مالک کے پاس دہلی آیا اور پورا واقعہ سنایا کہ ’’جناب! سب کی

کوٹھیاں جل گئیں۔'' وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، التفات بھی نہیں کیا، ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ ''حضور! سب جل گیا۔'' اس بار بھی اس نے بڑی لاپرواہی سے کہہ دیا کہ ''میری کوٹھی نہیں جلی۔'' اور کہہ کر پھر لکھنے میں مشغول ہوگیا، ملازم نے جب تیسری بار توجہ دلائی تب اس نے حقیقت بتلائی کہ ''میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' اور واقعی تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ سب کوٹھیاں جل گئیں، مگر اس انگریز کی کوٹھی محفوظ رہی تھی۔ (آپ بیتی: ۱/ ۸۸، از کتابوں کی درس گاہ میں/ص: ۹۹)

صاحبو! اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اتنا مقدس ہے کہ اس سے صرف زکوٰۃ لینے والوں کا ہی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ اولاً تو زکوٰۃ نکالنے والوں کا فائدہ ہوتا ہے کہ اس سے ان کے دل اور دولت کی طہارت اور حفاظت ہوتی ہے، اس لیے بہترین ہے وہ مال جس کی زکوٰۃ نکالی گئی ہو، اور بدترین ہے وہ مال جس کی زکوٰۃ نہ نکالی گئی ہو۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا دنیوی اور اُخروی عذاب:

حدیث پاک میں مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر بڑی سخت وعید بیان کی گئی ہے، چنانچہ حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو قوم زکوٰۃ دینا چھوڑ دیتی ہے، حق تعالیٰ اس کو قحط سالی میں مبتلا کر دیتا ہے، تم زکوٰۃ روک لوگے تو خداوند قدوس آسمان سے بارش روک لے گا، حتیٰ کہ اگر چوپائے نہ ہوں تو ایک قطرہ بھی نہ برسے''۔ (ترغیب ص: ۲/۱۹۰)

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: '' مَا خَالَطَتِ الزَّكٰوةُ مَالاً قَطُّ إِلَّا أَهْلَكَتْهُ''.
(رواه الشافعي، مشكوٰة/ص: ۱۵۷/الفصل الثالث)

''مالِ زکوٰۃ جب دوسرے مال کے ساتھ مخلوط ہوگا تو ضرور اس کو تباہ کر دے گا۔''

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ اس مال میں باقی رہ گئی ہو اور ادا نہ ہوئی ہو تو وہ زکوٰۃ نہ نکالنا اس مال کی ہلاکت کا ذریعہ ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص مستحق نہ ہونے کے باوجود زکوٰۃ وصول کر کے اپنے مال میں شامل کر لے، تو یہ زکوٰۃ کا مال اس کے سارے مال کو تباہ کر دے گا۔ واللہ اعلم۔ یہ تو زکوٰۃ نہ نکالنے کا دنیوی وبال تھا، اخروی عذاب تو بہت ہی خطرناک ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس آدمی کو اللہ نے مال دیا، پھر اس نے اس کی زکوٰۃ نہ دی، تو وہ مال کل قیامت کے دن اس آدمی کے سامنے ایسے زہریلے سانپ کی شکل میں آئے گا کہ (اس کے انتہائی زہریلے پن کی وجہ سے) سر کے بال جھڑ گئے ہوں گے، اور آنکھوں کے اوپر دو سفید نقطے ہوں گے، پھر وہ سانپ اس (زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے بخیل) کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا، پھر یہ سانپ اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا (پھر کاٹے گا) اور کہے گا: ''أَنَا مَالُكَ، أَنَا كَنْزُكَ''. (مشکوٰۃ/ص:۱۵۵، بخاری) ''میں تیری دولت ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔'' یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (اٰلِ عمران: ۱۸۰)

''اور نہ گمان کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس مال میں جو اللہ ہی نے اپنے فضل سے ان کو دیا کہ اس مال و دولت میں بخل ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ انجام کے لحاظ سے وہ بدتر ہے (اس مال کا مآل (انجام) بہت برا ہے جس کی زکوٰۃ نہ نکالی جائے) قیامت کے دن ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈالا جائے گا وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا۔''

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کا عبرت ناک انجام:

علامہ عبدالرحمٰن صفوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

کے زمانے میں ایک شخص بہت ہی مالدار تھا، اس کا انتقال ہوگیا تو لوگوں نے اس کی تدفین کے لیے ایک قبر کھودی، جب قبر تیار ہوگئی تو اس میں ایک بہت بڑا اژدہا آگیا، لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ کو خبر دی تو آپؓ نے دوسری قبر کھودنے کا حکم فرمایا، انہوں نے دوسری قبر کھودی تو وہاں بھی وہی اژدھا موجود! حتیٰ کہ یکے بعد دیگرے سات قبریں کھودیں، بالآخر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کے گھر والوں سے اس کا حال دریافت کیا، تو انہوں نے کہا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتا تھا، آپؓ نے فرمایا: ''یہ اسی کا انجام ہے، لہٰذا اب اس کو اسی اژدہے کے ساتھ قبر میں دفن کردو۔'' (نزہۃ المجالس مترجم/ص: ۲۷۷)

بہرکیف! کتاب وسنت سے الحمدللہ! مال کے متعلق جو کچھ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مال فی نفسہٖ نہ اچھا ہے نہ برا، یہ بہترین خادم بھی ہے اور بدترین مخدوم بھی، اگر اس کے حقوق ادا کیے جائیں، یعنی اس کو خدا کی اطاعت اور خلقِ خدا کی اعانت میں لگایا جائے تو یہ مال بہترین نعمت اور سرمایۂ زندگی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ (النساء: ۵)

''وہ اموال جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سرمایۂ زندگی بنایا ہے۔'' یعنی زندگی مال کے سہارے قائم ہے، اس صورت میں یہ مال بہترین خادم ہے۔ اور اگر یہ مال ناجائز طریقہ سے کمایا جائے، اس کے حقوق ادا نہ کیے جائیں تو اس صورت میں یہ بدترین مخدوم ہے۔ پس ہلاکت ونحوست ہے اس مال ودولت کے لیے جس سے نہ حکم خدا پورا ہو نہ خلقِ اللہ کو نفع ہو، اور خیر وبرکت ہے اس مال کے لیے جس سے خدا کی اطاعت اور خلق خدا کی اعانت ہو، حق تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے نیک توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

☆......☆......☆

(۳۸)

خودکشی اسلامی نقطۂ نظر سے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُـرَیۡرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلَّذِیۡ یَخۡنُقُ نَفۡسَهٗ یَخۡنُقُهَا فِیۡ النَارِ، وَالَّذِیۡ یَطۡعَنُهَا یَطۡعَنُهَا فِیۡ النَّارِ". (بخاری، مشکوٰۃ/ص: ۳۰۰/کتاب القصاص/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو مار ڈالا وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا، اور جس نے اپنے آپ کو نیزہ مار کر خودکشی کر لی، وہ دوزخ میں بھی اپنے آپ کو نیزہ مارے گا''۔

یہ دنیا تغیرات کی آماجگاہ ہے:

یہ فانی اور بے ثبات دنیا درحقیقت تغیرات اور تبدیلیوں کی آماجگاہ ہے، اس کے کسی حال کو قرار نہیں، یہاں کبھی صبح ہے تو کبھی شام، کبھی خشکی تو کبھی برسات، کبھی دن تو کبھی رات۔ یہی حال اس دنیا میں آباد حضرت انسان کا بھی ہے، من جانب اللہ یہ بھی کسی ایک حالت پر برقرار نہیں رہتا، بلکہ انسانی زندگی میں جس قدر انقلابات وتغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ بے حد وحساب ہیں، پھر یہ انسانی سماج کے کسی ایک طبقہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام افراد واقوام کو شامل ہے، کیا امیر کیا فقیر، کیا عامی کیا نامی، کیا خادم کیا مخدوم، کیا حاکم کیا محکوم، کیا

صالح کیا طالح، کیا سعید کیا شقی، کیا جوان کیا بوڑھا، کیا مرد کیا عورت، غرض کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، ہر ایک کی زندگی میں کوئی نہ کوئی وقت ایسا ہوتا ہے جس میں اسے فرحت وشادمانی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جس میں اس کی مسرت حسرت میں، خوشی غمی میں، کامیابی ناکامی میں، شادمانی پریشانی میں اور عزت ذلت میں بدل جاتی ہے، گویا اس دنیا میں خوشی وغم اور مسرت والم میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جیسے پھول اور کانٹوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا میں بسنے والے انسانوں کی مثال ایک چکڈول پر سوار لوگوں کی سی ہے جو پہیئے کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں، کبھی نیچے جارہے ہیں تو کبھی اوپر آرہے ہیں، اب جب اوپر والے افراد پہیئے کی گردش کی وجہ سے نیچے آجائیں تو گویا یسر کی جگہ عسر اور راحت کی جگہ کلفت کا شکار ہوگئے، پھر جب یہی نیچے والے اشخاص مبتلائے مصائب و مشکلات اوپر چلے جائیں تو گویا ان کی پریشانی ختم ہوگئی، انہیں یسر اور آسانی مل گئی، غرض دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کے احوال ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور منزلِ مقصود کی راہ میں نئے نئے حالات آتے رہتے ہیں، لیکن کوئی حالت بھی برقرار نہیں رہتی۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ محمود نے ایاز کو ایک انگوٹھی دے کر کہا کہ ''اس پر ایسا جملہ لکھو کہ اگر میں اس کو خوشی کی حالت میں دیکھوں تو غم زدہ ہوجاؤں، اور غم کی حالت میں دیکھوں تو خوش ہوجاؤں، تو ایاز نے لکھ دیا کہ ''یہ وقت بھی گذر جائے گا۔'' اس لیے ان حقائق کو سمجھنے والا حقیقی مومن حالات وحوادث سے زیادہ متاثر ہوکر کوئی غلط فیصلہ نہیں کرسکتا۔

جو یقین کی چھاؤں میں نکل پڑا اسے منزلوں نے پناہ دی
جنہیں وسوسوں نے ڈرا دیا وہ قدم قدم پہ ٹھہر گئے

عبدیت کی حقیقت:

دنیا کی ہر حالت عارضی اور وقتی ہوتی ہے، ایسی صورتِ حال میں ایک مومن اور عبدِ کامل کا کام اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر تقدیر اور فیصلہ پر راضی رہے، بلاؤں میں صبر کے ذریعہ تو

نعمتوں میں شکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ورضا بنا رہے، یہ درسِ ہدایت کانٹوں میں موجود ایک پھول سے بھی ہم حاصل کر سکتے ہیں۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہوا ہے، عجب خوش مزاج ہے

صاحبو! عبدیت کی حقیقت یہ ہے کہ رب جس حال میں رکھے عبد اس حال میں راضی رہے، اس طرح ہر حال اس کے لیے حصولِ قربِ الٰہی کا سبب بن جاتا ہے، اس کے بر خلاف جو لوگ حالات وحوادث اور تغیرات سے مایوس اور متاثر ہو کر کوئی ناجائز قدم اٹھاتے ہیں، درحقیقت وہ عباد الرحمٰن نہیں، عباد الشیطان ہیں، حدیث قدسی ہے:

"مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَائِيْ، وَلَمْ يَصْبِرْ عَلٰى بَلَائِيْ، وَلَمْ يَشْكُرْ عَلٰى نَعْمَائِيْ، وَلَمْ يَقْنَعْ بِعَطَائِيْ، فَلْيَطْلُبْ رَبًّا سِوَائِيْ". (حديث قدسی نمبر: ۸)

"جو میرے فیصلے پر راضی نہ ہو، میری آزمائش پر صبر نہ کرے، میری نعمتوں پر شکر نہ کرے اور میرے دیے ہوئے (رزق وغیرہ) پر قناعت نہ کرے، اس کو چاہیے کہ وہ میرے علاوہ کوئی اور رب تلاش کر لے۔" (کہ یہ میرے بندے کا فعل نہیں ہوسکتا، جو میرا ہے وہ میرے فیصلے پر ہر حال میں راضی رہتا ہے۔)

پھر دنیوی اور انسانی زندگی اگرچہ راحت وکلفت کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے، لیکن درحقیقت وجودِ غم بھی احساسِ مسرت کے لیے ہے، الم کی چاشنی سے زندگی میں حسن ومٹھاس آتی ہے، اس لیے اہل اللہ اور اہل وفا کامل اور حقیقی مومن بندوں کو پریشانی میں بھی دلی شادمانی حاصل ہوتی ہے، جب کہ اہل ہوا وہوس کی ساری زندگی حصولِ راحت کے غم میں ختم ہو جاتی ہے، ان کی نظر ہمیشہ زندگی کی تلخیوں اور منفی سوچ پر رہتی ہے، جس کی وجہ سے زندگی کی ہزاروں نعمتوں اور خوشیوں کی چھاؤں میں بھی انہیں تلخیوں کی تپش محسوس ہوتی ہے اور ایسے لوگ راحتوں میں بھی زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں، اور بعض اوقات

ایسی ذہنیت کے لوگ تکلیفوں سے گھبرا کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

زندگی خوبصورت ہے، تمہیں جینا نہیں آتا
خودکشی بدصورت ہے، تمہیں مرنا نہیں آتا

خودکشی کیا ہے؟:

خودکشی دلیلِ بزدلی ہے، یہ کم ہمت لوگوں کے لیے زندگی کے مسائل ومشکلات اور آزمائشوں اور ذمہ داریوں سے بھاگ نکلنے اور راہِ فرار اختیار کرنے کی ایک غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی تدبیر ہے، بدقسمتی سے اس وقت پوری دنیا کے محروم القسمت لوگوں میں اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی اور ایمان سے محرومی یا کمزوری کے باعث خودکشی کا رجحان آئے دن بڑھتا جارہا ہے، مغربی ممالک میں تو اخلاقی اور سماجی نظام کے انتشار کے سبب خودکشی کے واقعات کا تناسب اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب یہ آواز اٹھائی جارہی ہے کہ خودکشی انسان کا نجی حق تسلیم کیا جائے۔

خودکشی کی اجازت نہیں:

جب کہ حقیقت اور حق یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود اپنے وجود، اپنی جان اور زندگی کا مالک نہیں بلکہ امین ہے، اس کا اپنا وجود اور زندگی اس کی اپنی محنت کا ثمرہ نہیں، یہ زندگی کسی جد وجہد اور کدوکاوش سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ خداوند قدوس کی چاہت اور مشیت سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس انسانی وجود اور زندگی کا مالکِ حقیقی خداوند قدوس ہے، اسی نے اسے تخلیق سے نوازا اور دنیا میں پیدا کیا، یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حتیٰ کہ ہمارا پورا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک قیمتی نعمت وامانت ہے، اور ممکن حد تک اس کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری اور اسلامی، فطری، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، فقہی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ انسانی جان ربِ کریم کی عطا کی ہوئی ایک ایسی امانت ہے جس کا تحفظ بہر صورت لازم اور

ضروری ہے، مصائب ومشکلات کی اندھیریاں ہوں یا مجبوریوں اورنا امیدوں کی تاریکیاں، اس عظیم امانت الٰہی کوخودکشی کے ذریعہ لمحوں میں ضائع کردینا نہ تو اسلام میں جائز ہے، نہ انسانیت کی نظر میں مستحسن ہے، اسی لیے ایسے کسی بھی عمل کی اسلام میں اجازت نہیں جو بے مقصد ہو، صحت یا زندگی کے لیے مضرت رساں ہو اور انسانی وجود اور زندگی کو خطرہ میں ڈال سکتا ہو، بلکہ جان بچانے کے لیے بوقت ضرورت اور بقدرِ ضرورت ایسی چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے جو اصلاً ناجائز اور حرام ہیں۔

پھر انسان کے لیے من جانب اللہ اس کے جسم و جان کی حفاظت کے لیے جو اسباب مہیا ہیں ان کی مثال کسی مخلوق میں نہیں ملتی، اس کے باوجود اگر کوئی اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے تو یہ ایسا جرم ہے جو دنیا اور عقبیٰ دونوں میں مجرم کو محروم کردیتا ہے، کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔

خودکشی کی حرمت و مذمت:

شریعت اسلامی میں خودکشی اسی طرح حرام ہے جس طرح کسی محفوظ الدم جان کا مار ڈالنا، قرآن وحدیث دونوں میں اس کی ممانعت وارد ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَنْفُسَكُمْ ﴾ (النساء: ۲۹)

اس آیت کا عام طور پر ایک معنیٰ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو، ظاہری الفاظ بھی اسی معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (البقرة: ۱۹۵)

’’اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔‘‘ (اپنے آپ کو ہلاک کرنا ترکِ جہاد سے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ میں یہی معنیٰ مراد ہیں۔)

اسی طرح خودکشی کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو ہلاک کیا جاتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے،

کیوں کہ خودکشی کرنے والا واقعی دونوں جہاں میں ہلاک ہوجاتا ہے۔

حدیث بالا میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کرنے والے کی وعید کے بیان میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ یقیناً بہت ہی سخت وعید اور تہدید پر مشتمل ہے، فرمایا:

"اَلَّذِیُ یَخُنُقُ نَفُسَهٗ یَخُنُقُها فِی النَّارِ".

"جس نے گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو مار ڈالا، وہ دوزخ میں بھی گلا گھونٹے گا، اور جس نے نیزہ مار کر اپنے آپ کو ہلاک کیا اسے دوزخ میں بھی اسی طرح اپنے آپ کو نیزہ مارنے کا عذاب دیا جائے گا۔" یعنی خودکشی سے مصائب ومشکلات سے چھٹکارا نہیں ملے گا، بلکہ دنیا میں جس چیز سے اور جس انداز سے خودکشی کرے گا آخرت میں اسی انداز کا عذاب دیا جائے گا۔

یوں تو گھبرا کے کہتے ہیں: مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

کیا خودکشی کرنے والا بخشا جائے گا؟

بعض روایات میں خودکشی کرنے والے کے لیے جہنم کی جو سزا بیان کی گئی ہے، وہ اس طرح ہے:

"فِیُ نَارِ جَهَنَّمَ خالِدًا مُخَلَّدًا فِیُهَا أَبَدًا". (مشکوٰۃ/ص:۲۹۹/ بخاری ومسلم)

مطلب یہ ہے کہ خودکشی کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں اسی قسم کے عذاب میں مبتلا رہے گا، کبھی نجات نہیں پائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

سوال یہ ہے کہ کیا خودکشی کرنے والا دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے؟ جس کی وجہ سے ہمیشہ دوزخ میں عذاب دیا جائے گا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں، آپؒ فرماتے ہیں:

" تَاكِيدًا بَعْدَ تَاكِيدٍ، أَوْ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْمُسْتَحِلِّ، أَوْ عَلَى بَيَانِ أَنَّ فَاعِلَهٗ مُسْتَحِقٌّ لِهٰذَا الْعَذَابِ، أَوِ الْمُرَادُ بِالْخُلُوْدِ طُوْلُ الْمُدَّةِ". (مرقاة: ٤/١١)

(۱) یہ تاکید در تاکید شدتِ مذمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

(۲) یا یہ مقصود ہے کہ جو شخص قانونِ اسلام کے خلاف عقیدہ رکھتے ہوئے خود کشی کرے، یعنی حلال اور جائز سمجھ کر، تو ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ ایک حرام چیز کو حلال سمجھنا کفر ہے، لیکن ایک شخص خود کشی حلال سمجھ کر نہیں کرتا وہ مسلمان تو ہے، لہٰذا اس کو سزا کے بعد بخشا جائے گا، اس کے حق میں پھر حدیث کا مطلب یہ ہوگا۔

(۳) وہ خود کشی کے ارتکاب کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کی سزا کا مستحق تھا، لیکن ایمان کی بدولت ضرور بخشا جائے گا۔

(۴) یا پھر یہ مطلب ہے کہ اس فعل بد کی پاداش میں مدتِ دراز تک جہنم کے عذاب میں مبتلا رہے گا۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ دخولِ جہنم سے قبل جنت حرام کر دی جائے گی، بعد میں نہیں۔ (واللہ اعلم)

بہر کیف خود کشی کی اسلام میں ممانعت کے ساتھ سخت مذمت بھی آئی ہے، لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہو، گو اس شخص نے خود کشی کا جرم کیا ہو، مگر وہ خلود فی النار کا مستحق نہیں ہوگا، بلکہ سزا پا کر ایمان اور اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کی بدولت بخشا جائے گا۔

ایک واقعہ:

چناں چہ حدیث میں ایک واقعہ آیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت طفیل بن عمرو دوسی ؓ کے ساتھ ان کی قوم کے ایک اور شخص

نے بھی مدینہ طیبہ ہجرت کی، یہاں یہ دوسرے شخص بیمار پڑ گئے، تکلیف کی شدت کے باعث ان سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے ایک ہتھیار سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ لیے، رگیں کٹ گئیں اور خون اتنا بہہ گیا کہ انتقال ہو گیا، حضرت طفیلؓ نے بعد میں ان کو خواب میں دیکھا کہ ایمان پر خاتمہ اور ہجرت کی وجہ سے بہتر حالت میں ہیں، مگر ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، حضرت طفیل رضی اللہ عنہ نے ان کو خواب میں پوچھا کہ ''آپ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟'' ان صاحب نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے ایمان اور ہجرت کی برکت سے مجھے معاف کر دیا، مغفرت تو ہو گئی، لیکن میرے ہاتھوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''جس چیز کو تم نے خود بگاڑ لیا ہے میں اسے درست نہیں کرتا'' حضرت طفیلؓ نے یہ خواب حضور ﷺ سے بیان کیا، تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اَللّٰھُمَّ وَ لِیَدَیْہِ فَاغْفِرْ'' ''یا الٰہی! ان کے ہاتھوں کو بھی معاف فرما۔'' (مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۳۰۰)

اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنا اگرچہ سنگین جرم اور بہت ہی سخت گناہ و عذاب کا باعث ہے، لیکن خودکشی کرنے والے کا خاتمہ ایمان پر ہو تو اس کی معافی اور بخشش ہو جائے گی اور خودکشی کرنے والے کے لیے دعاءِ مغفرت و ایصال ثواب بھی کرنا چاہیے، بلکہ وہ اس کا بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کا خودکشی کرنا قابل افسوس ہے:

لیکن اسی کے ساتھ ایک مسلمان کا خودکشی کرنا مقام افسوس اور لائق حیرت بھی ہے، اس لیے کہ خودکشی جیسا کہ کہا گیا ایمان کی کمزوری یا محرومی کی وجہ سے کی جاتی ہے، اب جس کا اس بات پر ایمان اور یقین ہے کہ مصائب و مشکلات کی سیاہ اور تاریک رات کے بعد مسرت و راحت کی صبح نو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جس کا تقدیر الٰہی اور آیت قرآنی پر ایمان ہے کہ:

﴿لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا﴾ (التوبۃ: ۵۱)

’’ہمیں وہی چیز پہنچے گی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔‘‘ اور یہ حقیقت ہے کہ اچھا یا برا، خوش حالی یا بدحالی، آرام وآلام سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، اور جس کا آخرت پر بھی ایمان ہے کہ دنیوی زندگی کے تھکے ہوئے مسافر کے لیے وہاں آرام و راحت ہے، اور زندگی کی آزمائشوں سے خودکشی کے ذریعہ راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی سخت پکڑ ہے، وہ مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی پیشانی رکھنے اور دست سوال پھیلانے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اچھی امید رکھنے کے بجائے مایوس ہوکر اپنے آپ کو ہلاک کیسے کرے گا؟ بقولِ حضرت کلیمؒ:

سلگنا اور شے ہے، جل کر مر جانے سے کیا ہوگا؟
ہوا ہے کام جو ہم سے، وہ پروانوں سے کیا ہوگا؟

مجبوری و مایوسی، دکھ درد، بے جا غصہ اور لا علاج بیماریوں کا علاج اگر خودکشی ہوتا تو پھر دنیا میں ان چیزوں کا وجود ہی باقی نہ رہتا، پوری دنیا اور دنیا کا ہر سماج سکون واطمینان کی زندگی بسر کرتا، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اس لیے حالات سے گھبرانے کے بجائے ان میں جینے کا حوصلہ پیدا کریں کہ ستارے ہمیشہ اندھیرے میں چمکتے ہیں، اور من جانب اللہ ہر غروب کے لیے نیا طلوع مقرر ہے، ہر راحت کے لیے تکلیف اور نفع کے لیے نقصان اٹھانا ہی پڑتا ہے:

’’کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے‘‘

نیز:

نہ کر تقدیر کا شکوہ، مقدر آزماتا جا
ملے گی خود بخود منزل، قدم اپنا بڑھاتا جا

اللہ رب العزت ہمیں حقائق سمجھنے کا صحیح جذبہ اور حوصلہ عطا فرمائے، (آمین)۔

جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا هُوَ أَهْلُهٗ.

(۳۹)

احکامِ وراثت کی اہمیت وعظمت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ”تَعَلَّمُوۡا الۡفَرَائِضَ وَالۡقُرۡآنَ، وَ عَلِّمُوۡا النَّاسَ، فَإِنِّی مَقۡبُوۡضٌ“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۳۵/کتاب العلم/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم رؤوف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”علم الفرائض (مراد اسلام یا وراثت کے احکام یا ربِ کریم کے عائد کردہ فرائض) اور قرآن خود بھی سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھاؤ، اس لیے کہ میں قبض کیا جاؤں گا، یعنی اس جہاں سے اٹھایا جاؤں گا۔

مرنے والے کے ساتھ عمل جاتا ہے، مال یہیں رہ جاتا ہے:

ہر انسان اپنے وجود سے پہلے بالکل معدوم تھا:

﴿هَلۡ أَتٰی عَلَی الۡإِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡئًا مَّذۡكُوۡرًا﴾ (الدھر:۱)

”انسان پر کبھی ایسا وقت آیا ہے کہ جب وہ قابل ذکر چیز نہیں تھا۔“

یہ حق تعالیٰ کی شانِ رحمت ہے کہ اس نے محض اپنی عنایت وقدرت سے انسان کو وجود عطا فرمایا:

﴿إِنَّا خَلَقۡنَا الۡإِنۡسَانَ مِنۡ نُطۡفَةٍ أَمۡشَاجٍ﴾ (الدھر: ۲)

’’ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا کیا۔‘‘

اب جس وقت انسان پیدا ہوا، عدم سے وجود میں آیا، یا عالم ارواح سے عالم دنیا میں آیا، تو صورتِ حال یہ تھی کہ خالی ہاتھ، بالکل اکیلا اور تنِ تنہا تھا، کیا فقیر کیا امیر، کیا گدا کیا شاہ، کیا عامی کیا نامی، کیا شہری کیا دیہاتی، غرض ہر ایک کی یہی پوزیشن تھی۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس پوزیشن میں انسان دنیا میں آیا، اسی پوزیشن میں دنیا سے گیا، یعنی جیسے دنیا میں ہر آنے والا خالی ہاتھ آیا، ایسے ہی دنیا سے ہر جانے والا خالی ہاتھ گیا۔ کہتے ہیں کہ سکندرِ اعظم ذوالقرنین جنھوں نے ساری دنیا پر حکومت کی تھی، ان کا جب انتقال ہونے لگا تو یہ وصیت کی کہ ’’مرنے کے بعد جنازہ سے باہر میرے دونوں ہاتھ نکال دیے جائیں، تا کہ دنیا جان لے کہ دنیا پر حکومت کرنے والا بھی دنیا سے خالی ہاتھ ہی گیا‘‘۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ:

یہ دنیا کسی کو اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟
مزہ تو جب ہے اگر اس میں بقا ہو!

اس سلسلہ میں ایک بہت ہی عبرت آموز واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بیٹے سے وصیت کرتے ہوئے کہا کہ ’’بیٹا! میرے مرنے کے بعد میرے پیروں میں یہ پھٹے پرانے موزے پہنا دینا، میری خواہش ہے کہ مجھے قبر میں اسی طرح اُتارا جائے‘‘ باپ کا مرنا تھا کہ غسل اور کفن کی تیاری ہونے لگی، چناں چہ حسب وعدہ بیٹے نے کسی عالم دین کے سامنے اس وصیت کا اظہار کیا، مگر انھوں نے اجازت نہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ’’ہمارے دین میں میت کو صرف کفن پہنانے کی اجازت ہے‘‘ مگر لڑکے نے کافی اصرار کیا، جس کی بنا پر علماءِ شہر ایک جگہ جمع ہوئے، تا کہ کوئی نتیجہ نکل سکے، مگر ہونا کیا تھا؟......صرف لفظی تکرار بڑھتی گئی....بس۔

اسی اثنا ایک شخص واردِ مجلس ہوا اور بیٹے کو باپ کا ایک خط تھما دیا، جس میں باپ کی وصیت یوں تحریر کی گئی تھی:

''میرے پیارے بیٹے ! دیکھ رہے ہو؟ کثیر مال و دولت، جاہ و حشم، باغات، گاڑی، کارخانہ اور تمام اسباب و وسائل مہیا ہونے کے باوجود صرف اتنی بھی اجازت نہیں کہ میں ایک بوسیدہ موزہ اپنے ساتھ لے جاسکوں، ایک روز تمہیں بھی موت آئے گی، آگاہ رہو کہ تمہیں بھی صرف ایک کفن ہی لے کر جانا پڑے گا، لہٰذا کوشش کرنا کہ جو مال و دولت میں نے ترکہ میں چھوڑی ہے اس سے صحیح استفادہ کرتے ہوئے نیک راہ میں خرچ کرنا، بے سہاروں کا سہارا بننا، کیوں کہ جو واحد چیز قبر میں تمہارے ساتھ آئے گی وہ صرف تمہارے اعمال ہوں گے۔''

موت کے بعد مرنے والے کے ساتھ اس کا عمل جاتا ہے، مال یہیں رہ جاتا ہے، (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص: ۴۴۰) مکان، دوکان، فیکٹری، کھیتی، زمین، جائداد، زیور، جانور اور سواری سب کا سب یہیں رہ جاتا ہے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہ خاک کا پتلا خاک میں مل جاتا ہے۔ بقولِ شاعر:

تھا جو مشغولِ ہوس تعمیل فرماں چھوڑ کر
چل دیا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

اب رہی بات میت کے ترکہ کی جو اس وقت ہمارا موضوعِ سخن ہے، تو اس سلسلہ میں ربِ کریم کا حاکمانہ وحکیمانہ، عادلانہ اور معتدل حکم یہ ہے کہ اس مال سے مرنے والے کی تجہیز و تدفین کے علاوہ اگر قرض ہو تو اسے ادا کرنے اور وصیت کی ہو (بشرطیکہ گناہ اور وارث کے لیے نہ کی ہو، تو) ایک تہائی مال میں اسے نافذ کرنے کے بعد جو کچھ بچے خواہ وہ ذاتی و شخصی استعمال کی چیز ہو یا نقود و عروض ہو، جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، غرض ہر طرح کا چھوٹا بڑا سامان ''مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ'' (النساء: ۷) کم ہو یا زیادہ، وہ موجودہ وارثوں میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، یہ ان کا وہ حق ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے۔

وارثت کے تمام احکام قرآن وسنت سے ثابت ہیں:

اسی لیے ترکہ (وراثت) کی تقسیم کے سلسلہ میں کسی کو قطعاً اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے تقسیم کرے، کیوں کہ ایک تو اس میں ناانصافی کے امکانات ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان عقل وفہم کے لحاظ سے کمزور واقع ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ دانا وبینا ہونے کے باوجود کبھی عین منفعت کو مضرت اور کبھی سراسر مضرت (نقصان) کو منفعت (نفع) سمجھنے لگتا ہے، ربِ کریم ان سب باتوں سے بخوبی واقف ہے، اس لیے احکامِ وراثت کے موقع پر بطورِ خاص اِن الفاظ سے تنبیہ وتسکین فرمائی کہ:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (النساء: ۱۱)

”تم نہیں جانتے کہ تمہارے آباؤ اجداد اور اولاد میں فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے؟ یہ حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمام حقیقتوں سے واقف اور دانا وبینا ہے۔“ اس سے ثابت ہوگیا کہ احکامِ وراثت اور وارثوں کے حصص خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قیاس واجتہاد نہیں چل سکتا۔ علماءِ محققینؒ نے فرمایا کہ وراثت کے علاوہ شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں ان میں سے بعض تو کتاب وسنت اور بعض قیاس واجتہاد سے ثابت ہیں، لیکن وراثت کے تمام ہی احکام قرآن وسنت سے ثابت ہیں، ان میں قیاس واجتہاد کا کوئی دخل نہیں۔

علم وراثت کی عظمت وفضیلت:

احکامِ وراثت کی اہمیت وعظمت کے پیشِ نظر حدیث پاک میں حکم دیا گیا کہ لوگو! ”تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ“ جس اہمیت وعظمت سے قرآن اور اس کے احکام کو سیکھتے ہو اسی طرح وراثت کا علم اور اس کے احکام سیکھنے کا بھی اہتمام کرو، یہ علم بھی قرآنی، شرعی اور دینی علوم

کا ایک اہم جزو ہے۔ بلکہ ایک حدیث میں اسے "نِصۡفُ الۡعِلۡمِ" فرمایا گیا، جس سے علم وراثت کی اور بھی عظمت وفضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہمارے علماء نے علمِ وراثت کو نصف العلم کہنے کی مختلف وجوہات بیان فرمائی ہیں: بعض علماء نے فرمایا کہ یہ متشابہات میں سے ہے، اس کے معنیٰ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ اور بعضوں نے فرمایا کہ اسے نصف العلم اس کی عظمت وفضیلت کی وجہ سے فرمایا ہے کہ اس کے ایک مسئلہ پر سو نیکیاں ملتی ہیں، جب کہ دوسرے علوم میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔" (مستفاد از: "تیسیر الفرائض" /ص: ۱۵)

لہٰذا جس علم کی جیسی عظمت ویسی فضیلت، پھر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حق تعالیٰ کا دستور قرآن کریم میں مذکور دیگر شرعی احکام کے متعلق عموماً یہ رہا کہ انہیں اجمالی طور پر بیان فرمایا، مثلاً ﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ نماز قائم کرو۔ ﴿آتُوا الزَّكٰوةَ﴾ زکاۃ ادا کرو۔ ﴿أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ حج وعمرہ اللہ کے لیے ادا کرو۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ تم پر روزہ فرض کیا گیا۔...... وغیرہ، ان کی تفصیلات نہیں بتلائیں، اس کے برخلاف احکام وراثت کی تفصیلات اور اس کی جزئیات تک کو نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ مختصر آیتوں میں بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے بیان فرمایا۔

تقسیم وراثت کے اصول:

چناں چہ ارشاد فرمایا: ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ﴾ "اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے۔" مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جانب سے نہایت شفقت وخیرخواہی سے تمہیں تقسیم وراثت کا حکم دیا جاتا ہے۔ ﴿فِيۡ أَوۡلَادِكُمۡ﴾ تمہاری اولاد کے بارے میں جن سے تم سب سے زیادہ تعلق رکھتے ہو، اس کے بعد آگے والدین، پھر زوجین اور بھائی بہنوں کا ذکر ہے۔

صاحبو! اس طرزِ بیان اور ترتیب قرآنی کی حقیقت اور حکمت جو بھی ہو وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، البتہ اس سے تقسیم وراثت کے کچھ اصول وضوابط ضرور معلوم ہو گئے۔ مثلاً:

(۱) مالِ وراثت میں مرنے والے کے اقارب کا حق ہے، اجانب کا نہیں۔

حتیٰ کہ لے پالک (منہ بولا) بیٹا یا بیٹی اگر پہلے سے اجنبی ہوں تو ان کو بھی وراثت سے حصہ نہیں مل سکتا، جیسا کہ آیت کریمہ کی ترتیب سے واضح ہوتا ہے۔

(۲) اور مطلق قرابت ہی کافی نہیں، بلکہ اس میں اقربیت شرط ہے، اسی لیے پہلے وارثانِ بلا واسطہ کو ذکر کیا، ورنہ ہر مرنے والے کی وراثت کو پوری دنیا کی تمام انسانی آبادی پر تقسیم کرنا ضروری ہو جاتا، کیوں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، لہٰذا دور اور قریب کا کچھ نہ کچھ رشتہ سب میں موجود ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص کی وراثت کو سب میں تقسیم کیا جائے، اس لیے یہ ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہے تو یہ اصول بنایا جائے کہ اگر قریب اور دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو ’’اَلْأَقْـرَبُ فَـالْأَقْرَبُ‘‘ کے ضابطہ سے قریبی رشتہ دار کو دور کے رشتہ دار پر ترجیح دی جائے۔

(۳) اس سے اور ایک ضابطہ معلوم ہو گیا کہ مالِ وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں، بلکہ اقربیت کے معیار سے ہونی چاہیے، اس لیے ضروری نہیں کہ ورثاء میں جو زیادہ ضرورت مند اور حاجت مند ہوں ان کو زیادہ میراث دی جائے، وجہ یہ ہے کہ ضرورت و حاجت کوئی دائمی چیز نہیں، وہ تو آج ہے کل ختم ہو سکتی ہے، حالات بدلتے رہتے ہیں، جب کہ رشتہ داری تو دائمی چیز ہے، وہ بدلا نہیں کرتی، اور اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ مالِ وراثت کی تقسیم کو اقربیت اور رشتہ داری پر اس لیے بھی منحصر کر دیا گیا، تا کہ مرنے والے کو مال ومتاع چھوٹنے کا زیادہ غم نہ ہو، وہ یہ سوچ کر اپنی تسلی کر لے کہ خیر مجھے نہیں تو میرا مال مرنے کے بعد میرے اقرباء ہی کے کام آئے گا۔ مزید احسان ربِ کریم کی جانب سے یہ ہے کہ میراث کا جو مال وارثوں کو ملتا ہے (حق تعالیٰ کی جانب سے اس پر) میت کو مثل صدقہ کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔ (کذا فی المسلم و شرحہ للنووی، از مفید الوارثین/ص:۱۱)

(۴) وراثت میں مرد وعورت اپنے حصہ کے بقدر حق دار ہیں۔ ﴿يُوصِيكُمُ

اللّٰہُ فِیۡ أَوۡلَادِکُمۡ﴾......الخ سے جو قاعدۂ کلیہ بیان کیا گیا ہے اس نے لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا مستحق بھی بنا دیا، اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا، پھر اس سلسلہ میں کمزور اور قوی، جوان اور بوڑھے، چھوٹے اور بڑے کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے، جیسا کہ آیت وراثت کے شانِ نزول سے ثابت ہوتا ہے۔

آیتِ وراثت کا شانِ نزول:

رسول اکرم، شاہِ بنی آدم، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت اوس بن ثابت انصاریؓ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے ورثاء میں بیوی کے علاوہ تین لڑکیاں اور ایک روایت کے مطابق دو لڑکیاں اور ایک نابالغ لڑکا چھوڑے، حضرت اوسؓ نے جن کو اپنے مال کا ذمہ دار بنایا تھا انہوں نے عرب کے غیر شرعی دستور کے مطابق کل مال اوس کے چچا زاد بھائیوں خالد اور عرفطہ کو دے دیا، بیوی بچوں کو کچھ نہ دیا، کیوں کہ جہلاءِ عرب کے نزدیک جاہلیت قدیمہ میں (جاہلیت جدیدہ کی طرح) عورت مطلق وراثت کی حقدار نہ تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لیے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہو گئیں اور لڑکا نابالغ ہونے کی وجہ سے محروم کر دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں مرحوم کی بیوہ اور یتیم بچے بے سہارا ہو گئے، دربارِ رسالت میں آ کر انہوں نے اپنی بے کسی اور بے بسی کا اظہار کیا، آپ ﷺ نے سن کر بہت افسوس کیا، لیکن اس وقت چوں کہ قرآنِ کریم میں آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی اس لیے آپ ﷺ نے اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہ کیا، وحی الٰہی کا انتظار کیا، بس اسی وقت اس آیت کریمہ کا نزول ہوا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدَانِ وَالۡأَقۡرَبُوۡنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدَانِ وَالۡأَقۡرَبُوۡنَ﴾ (النساء : ۷)

جس کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کے لیے بھی اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں سے حصہ ہے

جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔

اس سے اجمالی طور پر اتنا معلوم ہو گیا کہ میراث میں صرف مردوں ہی کا حق نہیں، بلکہ عورتوں کا بھی حق اور حصہ ہے، لیکن یہ واضح نہ ہوا کہ مردوں کا کتنا حصہ اور عورتوں کا کتنا؟ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اوسؓ کے مال کو تقسیم کیے بغیر حفاظت سے رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے کہ قبیلۂ خزرج کے ایک جلیل القدر انصاری صحابی حضرت سعد بن ربیعؓ شوال سن ہجری ۳ میں غزوۂ اُحد کے موقع پر بارہ زخم کھا کر شہید ہو گئے، ان کی شہادت کے بعد جب تقسیم وراثت کا مسئلہ پیش آیا تب میراث کا آخری اور تفصیلی حکم اس آیت کریمہ کی صورت میں نازل ہوا:

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (النساء: ۱۱)

”اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔“

جس میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا حق ثابت ہو کر نصف حصہ مقرر ہو گیا۔ (مشکوٰۃ/ص:۲۶۴) جو عین حکمت اور عقل وعدل پر مبنی بلکہ ان کے ساتھ رحم دلی ہے۔

خواتین کا حصۂ وراثت مردوں سے کم ہونے کی حکمت:

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ”اگر اسلام کے سماجی نظام کے پس منظر میں اس مسئلہ پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ نہایت انصاف اور توازن پر مبنی قانون ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ شریعت نے تمام مالی ذمہ داریاں مردوں پر عائد کی ہیں، اپنے اخراجات، اپنی بیوی کی ضروریات، بال بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت اور ان کی شادی، بوڑھے ماں باپ کی کفالت، بعض حالات میں مطلقہ اور بیوہ بہن (بیٹی) اور ان کے بال بچوں کی کفالت (یہ سب مردوں کے ذمہ ہے)، عورت پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں، نہ اپنی، نہ شوہر کی، نہ بال بچوں کی۔ ذمہ داریوں کے اس تفاوت کو دیکھتے ہوئے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مردوں کا حصہ بمقابلہ عورتوں کے دو گنا نہیں بلکہ کئی گنا ہونا چاہیے، لیکن

شریعت نے عورتوں کے قدرتی ضعف نیز کسب معاش کی (مردوں کی طرح) صلاحیتوں سے (عموماً) محرومی، اوران کی لطافت کو سامنے رکھتے ہوئے ذمہ داریوں سے تو بری کیا ہی، میراث میں بھی مرد کا آدھا عطا کیا، یہ عورتوں کے ساتھ خصوصی رحم دلی ہے، نہ کہ ظلم وزیادتی اور ناانصافی۔ (خطبات بنگلور/ص:۱۳۰)

پھراسی پر اکتفا نہیں ہوتا، بلکہ ہر شادی شدہ عورت کو وراثت کے موقع پر دہرا حصہ حاصل ہوتا ہے:

(۱) ایک میکے میں باپ کے ترکہ سے۔

(۲) دوسرا سسرال میں شوہر کے ترکہ سے، اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت وراثت کے معاملہ میں گھاٹے میں نہیں۔

احکامِ وراثت سے غفلت:

بہرکیف شریعت میں وراثت کی بہت ہی زیادہ اہمیت ہے، اسی لیے تمام ورثاء کے حصص متعین فرما کر اس کے احکامات و جزئیات پر قرآن وسنت میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی، اور اس کے مسائل وفضائل بتلا کر اس کی طرف متوجہ کیا گیا۔

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس کا کس قدر اہتمام تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت حمدون قصارؒ اپنے ایک دوست کی بیماری میں عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو اسی دوران اس بیمار دوست کا انتقال ہوگیا، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انہوں نے فوراً اسے بجھا دیا اور خود کی رقم سے تیل منگوا کر روشنی کی، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: ”جب تک یہ زندہ تھا چراغ اس کی ملکیت تھی، لہٰذا اس کا استعمال درست تھا، اب جب کہ یہ رخصت ہوگیا تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہوگیا، اور یہاں تمام ورثاء موجود نہیں، لہٰذا ان کی اجازت کے بغیر چراغ جلانا مناسب نہیں، اس لیے میں نے اپنی رقم

سے تیل منگا کر روشنی کی۔'' (معارف القرآن:۲/ ۳۱۷)

مگر افسوس کہ علم وراثت جس قدر اہمیت، عظمت اور فضیلت کا حامل ہے بدقسمتی سے آج تقسیم وراثت سے اتنی ہی غفلت برتی جارہی ہے، اس میں صرف عوام ہی کی کوتاہی نہیں، بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے، دیندار کہلانے والے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی اکثر اس سلسلہ میں غافل اور گنہگار نظر آتے ہیں۔

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کھلی آنکھوں نظر آرہی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ میں فرمایا تھا کہ ''اے لوگو! میں تم میں ہمیشہ نہیں رہوں گا، لہٰذا فرائض (وراثت کے احکام) سیکھ لو، اور (یکے بعد دیگرے) لوگوں کو بھی سکھاؤ، وہ وقت قریب ہے کہ وحی الٰہی کا دروازہ بند ہوجائے گا (کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وحی و نبوت اور رسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند) اور علم معدوم ہوکر فتنے رونما ہوں گے، پھر فرمایا:

''حَتّٰى يَخْتَلِفَ اثْنَانِ فِيْ فَرِيْضَةٍ لَا يَجِدَانِ أَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا''. (رواه الدارمی والدارقطنی، مشکوٰۃ/ص: ۳۸/ الفصل الثالث)

''یہاں تک کہ علم فرائض کے بارے میں دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرنے والا بھی نہ ہوگا۔'' یعنی اس سے عمومی غفلت ہوگی۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس ارشاد کی تصدیق کا وقت اب قریب آرہا ہے، کیوں کہ اس وقت اول تو وراثت کی تقسیم ہوتی نہیں، الا ماشاء اللہ، اگر کہیں تقسیم ہوتی بھی ہے، تو عموماً ترتیبِ شریعت کے خلاف ہوتی ہے، کہیں عورتوں، بیٹیوں بہنوں اور بیواؤں کو مستقل نظر انداز کیا جاتا ہے، تو کہیں صرف بڑے بیٹے کو کل مال کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے، کسی جگہ سرے سے تقسیم وراثت کا طریقہ ترک کرکے ''مشترکہ خاندانی جائداد'' کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اور لوگوں کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہی تو ہیں؟ اور ہر چیز ایک دوسرے کو

استعمال کرنے کی اجازت بھی ہے، تو تقسیم وراثت کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ اس وقت دوسرے ورثاء چھوٹے یا ماتحت ہونے کی وجہ سے شرما شرمی میں کچھ کہتے نہیں، اس طرح کے حیلوں سے ورثاء کو محروم کیا جاتا ہے، یہ از روئے شرع باطل اور سخت گناہ ہے۔

وراثت کی وصیت:

آج اگر کوئی شخص اپنے بعد اس طرح کا خطرہ محسوس کرتا ہو تو اس کے لیے وراثت کی وصیت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ فقیہ النفس حضرت علامہ مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''احکام وراثت سے پہلے حکم تھا کہ جب موت کا وقت قریب آئے تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کرو، مگر جب احکام وراثت نازل ہوئے اور تمام ورثاء کے حصص متعین ہوئے تو ورثاء کی وصیت والا حکم نہیں رہا، مگر اب بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ جیسے کسی کو ڈر ہو کہ اس کے مرنے کے بعد بعض ورثاء سب ترکہ پر قبضہ کرلیں گے، ماں باپ وغیرہ کو کچھ نہ دیں گے، یا بعض بیٹے قبضہ کرلیں گے اور بعض کو کچھ نہ دیں گے، تو ایسی صورت میں ایک وصیت نامہ لکھ کر کورٹ میں رجسٹر کرانا ضروری ہے۔ (علمی خطاب:۱/۳۷)

یاد رہے کہ جو لوگ ورثاء کو ان کے حق وراثت سے محروم کرتے یا رکھتے ہیں یا ان کے حصص میں کمی وکوتاہی کرتے ہیں قرآن وسنت میں ان کے لیے بڑی سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

ورثاء کو حصۂ میراث سے محروم رکھنے کی وعید:

ان ہی کے بارے میں قرآن نے کہا:

﴿وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا﴾ (الفجر: ۱۹)

''تم میراث کا سارا مال سمیٹ (کر حرام) کھاتے ہو۔'' اس سے ثابت ہوا کہ یہ حرام کام ہے، اس کے علاوہ جو لوگ اپنی زندگی میں خواہ مخواہ کسی وارث سے ناراض ہو کر بغیر

کسی شرعی وجہ کے اسے محروم کردیتے ہیں، ان کے لیے بھی بڑی سخت وعید ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثَ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة/ص:٢٦٦/ الفصل الثالث)

''جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا حق تعالیٰ اس کو قیامت میں جنت کی وراثت سے محروم کرے گا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے ﴿يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ﴾ کا جو وعدہ فرمایا ہے، میراث سے وارث کو محروم کرنے والا اس میراثِ جنت سے محروم کردیا جائے گا۔ (ابتداءً نجات پاکر جنت میں داخل ہونے والوں میں سے وہ نہ ہوگا)

ایک اور صحیح حدیث شریف کا مضمون ہے کہ ''بعض لوگ تمام عمر اطاعت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، لیکن موت کے وقت میراث میں وارثوں کو ضرر پہنچاتے ہیں (یعنی بلا وجہ شرعی کسی حیلہ سے جان بوجھ کر محروم کردیتے ہیں، یا حصہ کم کردیتے ہیں، یا اپنا تمام مال ایک ہی وارث یا کسی ایک وارث کو چھوڑ کر چند وارثوں کو ہبہ اور ہدیہ کردیتے ہیں، یا کسی غیر وارث کے حق میں تہائی سے زیادہ وصیت کرجاتے ہیں وغیرہ) ایسے لوگوں کو حق تعالیٰ مرنے کے بعد سیدھا دوزخ میں پہنچادیتا ہے''۔ (ابوداود، مشکوٰۃ:۲۶۵)

صاحبو! احکامِ وراثت میں حق تعالیٰ کے واضح اور صریح حکم کی خلاف ورزی کرنا بہت بڑی سرکشی اور اعلیٰ درجہ کا جرم ہے، بلکہ کفر تک کا اندیشہ ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (النساء: ١٤)

''جو (کوئی اس وراثت کے معاملہ میں بھی) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا، تو اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا،

جہاں وہ مدتوں رہے گا اور نہایت ذلیل کرنے والا عذاب پائے گا۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

اس سے معلوم ہوا کہ ورثاء کو ان کے حصۂ میراث سے محروم کرنے یا رکھنے سے عقبیٰ تباہ ہو جاتی ہے، اور دنیا کی بھی کیا گارنٹی؟ کہ مال میں وفا اور بقا کہاں؟ ورنہ مرنے والے سے جدا ہی کیوں ہوتا؟ بقولِ مولانا جلال الدین رومیؒ

مالِ میراثے ندارد خود وفا چوں بنا کام از گذشتہ شد جدا

وراثت کا مال وفادار نہیں ہوتا، ورنہ مرنے والے سے جدا کیوں ہوتا، جب کہ مال مرنے والے سے ناکامی کے ساتھ جدا ہو گیا۔ مال جیسے مرنے والوں سے جدا ہو گیا ایک نہ ایک دن ہم سے بھی جدا ہو جائے گا کہ خالی ہاتھ آئے تھے، اب خالی ہاتھ جائیں گے۔ اس لیے مال کے لیے اپنے اعمال اور مآل (انجام) کو برباد کرنا عقلمندی نہیں۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَا ھُوَ أَھْلُہٗ.
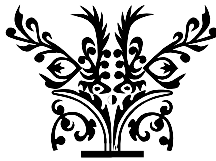
(۴۰)

فضائل دعا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ النُّعۡمَانِ بۡنِ بَشِیۡرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "الدُّعَاءُ هُوَ الۡعِبَادَةُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِیۡ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ﴾ (رواه أحمد والترمذی وأبو داود والنسائی وابن ماجه، مشکوٰۃ/ص:۱۹٤/ کتاب الدعوات/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دعا عین عبادت ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے (بطورِ سند یہ آیت تلاوت کی) فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِیۡ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ﴾ (المؤمن: ٦٠) تمہارے رب کا فرمان ہے کہ مجھ ہی سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔''

دعا عبادت کا جوہر اور خاص مظہر ہے:

انسان شرف وفضل اور علم وعقل کا حامل ہونے کے باوجود کس قدر عاجز ہے کہ روزانہ بلکہ ہر لمحہ جن چیزوں کا وہ ضرورت مند ہے اسے بھی وجود میں نہیں لاسکتا، مثلاً نہ وہ اپنے لیے (اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر) پانی کا ایک قطرہ وجود میں لاسکتا ہے، نہ وہ ہوا اور آکسیجن کو پیدا کرسکتا ہے، جس کے بغیر چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا، اور اللہ تعالیٰ کتنا عظیم اور قادر ہے کہ جس نے اتنی بڑی کائنات اپنی مخلوقات کے لیے پیدا فرمائی اور ان کی ہر طرح

کی ضروریات کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا، پھر وہ مہربان اور سخی بھی کتنا ہے کہ اپنے خزانۂ قدرت سے نعمتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری فرمایا اور دنیا میں اچھے برے کے فرق کے بغیر بے شمار نعمتوں سے نوازا اور ہر ایک کو دامن بھر بھر کر کے دیا، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر کون اس لائق ہوسکتا ہے کہ عاجز اور محتاج انسان اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اپنی تمام ضروریات کے کشکول صرف اور صرف اسی کے سامنے کھولے، جب انسان اس طرح اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مانگتا ہے تو اسی اداءِ بندگی کا نام دعا ہے۔ دعا اور عبادت میں خاص مناسبت ہے، اس لیے کہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے حضور سراپا محتاج بن کر اپنی عاجزی اور محتاجی کا مظاہرہ کرے، اور یہ بات دعا میں پورے طور پر موجود ہے، کیوں کہ دعا کا جزو وکل اور اول و آخر اور ظاہر و باطن یہی ہے کہ بندہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے انتہائی عاجزی سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگے کہ دعا بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک سیدھا رابطہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو حقیقت عبادت کی ہے وہی حقیقت دعا کی بھی ہے، اس لیے ہر عبادت دعا ہے اور ہر دعا عبادت بلکہ عبادت کا جوہر اور خاص مظہر ہے، اسی وجہ سے آیتِ قرآنی

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (المؤمن: ٦٠)

''جولوگ مجھ سے مانگنے میں تکبر کرتے ہیں، قریب ہے کہ وہ دوزخ میں ذلیل ہوکر داخل ہوں۔''

اس میں ''عبادت'' بمعنیٰ دعا ہے، اور خود حدیث میں بھی دعا کو عبادت کا مغز بتلایا:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ١٩٤/ الفصل الثانی)

دعا سب سے قیمتی عمل ہے:

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ دعا عبادت کا خلاصہ، مغز، جوہر، زینت اور ایک خوشنما

شیریں پھل ہے، جو ایمان کے اس پودے پر لگتا ہے جس کی آبیاری ندامت کے آنسوؤں سے کی جاتی ہے، تو اس کا پہلا پھل صبر وسکون، راحت اور عبادت کی صورت میں ملتا ہے، اور عبادت ہی انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے، تو اب یہ بات خود بخود متعین ہوگئی کہ انسان کے اعمال واحوال میں دعا ہی سب سے زیادہ مکرم ومحترم اور قیمتی شے ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "لَیْسَ شَيْءٌ أَکْرَمَ عَلَی اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ" (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۹٤/ الفصل الثانی)

یعنی اللہ رب العزت کے یہاں کوئی چیز دعا سے زیادہ عزیز نہیں، دعا اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے لینے اور اس کی رحمت واعانت کو کھینچنے کا سب سے زیادہ طاقتور ذریعہ ہے۔

دعا کی حقیقت:

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ دعا صرف ان دعائیہ الفاظ کا نام نہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان الفاظ کو تو زیادہ سے زیادہ دعا کا لباس اور قالب کہا جاسکتا ہے، دعا تو وہ ہے جو دل کی گہرائی سے اس یقین سے کی جائے کہ زمین وآسمان کے سارے خزانے صرف اور صرف ربِ کریم کے قبضہ واختیار میں ہیں، اور وہ اپنے در کے سائلوں اور مانگنے والوں کو عطا فرماتا ہے، اور ہمیں تب ہی کچھ ملے گا جب وہ عطا فرمائے گا، اس کے در کے سوا ہم کہیں سے کچھ نہیں پاسکتے، اس یقین اور سخت محتاجی وکامل بے بسی وفقیری کے احساس سے بندے کے دل میں جو خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جس کا زبان سے اظہار ہوتا ہے وہ ہے دعا، اس میں الفاظ سے زیادہ دلی جذبات اور کیفیات کی اہمیت ہے۔

پھر بندے کا کام ہے مانگنا، مولیٰ کا کام ہے دینا، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ﴾ (الفاطر: ۱۵)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات انسانی کو خطاب فرمایا کہ جو میرے ہیں وہ بھی اور جو میرے نہیں ہیں وہ بھی سنیں! تم سب امیر، کبیر اور حکمراں ومقتدا ہونے کے

باوجود تمہاری پہچان ہی یہ ہے کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے فقیر ہو، اور دائمی فقیر ہو، دنیا کے فقیر تو عارضی ہوتے ہیں، اگر انہیں ایک کروڑ دے دو تو مالدار ہو جائیں، لیکن تم اللہ تعالیٰ کے دائمی فقیر ہو، خواہ تم شاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، عامی ہو یا نامی، ﴿يَآاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ﴾ تم سب اللہ تعالیٰ کے فقیر ہو۔ یہاں جملہ اسمیہ ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے دائمی فقیر ہیں، تو فقیر کو کیا چاہیے؟ مانگنے کا پیالہ! تو وہ بھی حاضر ہے، فرمایا: او ہمارے دائمی فقیرو! ہم سے مانگنے کے لیے ہم تمہیں ایک دائمی پیالہ دیتے ہیں، پس ذرا اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر ملالو، بن گیا پیالہ، اب مانگو مجھ ہی سے، تمہارا مانگنا اور دعائیں کرنا مجھے بہت پسند ہے، وعدہ کرتا ہوں کہ جب تم مجھ ہی سے دعائیں کرو گے تو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ ﴿اُدْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

خدا سے مانگ جو مانگنا ہو اے اکبر!
یہی وہ در ہے جہاں آبرو نہیں جاتی

ایک واقعہ:

ابن جوزیؒ نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک فقیر کسی امیر کے پاس اپنی حاجت لے کر حاضر خدمت ہوا، اتفاق سے اس وقت وہ امیر سجدہ میں پڑا اللہ رب العزت سے دعا مانگ رہا تھا، یہ دیکھ کر وہ فقیر کہنے لگا: ''یہ خود تو دوسرے کا محتاج ہے، پھر میں اس سے کیوں مانگوں؟ میں بھی اپنی حاجت اس ذات کے سامنے کیوں نہ پیش کر دوں جس کا یہ محتاج ہے'' امیر نے فقیر کی یہ بات سن لی، اسے بلا کر دس ہزار کی خطیر رقم دی اور کہا: ''یہ رقم تجھے اسی ذات نے دی ہے جس سے میں سجدہ کی حالت میں مانگ رہا تھا، اور جس کی طرف تو نے رجوع کیا۔'' (از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۵۲)

دعا مانگنا حکم الٰہی کی اطاعت اور نہ مانگنا مخالفت ہے:

یوں تو ہر مذہب اور قوم میں دعا کا تصور ملتا ہے، لیکن اسلام کا پیغام ساری انسانیت

کے نام دعا کے سلسلے میں یہ ہے کہ اسی سے دعا مانگو جس کی شان یہ ہے کہ وہ دعا مانگنے والے سے خوش اور نہ مانگنے والے سے ناراض ہوتا ہے۔

ایک مسجد کے دروازے پر بڑا خوبصورت جملہ لکھا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ کے پاس آپ کو دینے کے لیے سب کچھ ہے، کیا آپ کے پاس (اس سے) مانگنے کے لیے (سلیقہ اور) وقت ہے؟ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

غیروں سے مانگا کچھ نہ ملا ذلت ملی — اللہ سے مانگا سب کچھ ملا عزت ملی
مانگ اسی سے جو دیتا ہے خوشی سے — کہتا نہیں کسی سے اور مطالبہ کیا سبھی سے

کہ ہم سے مانگو! یعنی دعا کرو۔

خداوند قدوس کی شان بڑی نرالی ہے، وہ مانگنے والوں کو خوش ہو کر دیتا ہے، جب کہ نہ مانگنے والوں سے سخت ناراض ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (الغافر: ٦٠)

جو اس سے نہیں مانگتے ان کو جہنم کی وعید سنائی گئی؛ کیوں کہ رب العالمین سے دعا مانگنا جہاں عبادت اور عبدیت ہے وہیں حکم الٰہی کی اطاعت بھی ہے، اور دعا نہ مانگنے میں فرمانِ الٰہی کی مخالفت ہے، اس بنا پر وہ دعا نہ مانگنے والوں سے ناراض ہوتا ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبُ عَلَيْهِ''. (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۱۹۵/ الفصل الثانی)

جو اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض اور غضب ناک ہو جاتا ہے، یہ اس کی عجیب شان ہے، اس کے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں جو سوال نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہو، اور تو اور، حقیقی ماں باپ تک کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر بچہ بار بار مانگے اور سوال کرے تو وہ بھی چڑ جاتے ہیں، سیٹھ صاحب سے کوئی ضرورت مند سوال کرے تو ایک دو مرتبہ ضرورت پوری

کردیں گے، لیکن بار بار سوال کیا جائے تو وہ بھی کہہ دیتے ہیں: ”تمہیں مانگتے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے“ ناراض ہو جاتے ہیں، یہ دنیا والوں کا حال ہے کہ مانگنے والے سے ناراض ہوتے ہیں، لیکن دنیا بنانے والے ہمارے خالق و مالک کا حال یہ ہے کہ نہ مانگنے والے سے ناراض ہوتا ہے، عربی کے ایک شاعر نے کتنی عمدہ بات اپنے شعر میں کہی ہے:

لَا تَسْـأَلَـنَّ بَنِـيُ اٰدَمَ حَـاجَةً ☆ وَسَـلِ الَّـذِیُ أَبُوَا بُهٗ لَاتُحُجَبُ
اَللّٰـهُ يَـغُـضَبُ إِنُ تَرَكُتَ سُوَالَهٗ ☆ وَ ابُـنُ اٰدَمَ حِيُـنَ يُسُأَلُ يَغُضَبُ

لوگوں سے کیوں سوال کرتے ہو؟ اسی سے سوال کرو نا! جس کا دروازہ کبھی کسی کے لیے بند نہیں ہوتا، اس مالکِ حقیقی کی یہ انوکھی شان ہے کہ جب تم اس سے مانگو تو وہ خوش ہوتا ہے اور نہ مانگو تو روٹھ جاتا ہے، جب کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان سے مانگو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔

دعا کی قبولیت کا وعدہ امت محمدی کی خصوصیت:

پھر یہ دعا بندۂ خدا کی گویا درخواست ہے، بندہ کا کام دربارِ الٰہی میں مانگنا ہے، جب بندہ اپنا کام کرتا ہے تو خدا بھی اپنا وعدہ پورا کرتا ہے کہ اس نے دعا مانگنے والوں کی دعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے: ﴿اُدْعُـوْنِـیْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ مجھے پکارو! مجھ ہی سے دعائیں مانگو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے تو اس موقع پر عجیب بات فرمائی ہے:

چوں دعا را امر کردی اے عُجَاب ☆ ایں دعائے خویش را کن مستجاب

اے ہمارے رب! جب تو نے ہمیں دعا کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ دعا ہماری نہیں بلکہ تیری ہے، لہٰذا اپنی دعا کو تو قبول فرمالے۔

حضرت پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ فرماتے ہیں: ”روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی الٰہی آئی:

"خَمُسَةٌ مِنِّى وَ خَمُسَةٌ مِّنُكَ، اَلْأُلُو هِيَّةُ مِنِّى وَالْعُبُودِيَّةُ مِنُكَ، النِّعُمَةُ مِنِّى وَالشُّكُرُ مِنُكَ، الُقَضَاءُ مِنِّى وَالرِّضَا مِنُكَ، الإِجَابَةُ مِنِّى وَالدُّعَاءُ مِنُكَ، الُجَنَّةُ مِنِّى وَالإِطَاعَةُ مِنُكَ".

پانچ چیزیں میرے لیے ہیں اور پانچ چیزیں تمہارے لیے ہیں:

(۱) الوہیت میرے لیے تو عبدیت تمہارے لیے۔

(۲) نعمت میری طرف سے ہے تو شکر تمہاری طرف سے۔

(۳) قضا میری جانب سے ہے تو رضا بالقضاء تمہاری جانب سے۔

(۴) دعا کی قبولیت میری طرف سے ہے تو دعا تمہاری جانب سے۔

(۵) اطاعت تمہاری طرف سے ہوگی تو جنت میری طرف سے ہوگی۔ جنت میری جانب سے انعام ہوگی بشرطیکہ تمہاری جانب سے میری اطاعت ہو۔

پھر یہ دعا کی قبولیت کا وعدہ بھی اسی امت کی خصوصیت ہے، چناں چہ حضرت قتادہؒ نے حضرت کعب احبارؒ سے نقل فرمایا کہ "اس امت کو تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں کہ ان سے پہلے کسی امت کو نہیں دی گئیں، بجز نبی کے۔

(۱) انبیاءِ سابقین علیہم السلام میں سے ہر نبی سے یہ فرمایا تھا: "أَنُتَ شَاهِدٌ عَلَى النَّاسِ" آپ (اپنی امت کے) لوگوں پر گواہ ہیں، لیکن اس امت سے فرمایا:

﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرة : ١٤٣)

"مسلمانو! اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے، تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو۔"

(۲) حضرات انبیاء علیہم السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ "لَيُسَ عَلَيُكَ فِى الدِّيُنِ مِنُ حَرَجٍ" "تم پر دین میں کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے، جب کہ حق تعالیٰ یہی بات اس امت سے فرمائی: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيُكُمُ فِى الدِّيُنِ مِنُ حَرَجٍ﴾ (الحج : ٧٨) "اور

اس نے تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔"

(۳) ہر نبی سے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا: "اُدْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَکُمْ" مجھے پکارو مجھ ہی سے دعا کرو، میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا، اور یہاں یہی وعدہ پوری امت سے کیا گیا: ﴿اُدْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ تم مجھ سے دعائیں کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔
(ابن ابی حاتم، امام ترمذی اسے حسن صحیح کہتے ہیں، از گلدستۂ تفاسیر/ص: ۶/۲۸۲)

دعا کی قبولیت کا مطلب اور اس کی صورتیں:

لیکن اس موقع پر دعا کی قبولیت کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیے؛ کیوں کہ بہت سے لوگ ناواقفیت سے دعا کی قبولیت کا مطلب صرف یہی سمجھتے ہیں کہ بندہ دعا میں اپنے مولیٰ سے کچھ بھی مانگے تو وہ فوراً مل جائے، اب اگر وہ نہیں ملتا تو سمجھتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی، حالاں کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی اور نادانی ہے، حقیقت یہ ہے کہ بندہ خواہ کتنا ہی علم حاصل کرلے، مگر اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا علم بے حد ناقص ہے، بلکہ بندہ اپنی خلقت کے لحاظ سے ظلوم وجہول ہے، بہت سے بندے ہیں جن کے لیے مال و دولت فضل اور نعمت ہے، جب کہ بہت سوں کے لیے فتنہ ہے، بعض کے لیے حکومت قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور بعض کے لیے اللہ تعالیٰ سے بعد اور دوری کا سبب ہے۔

بندہ نہیں جانتا کہ کون سی چیز اس کے لیے مفید ہے اور کیا مضر ہے، کونسی چیز اس کے لیے بہتر ہے اور کونسی بدتر ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا:

﴿عَسٰی أَنْ تَکْرَهُوا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی أَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۱۶)

"اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو حالاں کہ وہ تمہارے حق میں بری ہو۔" بسا اوقات بندہ ایسی چیز دعا میں مانگتا ہے جو اس کے لیے مفید نہیں ہوتی، یا اس کا عطا کرنا حکمت الٰہی کے خلاف ہوتا

ہے، لیکن دوسری طرف اس کریم آقا کی شانِ کریمی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ بندے نے مجھ سے دعا کی تو اس کی دعا رد نہ کی جائے، اس لیے باری تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ دعا کرنے والے کو محروم نہیں لوٹاتا، بشرطیکہ وہ معاصی اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے تو اس کی دعا ضرور قبول کرتا ہے، لیکن اس کی تین مختلف صورتیں ہیں:

(۱) "إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ"

کبھی تو اس کو ہاتھ کے ہاتھ وہی عطا فرما دیتا ہے، جو دعا میں اس نے مانگا۔

(۲) "وَ إِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ"

یا کبھی اس کی دعا کو آخرت میں اس کا ذخیرہ بنا دیتا ہے، اس کی دعا کے عوض آخرت کی بیش بہا نعمتوں کا فیصلہ فرما دیتا ہے، اور اس طرح اس کی یہ دعا جو دنیا میں قبول نہ ہوئی تھی وہ ذخیرۂ آخرت بن جاتی ہے، جو بہت بڑی نعمت ہے، حدیث میں ہے کہ جب بندہ کو ہر اس دعا کا بدلہ دیا جائے گا جو دنیا میں قبول نہیں ہوئی تھی تو وہ کہے گا: "يَا لَيْتَهُ لَمْ يُعَجَّلُ لَهُ شَيْءٌ مِنْ دُعَائِهِ". (کنز العمال/ ص: ۵۷/ معارف الحدیث/ ص: ۱۴۳/ ۵)

کہ کاش! دنیا میں اس کی کوئی دعا قبول ہی نہ ہوتی اور ہر دعا کا بدلہ یہیں ملتا۔

(۳) "وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا".

(رواه أحمد، مشكوٰة/ص: ۱۹٦/ الفصل الثانی)

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اس دعا کرنے والے بندے پر اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی آفت و مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے، لیکن جب بندہ دعا کرتا ہے تو حق تعالیٰ آنے والی تکلیف اور مصیبت اس دعا کے نتیجہ میں روک دیتے ہیں۔

بہر حال بندے کی دعا رائیگاں نہیں جاتی، اور عجیب بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے دربار میں مانگنے کے لیے اور دعا میں ہاتھ اٹھانے اور پھیلانے کے لیے بزرگی بھی شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ کافر کی دعا بھی قبول کی جاتی ہے، بلکہ ابلیس لعین تک کی دعا تا قیامت زندہ رہنے

کی قبول ہوگئی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بندہ کو ہر مانگی ہوئی چیز دے دی جائے، اس کی اجابت کے مختلف طریقے ہیں جو حدیث میں بیان کر دیے گئے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دعا میں مانگی ہوئی چیز کا ملنا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف اور حکمت کے تابع ہے، بندہ کا کام بس مولیٰ سے مانگنا ہے۔

دعا کے دو فائدے:

پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عبادت بھی قرار دیا ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد ہے: "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" دعا عین عبادت ہے (اصل حدیث صرف اتنی ہے) غالباً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ بندے جس طرح اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے دوسری محنتیں اور کوششیں کرتے ہیں اسی طرح کی ایک کوشش دعا بھی ہے، جو اگر قبول ہوگئی تو بندہ کامیاب ہوگیا اور اس کو اپنی کوشش کا پھل مل گیا، ورنہ کوشش بےکار ہوگی، فرمایا: دعا کا معاملہ ایسا نہیں، اس کی ایک مخصوص نوعیت ہے، اور وہ یہ ہے کہ دعا حصولِ مقصد کا وسیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ عین عبادت بھی ہے، لہٰذا قبولیت کا نفع تو دنیا میں نقد ملتا ہے، ساتھ ہی عبادت ہونے کی وجہ سے اس کا اجر آخرت میں ضرور ملے گا۔ یہ ہے: "آم کے آم، گٹھلی کے دام۔"

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "اگر دعا سے مقصد حاصل ہوگیا، تب تو مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب! لیکن اگر مقصد اور مطلب حاصل نہ بھی ہوا تو ثواب تو کہیں گیا ہی نہیں"۔ معلوم ہوا کہ دعا کے دو فائدے ہیں:

(۱) دعا کی قبولیت سے دنیا میں نقد فائدہ ہوگا۔

(۲) اور دعا کے عبادت اور عبدیت کا مظہر ہونے کی وجہ سے آخرت میں فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ لیکن اگر دعا کرنے والے بندے کے احوال و اعمال میں کوئی ایسی چیز ہو جو دعا کی قبولیت سے مانع ہو تو ایسی دعا بےاثر ہو جاتی ہے، اس کا کوئی نفع نہیں ہوتا۔

ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟

چناں چہ آج بہت سے دعا کرنے والوں کے دلوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب دعا کی قبولیت برحق ہے، تو پھر ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کے چند جوابات حدیث شریف میں ملتے ہیں:

(۱) کہ جب کھانا، پینا اور پہننا حرام ہو، اور حرام ہی سے دعا کرنے والے کی نشو ونما ہوئی ہو تو دعا قبول نہ ہوگی۔

”مَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِّيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذَالِكَ“. (رواه مسلم عن أبی هريرةؓ، معارف الحديث: ۵/۱۲۶)

معلوم ہوا کہ حرام کھانے، کمانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۲) جب بندہ غفلت کی حالت میں دعا مانگے تو ایسی صورت میں دعا قبول نہیں ہوگی۔ حدیث میں ہے:

”وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ“. (ترمذی، مشكوٰة/ ص: ۱۹۵)

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ اس بندے کی دعا قبول نہیں کرتا جس کا دل دعا کے وقت بھی اللہ تعالیٰ سے غافل اور بے پرواہ ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ غفلت کے ساتھ کی جانے والی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۳) بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یا بندہ اللہ تعالیٰ سے قطع رحمی کی دعا کرے تو ایسی صورت میں بھی دعا قبول نہیں ہوگی۔ حدیث میں:

” يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ“. (مسلم، مشكوٰة/ص: ۱۹۴)

بندہ کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ کسی گناہ اور قطع رحمی کا سوال

نہ کرے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی گناہ اور قطع رحمی والی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۴) بندہ اگر دعا کے بارے میں جلد بازی سے کام لے تو ایسی صورت میں بھی دعا قبول نہ ہوگی؛ کیوں کہ جلد بازی سے بعض اوقات مایوسی پیدا ہو جاتی ہے، پھر بندہ مایوس ہو کر دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ دعا کی قبولیت کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ حدیث میں ہے:

"يُسْتَجَابُ لِاَحَدِكُمْ مَالَمْ يُعَجِّلْ". (بخاری ومسلم)

تمہاری دعا اس وقت تک قابلِ قبول ہوتی ہے جب تک کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے، اور جلد بازی یہ ہے کہ بندہ کہے: "میں نے دعا کی تھی، مگر وہ قبول ہی نہیں ہوئی" بندہ کا کام دعا کر کے یقین رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیر سویر ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگی، پھر کبھی کبھی کسی مقصد کے حصول کے لیے بکثرت دعائیں کرنا ہی ترقی اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہوتا ہے، اور جلدی دعا قبول ہونے کی صورت میں اس نعمت عظمیٰ سے بھی محرومی ہوتی ہے۔

ایک بزرگ سے جب کسی نے یہی سوال کیا کہ حضرت! ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ تو عجیب جواب ارشاد فرمایا: "کیسے قبول ہو؟ جب کہ تم اللہ تعالیٰ کو تو مانتے ہو مگر اللہ تعالیٰ کی نہیں مانتے، اس کی نعمتوں کو استعمال تو کرتے ہو مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو مانتے ہو مگر ان کی پیروی نہیں کرتے، قرآن تو پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے، شیطان کو دشمن تو سمجھتے ہو مگر اس سے بھاگتے نہیں، موت کو حق سمجھتے ہو مگر اس کی تیاری نہیں کرتے، مردوں کو دفناتے ہو مگر ان سے عبرت نہیں لیتے، ایسے لوگوں کی دعائیں کیوں کر قبول ہوں۔"

تم کو شکوہ ہے کہ اپنا مدعا ملتا نہیں دینے والے کو گِلہ ہے کہ گدا ملتا نہیں
بے نیازی دیکھ کر بندے کی کہتا ہے کریم: "دینے والا دے کسے؟ دستِ دعا ملتا نہیں"

صاحبو! دعا اگر حقیقتہً دعا ہو اور خود دعا کرنے والے کی ذات اور اس کے اعمال و

اخلاق میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو دعا کی قبولیت سے مانع ہو تو ضرور دعا قبول ہوتی ہے۔ چناں چہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت کا واقعہ قرآن میں منقول ہے جس سے دعا کی قبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ بالخصوص حالتِ اضطرار کی دعا تو ضرور قبول ہوتی ہے، اور بعض اوقات جو کام کسی سے نہیں ہوتا وہ دعا سے ہو جاتا ہے۔

دعا کی قبولیت کا حیرت انگیز واقعہ:

چنانچہ روایت میں دعا کی قبولیت کا ایک حیرت انگیز واقعہ ملتا ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس بابرکت میں مقام صفہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مہاجرہ عورت اپنے لڑکے کو لیے ہوئے آئی جو سنِ بلوغ کو پہنچ چکا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو مہمان بنا کر عورتوں کی طرف بھیج دیا، اور اس کے لڑکے کو اپنے پاس رکھا، کچھ دن ہی گذرے تھے کہ وہ لڑکا مدینہ کی وبا کی زد میں آ گیا، وہ کچھ دن بیمار رہ کر انتقال کر گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آنکھیں بند کیں اور اس کی تجہیز و تکفین کا حکم فرمایا، جب ہم نے اس کو غسل دینا چاہا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انس! اس کی ماں کو جا کر خبر کر دو'' میں نے اس کو خبر کر دی، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خبر سن کر وہ آئی اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی، اس کا ایک انگوٹھا پکڑا، پھر اضطراب کے ساتھ کہنے لگی:

''اَللّٰهُمَّ إِنِّیُ أَسُلَمُتُ لَكَ طَوُعًا، وَخَالَفُتُ الْأَوُثَانَ زُهُدًا، وَهَاجَرُتُ لَكَ رَغُبَةً، اَللّٰهُمَّ لَا تُشُمِتُ بِیُ عَبَدَةَ الْأَوُثَانِ، وَ لَا تُحَمِّلُنِیُ مِنُ هٰذِهِ الْمُصِیُبَةِ مَا لَا طَاقَةَ لِیُ بِحَمُلِهَا''......

الٰہ العالمین! میں اپنی خوشی سے تیری خوشنودی کے لیے اسلام لائی اور میں نے بے رغبتی اختیار کرتے ہوئے بتوں کی مخالفت کی، اور شوق سے تیری راہ میں ہجرت کی، (اس کی برکت سے میرے بچہ کو زندہ کر دے) اے اللہ! مجھ پر بت پرستوں کو اظہارِ خوشی کا موقع نہ دے اور مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈال جس کو برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں:

”فَوَ اللّٰهِ مَاانُقَضٰى كَلاَمُهَا حَتّٰى حَرَّكَ قَدَمَيُهِ وَ أَلُقٰى الثَّوُبَ عَنُ وَجُهِهٖ، وَ عَاش حَتّٰى قَبَضَ اللّٰهُ رَسُوُلَهٗ، وَحَتّٰى هَلَكَتُ أُمُّهٗ“.

اللہ کی قسم! اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ (اس دعا کی برکت سے لڑکے نے) اپنے قدموں کو حرکت دی اور اس نے اپنے چہرے سے کفن ہٹایا، اور وہ رحمت عالم ﷺ کے دنیا سے رحلت فرمانے اور اس کی ماں کے انتقال کے بعد تک زندہ رہا۔

(از بکھرے موتی / ص:۱۱۶/ ج:۲)

شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیم صاحبؒ فرماتے ہیں: ”بعض حضرات کا خام خیال یہ ہے کہ عبادت تو بس نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی کا نام ہے، نہیں بھائی نہیں، بلکہ مشکلات و مصائب کے اوقات میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا اور دعا کرنا بھی عین عبادت ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ أَمَّنُ يُّجِيبُ الْمُضُطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكُشِفُ السُّوُءَ ﴾ (النحل: ٦٢)

”بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور تکلیف دور کر دیتا ہے۔“

وہ کون ہے جو بوقت ندا مصیبت زدہ کی دستگیری کرتا اور دکھ ٹالتا ہے؟ اللہ ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دعا کا اہتمام مصیبت ہی کے وقت میں کیا جائے، جیسا کہ عام طور پر لوگ مصیبت کے وقت ہی دعا کرتے ہیں، راحت میں نہیں، دراصل یہ بندہ کی خود غرضی کی بات ہے، دعا کا اہتمام خوشحالی اور تنگ حالی ہر حال میں ہونا چاہیے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو یہ چاہے کہ مشکلات میں اس کی دعا قبول کی جائے اسے چاہیے کہ خوش حالی کے وقت میں خوب دعا کرے۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۹۵)

قبولیتِ دعا کے خاص حالات واوقات:

ویسے دعا کی قبولیت میں بنیادی دخل تو دعا کرنے والے کے رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ یا اس کی اندرونی کیفیت کو ہوتا ہے جس کو قرآنِ کریم نے ''اضطرار'' اور ''ابتہال'' سے تعبیر کیا، لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ خاص احوال اور اوقات ایسے ہیں جن میں ربِ کریم کی رحمت وعنایت سے قبولیتِ دعا کی پوری اور قوی امید کی جاتی ہے۔ حدیث پاک سے دعا کی قبولیت کے جو خاص حالات واوقات معلوم ہوئے ہیں انہیں محقق اسلام مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اپنی مقبول ومعروف کتاب ''معارف الحدیث/ص: ۱۴۰/ ۵'' میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) فرض نمازوں کے بعد۔

(۲) ختمِ قرآن کے بعد۔

(۳) اذان واقامت کے بعد۔

(۴) میدانِ جہاد میں جنگ کے وقت۔

(۵) بارانِ رحمت کے نازل ہونے کے وقت۔

(۶) جس وقت کعبۃ اللہ آنکھوں کے سامنے ہو۔

(۷) ایسے جنگل بیابان میں جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

(۸) میدانِ جہاد میں جب کمزور ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

(۹) سفر (حج کا ہو یا جہاد کا یا کسی دینی یا دنیوی ضرورت کا تو حالت سفر) میں

(۱۰) روزہ کی حالت میں افطار کے وقت۔

(۱۱) عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں۔

(۱۲) جمعہ کی خاص گھڑی میں۔

(۱۳) رات کے آخری حصہ میں۔

(۱۴) شبِ قدر میں۔

(۱۵) بیماری میں۔

لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ دعا سے مراد اس کی صورت نہیں ہے، بلکہ دعا سے مراد اس کی وہ حقیقت ہے جو ذکر کی گئی کہ پودا اسی دانے سے اگتا ہے نا! جس میں مغز ہو، اور جس میں مغز ہی نہ ہو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے، ایسے ہی جس دعا میں حقیقت، رقت اور خشیت ہی نہ ہو اس ''رسمِ دعا'' سے کیا امید کی جاسکتی ہے!

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور اس مبارک گھڑی (وقتِ سحر) کی برکت سے ہمیں مستجاب الدعوات بنادے، محروم نہ فرمائے، آمین یارب العالمین۔

والحمد للّٰہ رب العالمین، و الصلٰوۃ والسلام علٰی سید الأنبیاء و المرسلین و خاتم النبیین، محمد ن الصادق الأمین، وعلیٰ اٰلہ و أصحابہٖ أجمعین ومن تبعھم بإحسان إلٰی یوم الدین.

تم الجزء الثانی من دروس الحدیث الشریف، و للّٰہ الحمد أولًا واٰخرًا وظاھرًا وباطنًا، وَمَا کُناَ لنھتدي لولا أن ھدانا اللّٰہ. وذٰلك فی الخامس و عشرین من رمضان ۱۴۲۹ھ یوم الجمعۃ قبل الفجر.

ربنا تقبل منا إنك أنت السمیع العلیم، وتب علینا إنك أنت التواب الرحیم، سبحان ربك رب العزۃ عما یصفون، وسلام علی المرسلین، والحمد للّٰہ رب العالمین.

الخادم النادم والراقم الآثم

أبوخلیق محمد شفیق الصدیقی

(شاہ بھائی) غفر لہٗ

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا مُحَمَّدًا صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَا ھُوَ أَھْلُہٗ.